نفرت



رئیس احمد جعفری

MAQBOOL ACADEMY
مقبول اکیڈمی

نفرت

ایک حقیقت افروز معاشرتی ناول

رئیس احمد جعفری

مقبول اکیڈمی

۱۰- دیال سنگھ مینشن، شاہراہِ قائدِ اعظم، لاہور

طابع ــــــــ ملک مقبول احمد
مطبع ــــــــ ناصر پریس لاہور

مقبول اکیڈمی لاہور

کوڈ نمبر:
مجلد: ISBN 969 442 244 2
غیر مجلد: ISBN 969 442 245 0

شوروم : ۱۰۔ دیال سنگھ مینشن۔ شاہراہ قائد اعظم، لاہور
سیلز آفس: ۱۹۰۔ سرکلر روڈ۔ چوک انارکلی۔ لاہور

حصّۂ اوّل

آگ

○

بھرنا، آنسو بہانا عورتوں اور لڑکیوں کا کام ہے مردوں کا نہیں تم مرد ہو تمہیں اتنا حساس اور نازک طبع نہ ہونا چاہیے۔ دنیا میں جو آیا ہے ایک دن ضرور مرے گا۔ پھر غم کیوں اور صدمہ کیوں اور صدمہ کیسا؟"

اگر امی کا انتقال اس طرح ہوتا جس طرح دنیا کے دوسرے لوگ مرتے ہیں تو شاید مجھے اتنا غم نہ ہوتا۔"

کس طرح انتقال ہوا ہے تمہاری ماں کا؟ کیا کسی نے زہر دیا؟ یا خودکشی کر کے انہوں نے جان دی ہے؟

"کاش ایسا ہوتا!" کاش کا جانشین ہی رہتا ہے

"کیا بکتے ہو؟" میں نے تو کچھ بھی نہیں بولا

سچ عرض کرتا ہوں — اس دنیا میں ان کا کوئی ہمدرد اور دوست تھا نہیں۔ اگر ہوتا تو ضرور اس نے زہر دے دیا ہوتا انہیں وہ خود خدا سے اتنا زیادہ ڈرتی تھیں کہ دکھوں اور مصیبتوں اور زحمتوں کے ہمالیہ پہاڑ بھی ان پر لاد دیئے جاتے تو بھی اس ڈر سے وہ خودکشی نہ کرتیں کہ خدا ناخوش ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں طبعی موت مرنا پڑا اور یہی سب سے بڑی ٹریجڈی ہے"؟

"آج تمہیں کیا ہو گیا ہے؟" مجھے کچھ نہیں آپ کو کیا ہو گیا ہے؟

"کچھ بھی نہیں ہوا ہے؟"

"یہ کس طرح کی باتیں کر رہے ہو؟" حقیقی سچ کڑوا ہوتا ہے

"یہ خیالات ایک عرصہ سے میرے دل میں مچل رہے تھے، آج نہ جانے کیوں زبان پر آگئے!"

"تمہارا خیال ہے کہ تمہاری ماں مظلوم تھی؟" جی ہاں

"جی ہاں میرا یہی خیال ہے"!

"لیکن خود اس نے تو کبھی اپنی زبان سے ایک حرف شکایت بھی نہیں نکالا"!

یہی ان کی مظلومیت کی سب سے بڑی دلیل ہے"!

"کس نے ظلم توڑے ان پر"؟

"آپ نے"؟

"نالائق کیا بکتا ہے"؟

"میں غلط نہیں کہتا ابا جان!" آپ نے تھوڑا سا ظلم نہیں توڑا ان پر۔ اس گھر میں ان کی حیثیت ایک باندی سے بھی کم تھی۔ وہ بیمار ہوں، کمزور ہوں۔ بستر سے اٹھنے کی سکت نہ رکھتی ہوں، لیکن ممکن نہ تھا کہ وقت پر آپ کا ناشتہ تیار نہ کریں۔ آپ کو کھانا نہ دیں۔

"آپ کے آرام کا خیال نہ رکھیں"۔

"یہ مظلومیت تھی"؟

"بیوی کا فرض ہے"؟

(خشمگیں آنکھوں سے گھورتے ہوئے) وہ کیا ہے؟

"یہ تو آپ کو جاننا چاہیے"؟

"تم بھی تو کچھ بتاؤ"؟

کیا بتاؤں؟ - انہیں میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور ان کی وفات تک برابر دیکھتا رہا کہ انہیں کبھی خوشی نہیں ملی۔ وہ پیوند لگے کپڑے پہنتی رہیں۔ بیمار پڑیں تو علاج تک پر توجہ نہ کی گئی۔ آپ نے ان سے کبھی ہنس کر، مسکرا کر بات نہ کی۔ ہمیشہ شمشیر برہنہ رہے۔ ذرا ذرا سی بات پر بیٹے کے سامنے ماں کی توہین کرتے رہے۔ یہ سفاکی دیکھ کر میرا خون کھول جاتا تھا لیکن وہ ایسی ہی بے زبان تھی کہ خاموشی اور صبر و شکر کے ساتھ سب برداشت کر جاتی تھی۔ کیا مجال ہے جو بھی جواب دیا ہو۔ وہ مر گئی اور اسے مرے ہوئے پندرہ دن سے زیادہ ہو چکے ہیں۔ لیکن اب اس کا چرچا بھی نہیں ہوتا۔ سبھی بھول چکے ہیں۔ اسے لیکن میں نہیں بھلا سکتا۔ میں زندگی کی آخری سانس تک اسے فراموش نہیں کر سکتا۔ وہ میری ماں تھی۔ میری ذرا سی تکلیف پر تڑپ جاتی تھی۔ بے قرار ہو جاتی تھی۔ وہ مجھے دل گرفتہ اور پژمردہ نہیں دیکھ سکتی تھی۔ آپ شوہر تھے۔ آپ دھونس دکھا سکتے تھے۔ گالیاں دے سکتے

تھے۔ مار سکتے تھے۔ میں اس کا لڑکا تھا۔ اس مملکت کی واحد رعیت، وہ مجھے پیٹ سکتی تھی۔ مار سکتی تھی۔ کوس سکتی تھی۔ دکھ اور ایذا دے سکتی تھی اور اسے ایسا کرنا چاہیے تھا۔"

"کیوں کرنا چاہیے تھا ایسا؟"

اس لئے کہ میں اس کے بدترین دشمن کا یعنی آپ کا لڑکا تھا۔ اسے چاہیے تھا کہ آپ سے بھی نفرت کرتی اور مجھ سے بھی۔ آپ سے اس لئے کہ آپ بدترین شوہر تھے اور مجھ سے اس لئے کہ میں اس کے بدترین شوہر کا لڑکا تھا لیکن وہ کسی سے نفرت نہ کر سکی۔ نہ آپ سے، نہ مجھ سے۔ شاید اس میں نفرت کرنے کی صلاحیت ہی نہیں تھی۔ شاید اس کا دل صرف مہر و محبت کا گنجینہ تھا وہ کسی سے نفرت کر ہی نہیں سکتی تھی اور وہ یہی کرتی رہی یہاں تک — مر گئی — وہ مر گئی — سب نے اطمینان کا سانس لیا۔ سب نے اُسے فراموش کر دیا۔ لیکن میں ایسا نہ کر سکا۔ میں روز اس کی قبر پر جاتا ہوں اس کے لئے دعائے مغفرت کرتا ہوں۔ اس سے قبل باتیں کرتا ہوں اور جب تک اس شہر میں ہوں ایسا ہی کرتا رہوں گا۔ میں روز کی طرح آج اس کی قبر پر محبت کے پھول چڑھانے اور عقیدت کا نذرانہ پیش کرنے گیا تھا اور —— اور یہ دیکھ کر میرا کلیجہ شق ہو گیا کہ دو دن کی بارش سے اس کی زمین میں دھنس گئی۔ وہ جب مری تھی تو میں نے ایک طرح کا اطمینان محسوس کیا تھا۔ میں نے سوچا تھا۔ اب اس کے غموں اور دکھوں کی کہانی ختم ہو گئی۔ اب قیامت تک اس گوشۂ قبر میں وہ سکھ اور چین کی زندگی بسر کرے گی لیکن میرا یہ خیال غلط نکلا — گوشۂ قبر میں بھی اُسے چین نہ ملا۔ میں یہی سوچتا ہوا آ رہا تھا کہ آخر میری نیک، پارسا اور سراپا خدمت و محبت ماں نے قدرت کا وہ کون سا جرم کیا تھا جس کی پاداش میں اس کی قبر تک کو سزا دی جا رہی ہے۔"

تم ضرورت سے زیادہ حساس اور ضرورت سے زیادہ جذباتی ہو — حیرت ہے میرا لڑکا اور یہ خیالات؟ میری بھی ماں مری تھی، لیکن میری

آنکھوں سے ایک قطرۂ اشک بھی نہیں بہا تھا۔ میرے باپ نے بھی اس دنیا سے کوچ کیا تھا۔ لیکن مجھے نہیں یاد کہ میں نے آہ و بکا کی ہو مرد ہوتے اس لئے ہیں کہ ہر صورتِ حال کا ہمت اور دلیری سے مقابلہ کریں۔ وہ اس لئے نہیں ہوتے کہ ذرا کوئی بات ہوئی اور انہوں نے عورتوں کی طرح گریبان پھاڑنا اور رونا دھونا شروع کر دیا۔

"میرے آنسو بھی پہلے اور آخری ہیں۔ اب میں کبھی نہیں روؤں گا جس کا جی چاہے مر کر دیکھ لے۔"

"بہت زیادہ برہم اور مشتعل ہو کر کیا کہنا چاہتا ہے تو؟"

"وہی جو میں نے عرض کیا۔"

"تو یہ کہنا چاہتا ہے کہ اگر میں مر گیا تو بھی تو نہیں روئے گا؟"

"کس طرح کہہ دوں کہ آپ نے میرا مطلب غلط سمجھا ہے!"

واقعی جواب دیتے وقت یہی بات تھی میرے دل میں، میں نے یہ کہنا بھی چاہا تھا لیکن نہ جانے کیوں صاف الفاظ میں اپنا مدعا نہ بیان کر سکا۔"

لیکن میں تجھے عاق کر سکتا ہوں۔ ہر چیز سے محروم کر سکتا ہوں۔

"میں خود ہی ہر چیز سے محروم ہو چکا ہوں — مجھے کچھ نہیں چاہیے۔"

کم بخت، میں تجھے مبارک باد دینے کے لئے ٹہل رہا تھا۔ تیرا انتظار کر رہا تھا۔ میٹرک کا رزلٹ شائع ہو گیا ہے اور تو سارے صوبے میں اول آیا ہے۔"

"کاش میں فیل ہو گیا ہوتا۔"

اور پھر اس کا گلا رندھ گیا اور وہ تیزی سے گھر کے اندر داخل ہو گیا۔

(۳)

اعجاز کے گھر میں داخل ہونے کے بعد بھی امتیاز بڑی دیر تک ٹکٹکی لگائے دیکھتا رہا۔

اسے حیرت تھی کہ آج اس لڑکے کو کیا ہو گیا ہے؟

وہ سعادت مند لڑکا جسے میرے سامنے تاب تکلم تک نہ تھی آج اس کی گرم گفتاری کا انداز، نیا ہی نہ تھا، حیرت انگیز بھی — اور ناقابل برداشت بھی۔

امتیاز بڑی دیر تک ٹکٹکی لگائے دروازے کی طرف دیکھتا رہا جیسے اعجاز ابھی پھر اندر سے برآمد ہوتا ہے اور وہ اسے دیکھتے ہی دھواں دھو پیٹنا شروع کر دے گا۔ لیکن اس نے سوچا کیا وہ اسے پیٹ سکے گا؟ کیا وہ مار کھائے گا؟

وہ خاموشی سے مردانہ حصہ میں اپنے کمرے کے اندر آ کر بیٹھ گیا حقہ بھرا ہوا تھا۔ اس نے سٹک منہ سے لگائی اور کش لینے لگا۔ لیکن وہ اس وقت یہاں نہیں تھا۔ نہ جانے کہاں تھا۔ اعجاز کے آج کے رویہ اور تیور نے اسے مضطرب اور پریشان کر دیا تھا۔ اسے اعجاز سے یہ توقع نہ تھی وہ اسے مٹی کا مادھو سمجھتا تھا اس کی نظر میں اس کی حیثیت موم کی ناک سے زیادہ نہ تھی، جدھر چاہا موڑ دیا۔"

ماں کا غم؟

اور یہ سوچتے ہی اس کا دماغ جان ہار مریم کی طرف منتقل ہو گیا۔
کیا واقعی وہ مظلوم تھی؟
کافی دیر تک غور و فکر کرنے کے باوجود وہ اپنے آپ کو یہ باور نہ کرا سکا کہ مریم مظلوم تھی۔

وہ ان لوگوں میں تھا جو بیوی پر حکومت کرنا، بیوی کو بے مایہ اور حقیر سمجھنا اپنا پیدائشی حق سمجھتے ہیں۔ چنانچہ جب تک مریم زندہ رہی۔ امتیاز نے بے محابا اپنے اس حق کا استعمال کیا اور اس پر ایک گونہ فخر محسوس کرتا رہا اور مریم جب مر گئی تو واقعی اس کی آنکھ سے ایک آنسو بھی نہیں ٹپکا اس لئے کہ مریم مر گئی تھی مگر سینکڑوں زندہ تھیں۔ پھر کسی مریم سے شادی کرے گا۔ پھر اس کی ایسی گت بنائے گا۔ یہی توقع وہ بیٹے سے رکھتا تھا مگر وہ ناخلف ثابت ہوا۔ ثابت ہو گیا کہ یہ زن مرید ہو گا۔

امتیاز کا بیٹا اور زن مرید۔
اتنے بڑے ننگ اور عار کا کبھی تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ لیکن وہ بعید از قیاس تصور۔ آج حقیقت اور واقعہ کی صورت اختیار کر چکا تھا جو لڑکا اپنی ماں کا اتنا سوگ منا سکتا ہے وہ اپنی بہن کو بھی آسمان پر چڑھائے گا اور بیوی کی بھی جوتیاں سیدھی کرے گا۔

امتیاز کے لب حقہ کا کش لے رہے تھے۔ آنکھیں دور افق میں کسی نقطہ پر جمی ہوئی تھیں اور دماغ اس الجھن کو سلجھانے میں مصروف تھا چونکہ اعجاز انہی کی جنس سے تھا یعنی لڑکا تھا اس لئے وہ اس کی فلاح و بہبود کے بارے میں بہت کچھ سوچا کرتے تھے۔ اس کی تعلیم و تربیت کا بھی خیال رکھتے تھے۔ چاہتے تھے وہ پڑھے۔ خوب ترقی کرے خوب عروج حاصل کرے۔ رشوت کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔

اکسائز کے محکمے میں ایک معمولی سی پوسٹ پر تھے۔ تنخواہ ڈیڑھ دو سو روپے سے زیادہ نہ تھی آمدنی ہزاروں سے متجاوز تھی۔
خوب وارے نیارے کرتے۔ سینما دیکھتے تھے۔ تھیٹر سے دلچسپی

لیتے تھے۔ بالا خانوں پر جاکر ناچ دیکھتے تھے گانا سنتے تھے۔ دوست احباب کی ایک ایک دعوت پر کئی کئی سو روپے خرچ کر دیتے تھے۔ جی بھر کے عیاشی کرتے تھے لیکن گھر میں مریم پیوند لگے کپڑے پہنے، زلیخا۔ جاڑوں کے موسم میں سوتی کپڑے پر گزر کرے انہیں کوئی پرواہ نہ تھی۔ البتہ اعجاز کا کسی حد تک خیال رکھتے تھے، کچھ اس لئے کہ وہ ان کا ہم جنس تھا اور زیادہ تر اس لئے اس کی کمائی کھانی تھی۔ اس سے خاندان کا نام چلنا تھا لیکن اعجاز کا کچھ خیال رکھنے کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ اس کا لاڈ پیار کرتے تھے نہیں اس کے تو وہ قائل ہی نہیں تھے۔ وہ بیوی اور اولاد کو یکسر اپنا تابع فرمان رکھنا چاہتے تھے۔ ان کے ساتھ اخلاق محبت و مروت اور شفقت کا اظہار اپنی شان کے خلاف سمجھتے تھے۔ چنانچہ اعجاز کے ساتھ ان کا رویہ عام طور پر بے تعلقی اور بے رخی ہی کا رہتا تھا۔ البتہ اس کی ضروریات کا خیال رکھتے تھے۔ ان کا خیال تھا اگر بیوی اور اولاد کو دباؤ میں نہ کیا جائے تو یہ چیز شوہری شان اور پدری آن کے خلاف ہے۔ مریم جب تک زندہ رہی وہ اس کی طرف سے بے فکر تھے۔ اسی طرح زلیخا کی طرف سے اور اسی طرح اعجاز کی طرف سے۔

مریم کا جہاں تک تعلق تھا اس نے تو اپنی زندگی ان ستم رانیوں کے لئے وقف کر دی تھی۔ رہی زلیخا تو وہ ماں کے اشارے پر چلتی تھی اور رفتہ رفتہ اس طرز عمل، اس انداز حیات اور اس فضا سے اتنی مانوس ہو گئی تھی کہ مشین کی طرح اطاعت اور بے زبانی کا فن اس نے ماں سے سیکھ لیا تھا۔

لیکن اعجاز؟

یہ ہمیشہ کا خود سر تھا۔ ماں کی درگت اور بہن کی حالت دیکھ دیکھ کر کڑھا کرتا تھا۔ اس نے جلن نے رفتہ رفتہ اسے باغی بنا دیا تھا۔ وہ اپنے باپ سے اپنے خاندان سے نفرت کرنے لگا تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا۔ باپ سے لڑ جائے اسے کھری کھری سنا دے۔ اسے ظلم و ستم کی روش ترک کرنے پر مجبور کر دے کبھی کبھی اپنے ان تاثرات کا اظہار جوش جذبات سے مغلوب ہو کر وہ مریم کے سامنے بھی کر دیتا تھا۔ بیٹے کے یہ تیور دیکھ کر اور یہ باتیں سن کر وہ لرز جاتی تھی

شوہر کے اس غیر انسانی طرز عمل کے باوجود اس کا حد درجہ لحاظ رکھتی تھی، اس کے وقار کو مجروح دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ گھنٹوں اور پہروں اعجاز کو سمجھایا کرتی۔ نصیحت کیا کرتی اور جب تک اس کے تاثرات غضب زائل نہ ہوں باپ کی اطاعت و خدمت کے سبق دیا کرتی تھی۔ جب تک اس کا غصہ ختم نہ ہو جاتا اسے اپنے پاس سے اٹھنے نہ دیتی۔

وہ اپنی ماں کو غیر مشروط طور پر چاہتا تھا، کچھ اس لئے کہ وہ حد درجہ مظلوم تھی اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ دل دکھائے، اسے صدمہ دے، کم از کم اپنی طرف سے تو وہ اسے خوش اور مطمئن رکھنا چاہتا تھا اور کچھ اس لئے کہ اسے غیر معمولی طور پر اپنی ماں سے محبت تھی۔ اسے خفا کرنا کسی قیمت پر بھی گوارا نہیں کرتا تھا۔

لیکن مریم اب نہیں تھی۔ اب وہ آزاد تھا، اب اسے کسی کی پرواہ اور فکر نہیں تھی، اب اسے کسی کے صدمے اور غم کا احساس نہیں تھا۔ اب وہ من مانی کر سکتا تھا۔ اور کوئی اس کے راستے میں سنگ گراں بن کر حائل نہیں ہو سکتا تھا۔ پھر بھی وہ ضبط کرتا رہا، اپنے جذبات کو روکتا اور دباتا رہا۔ نہ جانے اسے کیا ہو گیا۔ آج وہ ضبط پر قادر نہ رہا۔ اس نے گرم گفتاری کا مظاہرہ کر ہی دیا۔

امتیاز کو نہیں معلوم تھا کہ اعجاز کی یہ سعادت مندی، یہ بے زبانی یہ خاموشی مریم کے طفیل تھی، وہ اسے اپنے رعب وداب کا کرشمہ سمجھتا تھا۔ لیکن آج یہ غلط فہمی رفع ہو گئی۔ اور وہ سنجیدگی سے سوچنے پر مجبور ہو گیا۔ اگر لڑکا اس رنگ پر جا رہا ہے تو اس کا تدارک کیا ہونا چاہیئے؟ اور ہونا ضرور چاہیئے۔

(۴)

اعجاز کو اس وقت غصہ بھی تھا، صدمہ بھی، غم بھی اور ایک طرح کا اضطراب بھی۔

وہ آیا اور اپنے کمرے میں لیمپ جلا کر بیٹھ گیا اور کسی کتاب کا مطالعہ کرنے لگا۔ اگرچہ اسے نمایاں طور پر کامیاب ہونے کی اتنی خوشی نہیں ہوئی تھی۔ جتنی مریم کی زندگی میں ہوتی۔ لیکن پھر بھی یہ کہنا غلط ہوگا کہ اس خبر سے وہ خوش نہیں تھا۔

اس خبر نے غیر محسوس طور پر اس کے اندر ایک نیا جذبہ اور ولولہ پیدا کر دیا تھا۔

اب تک اس کی خواہش یہ تھی کہ میٹرک کے بعد کسی ملازمت کی تلاش کرے اور ماں کو آرام پہنچائے — مستقبل کے بارے میں صرف اتنا پروگرام تھا اس کا!

لیکن اب؟

اس وقت تو اس کی نظر کتاب کے اوراق پر جمی ہوئی تھی، لیکن دماغ مستقبل کی باتیں سوچ رہا تھا۔

روشن، تابناک اور حیات آفرین مستقبل!

مریم اس دنیا سے رخصت ہو چکی تھی۔ اب کوئی وجہ نہیں تھی کہ وہ ملازمت تلاش کرتا۔ اب اس کے سامنے ایک دوسرا پروگرام تھا اس

گھر سے، اس گھر کے لوگوں سے دور ہو جائے گا۔ ماں کے لئے وہ اپنا مستقبل خراب کر سکتا تھا، قربان کر سکتا تھا لیکن اب کوئی ایسا نہیں تھا جس کے لئے وہ اپنی زندگی کا سودا کرنے پر آمادہ ہو جاتا، لہٰذا کوئی وجہ نہیں کہ وہ تعلیم کا سلسلہ جاری نہ رکھے اور زیادہ سے زیادہ ترقی کے امکانات اپنے لئے نہ پیدا کرے۔

لیکن ایک سوال تھا؟

کالج کی تعلیم کے مصارف کہاں سے آئیں گے؟

جہاں تک امتیاز کا تعلق تھا وہ کئی مرتبہ اعلان کر چکا تھا کہ وہ اسے انگلستان بھیجنے پر تیار ہے۔ لہٰذا کالج کے مصارف خواہ کتنے ہی ہوں وہ ہنسی خوشی برداشت کرے گا۔ بلکہ اگر اس دوران میں اس نے فضول خرچی کی عادت ڈال لی تو اسے بھی گوارا کرے گا۔

لیکن وہ اپنی ماں کے قاتل سے نہ مالی امداد لینا چاہتا تھا۔ نہ اس کے گھر میں رہنا چاہتا تھا۔ نہ اس سے کسی طرح کا تعلق قائم رکھنا چاہتا تھا۔ جب عالم خیال میں اپنی ماں کے قاتل یعنی اپنے باپ کا تصور کرتا تھا اس کا خون کھولنے لگتا تھا۔ جی چاہتا تھا۔ اپنی اور اس کی جان ایک کر دے۔ یہ بات اس کے دل میں راسخ ہو گئی تھی۔ کہ ابھی وہ بہت دن زندہ رہتی۔ اگر اس کے ساتھ اس شخص نے اتنا سفاکانہ اور بے دردانہ برتاؤ نہ روا رکھا ہوتا۔

بے شک وہ اس کا باپ تھا۔ لیکن وہی تھا جو اس کی ماں کی مرگ بے ہنگام کا سبب تھا۔ جتنا یہ سوچتا تھا، اتنی ہی اتنی اس کے دل میں باپ کی نفرت بڑھتی جاتی تھی۔ اگر ماں کی تربیت کا گہرا اثر اس نے نہ قبول کیا ہوتا تو کوئی شبہ نہیں اس وقت تک وہ اپنے باپ کے مقابلے میں آ چکا ہوتا۔ ہمیں گرز و میدان و افراسیاب! لیکن اس اشتعال اور رنج و غصہ کی حالت میں بھی ماں کی تصویر سامنے آ کھڑی ہوتی تھی۔ اور اس کے کان میں نصیحت کے وہ الفاظ گونجنے لگتے تھے جو باپ کی اطاعت کے بارے میں

اکثر اس کے منہ سے نکلا کرتے تھے۔ بس یہی وہ تصویر تھی اور یہی وہ الفاظ تھے۔ جنہوں نے اسے حد ادب کے اندر محبوس اور مقید کر رکھا تھا۔

اس نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا۔ بے شک وہ حد ادب سے باہر قدم نہیں نکالے گا۔ تہذیب اور شائستگی کے خلاف کوئی کام نہیں کرے گا۔ ایسی کوئی حرکت نہیں کرے گا۔ جس سے اس کی ماں کی روح کو اذیت ہو!

لیکن ایک بات یقینی تھی، کبھی اور کسی حالت میں آئندہ تعلیم کا سلسلہ وہ باپ کے مصارف پر نہیں جاری رکھے گا۔ بے شک اس کے پاس وسیلہ نہیں ہے، جیب خالی ہے لیکن وہ خود اپنے وسائل اور ذرائع پیدا کرے گا۔ وہ اپنے دست و بازو کی مدد سے اپنے مستقبل کی تعمیر کرے گا۔ وہ صوبے بھر میں اول آیا ہے۔ کیا وہ ٹیوشن کر کے اپنے تعلیمی مصارف نہیں پورے کر سکتا۔ یا کیا اسے ٹیوشن نہیں ملے گا؟

اس خیال نے اس کے اضطراب اور پریشانی کو بڑی حد تک ختم کر دیا اور طبیعت مائل بہ سکون ہو گئی۔ اسے یقین کامل تھا۔ کہ وہ خدا کے فضل اور اپنے بل بوتے پر اپنی جگہ خود بنا لے گا۔

لیکن ابھی ایک بہت اہم سوال طے کرنا باقی تھا!

رکاب گنج ایک بہت معمولی اور چھوٹا سا قصبہ تھا جہاں کا وہ باشندہ تھا۔ یہاں سے چند میل کے فاصلے پر ایک اور بڑا قصبہ تھا۔ وہاں کے ہائی اسکول میں اس نے تعلیم حاصل کی تھی۔ ہر روز سائیکل پر چلا جاتا اور اسی پر واپس آ جاتا لیکن انت پور میں کوئی کالج نہیں تھا۔ کالج شہروں میں ہوتے ہیں قصبوں میں نہیں ہوتے۔ رکاب گنج سے نزدیک ترین شہر فیض آباد تھا رباب گنج سے فیض آباد کا کرایہ نو روپے تھا۔ صبح سے شام تک کا یا رات کے ۸ بجے سے صبح کے ۷ بجے کا سفر۔

فیض آباد جانے کے لئے کرایہ درکار تھا۔ وہاں ٹھہرنے کے لئے روپے کی ضرورت تھی۔ نصاب کی کتابیں خریدنے کے لئے روپیہ درکار تھا۔ کالج کی فیس دینی تھی۔ جب تک ٹیوشن کا بندوبست نہ ہو جائے۔ اس وقت تک

اپنی گرہ سے کھانے کا بندوبست کرنا تھا! ان سب کاموں کے لئے کم از کم دوسو روپے تو ضرور چاہیئں۔

"یہ رقم کہاں سے آئے گی؟"

یہ سوچتے ہی وہ اُٹھا اور اپنی جیب کا جائزہ لیا۔ صرف پانچ روپے اور کچھ آنے تھے۔ یہی پونجی لے کر وہ فیض آباد جائے گا۔؟

اس رقم میں تو ٹکٹ بھی نہیں خریدا جا سکتا!

"پھر ۔۔ ؟"

یہاں آ کر گاڑی رُک گئی۔ خیالات کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ یہ ایسی مشکل تھی جس کا کوئی حل نظر نہیں آتا تھا اور جب تک، یہ مشکل حل نہ ہو، کوئی تدبیر کامیاب نہیں ہو سکتی تھی لیکن آج تو جانا بھی ممکن نہ تھا۔

" وہ یہی سوچ رہا تھا کہ دروازے میں جنبش ہوئی۔ اس نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ تو زلیخا سامنے کھڑی تھی ۔۔ چھوٹی بہن!"

ہو بہ ہو ماں کی تصویر!

(۵)

یوں تو کس بھائی کو بہن سے محبت نہیں ہوتی لیکن اعجاز کو زلیخا سے کچھ زیادہ ہی تعلق خاطر تھا۔ اور مریم کے انتقال کے بعد سے تو وہ اسے اور زیادہ چاہنے لگا تھا۔ دونوں بھائی بہن میں عمر کا تفاوت صرف دو سال کا تھا یعنی بہن بھائی سے دو سال چھوٹی تھی اس لئے دونوں میں بے تکلفی بھی کافی تھی!

اعجاز نے محبت بھری نظروں سے زلیخا کو دیکھا۔ پھر پوچھا۔

"یوں دبے پاؤں چوروں کی طرح کیوں آئیں تم"؟

وہ ایک افسردہ سے تبسم کے ساتھ بولی۔

"چوری ہی کر کے تو آئی ہوں"!

انتہائی ذہنی کوفت اور غصہ و صدمہ کے باوجود اس بے ساختہ جواب پر اعجاز کو ہنسی آگئی۔

"چوری کر کے آئی ہو؟ واقعی—؟

اس نے مسکراتے ہوئے گردن کے اشارے سے اقرار جرم کر لیا۔ اعجاز نے سوال کیا۔

"آج تک تمہارا کوئی سوال میں نے رد کیا ہے؟ — اگر نہیں تو پھر مانگ لیتیں۔ چوری کی ضرورت کیا تھی"؟

وہ اسی طرح مسکراتی ہوئی بولی:

"اگر وہ چیز مانگنے کی نہ ہو، چوری ہی کرنے کی ہو تو"؟ اعجاز نے ہنستے ہوئے کہا۔

"تو پھر بے شک چرا لو"! ذرا دیر کے لئے باہر چلا جاتا ہوں، چرا چکو گی تب آ جاؤں گا"!

"وہ بولی :- "باہر جانے کی کیا ضرورت ہے؟ آپ کے بیٹھے ہوئے جو کچھ چرانا ہے چرا لوں گی۔ میں جانوں اور میرا کام۔ آپ فکر نہ کریں"!

اعجاز نے پھر نظریں کتاب پر گاڑ دیں اور کہنے لگا۔

"بہت اچھا جناب۔ میں اپنا کام کرتا ہوں آپ اپنا کام کریں"!

زلیخا نے جیسے اسے چھیڑتے ہوئے کہا "میں تو اپنا کام کر بھی چکی۔

اعجاز نے پوچھا" یعنی چرا لیا جو کچھ چرانا تھا"؟

جواب دینے کے لئے اس نے صرف تبسّم پر اکتفا کیا، وہ کہنے لگا۔

"پھر تو تم آنکھ سے سرمہ بھی چرا سکتی ہو"؟

یک لخت زلیخا سنجیدہ سی ہو گئی۔ اس نے کہا۔

"اچھا آپ کو رازدار بنائے لیتی ہوں — لیکن دیکھئے کسی کو بتایئے گا نہیں، ورنہ پھر لڑائی ہو جائے گی"!

اب تو اعجاز کو بھی تجسّس پیدا ہوا اس نے کہا۔

"رازدار؟ کیا کہیں اور چوری کر کے آئی ہو۔؟ اور مال مسروقہ میرے پاس رکھنا چاہتی ہو"؟

زلیخا نے ہنستے ہوئے کہا" یہی بات ہے بھیا۔ خوب سمجھے آپ"!

اعجاز کا شوق تجسس اب تک قائم تھا۔ اس نے کہا۔

"تو بتاؤ پھر ماجرا کیا ہے"؟

وہ بولی "یہ نسیم جو ہے بڑی بدحواس ہے اور دوسروں کی بدحواسی کا مذاق اڑاتی رہتی ہے"

"خیر آگے چلو! کہنا کیا چاہتی ہو"؟

"مجھے اکثر چھیڑتی رہتی ہے۔ تم نے یہ چیز گم کر دی تم نے وہ چیز کھو دی

میں اگر کوئی چیز کھوتی بھی ہوں۔ تو معمولی قسم کی۔
حد سے حد روپے بارہ آنے کی۔ مگر بیگم صاحبہ (نسیم) نے آج کئی سو روپے کی چیز اپنی بدحواسی پر قربان کر دی ہے۔"
"یعنی — ؟"
آج وہ سینما گئی ہے چونکہ وقت گذرا جا رہا تھا اور دیر کافی ہو چکی تھی۔ لہٰذا اور زیادہ بدحواس تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اپنی سونے کی گھڑی جاتے جاتے ڈیوڑھی میں پھینک گئی۔ میں ابا جان سے چائے کو پوچھنے گئی تو دیکھتی کیا ہوں دروازے کے پاس کوئی چیز چمک رہی ہے۔ اٹھایا تو گھڑی — یہ دیکھئے یہ رہی۔"
"پھر اب کیا ارادہ ہے ؟"
ارادہ کیا ہوگا یہ آپ کے پاس رہے گی۔ جب خوب اچھی طرح پریشان کر لوں گی تب دوں گی۔ وہ بھی دو تین دن کے بعد تاکہ آئندہ کے لئے کان ہو جائیں اور قیمتی چیز کو احتیاط سے رکھنا سیکھ لے!"
تمہیں کیا ضرورت ہے اس کی معلمہ بننے کی۔ احتیاط سے رکھے یا بے احتیاطی کرے۔ اس کی چیز ہے۔ وہ جانے اور اس کا کام۔"
زلیخا بچوں کی طرح مچلتی ہوئی بولی۔
"نہیں بھیا یہ کام تو کرنا ہوگا۔"
اعجاز نے جواب دیا۔
"اگر پسند ہو تو کرو۔ مگر مجھے کیوں شریک کرتی ؟"

وہ بولی" نسیم آتے ہی مجھ سے سوال کرے گی۔ میں قسم کھا لوں گی میرے پاس نہیں ہے اور کہہ دوں گی دیکھ لو سارا کمرہ پڑا ہے۔ اگر ہے تو لے لو۔ وہیں ڈھونڈو جہاں رکھی تھی ؟
" بڑی چالاک ہو ؟"
" بھیا نہیں !"
" اور اگر اس نے مجھ سے پوچھا۔

تو آپ بھی انکار کر دیجئے گا!

"یعنی میں بھی قسم کھالوں تمہاری طرح؟"

"ہاں تو کیا ہوا؟ کہہ دیجئے گا، اللہ قسم میرے پاس نہیں ہے۔"

"جھوٹی قسم کہلوانا چاہتی ہو"؟

"جھوٹ کیوں — آپ کے پاس کہاں ہے۔ وہ تو آپ کے بکس میں ہوگی!

"اور اگر میرے کمرے کی تلاشی لی گئی۔"

"اتنی ہمت کسی میں نہیں ہے۔"

"کیوں؟ میں کوئی ایسا طرم باز خاں ہوں۔"؟

آپ کو سب طرم باز خاں ہی سمجھتے ہیں گھر میں — اول تو کسی کی ہمت ہے آپ سے سوال کرنے کی نہیں پڑے گی اور پوچھ بھی لیا تو تلاشی کا کوئی نام بھی نہیں لے گا۔

"آخر اس دہشت کا سبب"؟

چچا، چچی، نسیم سب ہی کہتے ہیں کہ بھئی وہ بہت بد دماغ ہے اس سے کوئی نہ بولے — اور آپ منہ لگاتے بھی کب ہیں کسی کو؟ ابا جان تک سے تو سیدھے منہ بات نہیں کرتے!

(۶)

نسیم اعجاز کی بنت عم تھی۔ احراز کی لڑکی، احراز اور امتیاز سگے بھائی تھے امتیاز بڑا تھا۔ اعزاز چھوٹا، دونوں بھائی ایک دوسرے کا بہت زیادہ خیال اور لحاظ رکھتے تھے۔ مزاج اور طبیعت کے اعتبار سے بھی بڑی حد تک دونوں میں یکسانیت تھی۔ وہی سختی وہی رعب، وہی گھر کے ماتحتوں کے ساتھ رعونت اور نخوت کا برتاؤ۔ وہی بیوی کے سامنے اپنے آپ کو لئے دیئے رہنا وہی لوگوں کے سامنے جھوٹے وقار اور رعب کی نمائش۔

البتہ ایک فرق تھا، گو معمولی سہی لیکن ایسا بھی نہیں کہ اسے نظر انداز کر دیا جائے۔

احراز کا برتاؤ کلثوم کے ساتھ وہ نہیں تھا۔ جو امتیاز کا مریم کے ساتھ تھا۔ بس وہی فرق تھا جو چھوٹے اور بڑے میں ہوتا ہے یعنی انیس بیس کا فرق۔ امتیاز ہمہ وقت مریم کے ساتھ درشتی اور سختی سے پیش آتا تھا احراز کبھی کبھی۔ امتیاز اولاد کے سامنے بھی بیوی کو ذلیل کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں تھا۔ لیکن احراز اولاد کے سامنے ماں کے وقار کو کبھی مجروح نہیں ہونے دیتا تھا چاہے جتنا غصہ میں ہو۔

احراز کے بھی ایک لڑکی — نسیم — اور ایک لڑکے ریاض کا باپ تھا۔ نسیم بڑی تھی، ریاض چھوٹا۔ احراز کی مالی حالت اگر امتیاز سے اچھی نہ تھی تو بری بھی نہ تھی۔ یہ پولیس انسپکٹر تھا اور بڑے مزے میں زندگی کے دن

بسر کر رہا تھا۔ دوست احباب پر۔ مجلس طرب اور ہاؤ ہو پر بے شمار خرچ کرتا تھا۔ لیکن امتیاز کی طرح آنکھیں بند کر کے نہیں۔ آمدنی کا معقول حصہ اپنی بیوی اور بچوں پر بھی صرف کرتا تھا۔ ان کے اچھے اچھے کپڑے بناتا تھا۔ ان کے کھانے پینے کی فکر رکھتا تھا۔ ان کی ضدیں اور فرمائشیں پوری کرتا تھا۔ امتیاز نے مریم اور زلیخا سے کبھی واسطہ نہیں رکھا۔ صرف اعجاز کا تھوڑا بہت خیال رکھتا تھا۔ لیکن اعزاز نسیم کو بھی اتنا ہی چاہتا تھا۔ جتنا ریاض کو۔ نسیم چونکہ ریاض سے عمر میں ایک سال بڑی تھی۔ اس لئے اس کا مان بھی زیادہ رکھتا تھا۔ بیوی کے ساتھ زیادہ اپنایت اور بے تکلفی تو نہ تھی۔ لیکن کبھی کبھار اس سے بول لینے میں بھی مضائقہ نہیں سمجھتا تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ گھر کے تمام معاملات کلثوم کے ہاتھ میں تھے۔ وہ مختار مطلق تھی جو چاہے کر لے۔ اس سے کسی طرح کی پوچھ گچھ یا بازپرس نہیں کرتا تھا۔ اس بے چاری کے سامنے مریم کا انجام تھا۔ وہ اس کو غنیمت سمجھتی تھی۔ اور خوشی سے پھولی نہیں سماتی تھی!

اعجاز کو جو ماحول ملا تھا اور جس فضا میں اسے زندگی بسر کرنا پڑ رہی تھی۔ اس نے اُسے بہت دل برداشتہ، مایوس اور مغموم و مضمحل بنا رکھا تھا۔ وہ گھر میں کم سے کم وقت صرف کرتا تھا۔ اس ڈر سے کہ کہیں امتیاز کا سامنا نہ ہو جائے، کہیں وہ اس کے سامنے اس کی ماں کو ذلیل نہ کرے۔ پھر بھی گھر گھر ہی تھا، اُسے چھوڑا نہیں جا سکتا تھا۔ کم سے کم وقت بسر کرنے کے باوجود رہتا یہیں تھا۔ یہاں کے علاوہ کہیں اور اُسے پناہ بھی تو نہیں مل سکتی تھی۔

لیکن اس گھر میں ایک ہستی ایسی بھی تھی جسے دیکھ کر جس سے باتیں کر کے جس کی باتیں سن کر، جس کے سامنے سے گزر کر، جسے اپنے سامنے گزرتا دیکھ کر، جسے چھیڑ کر جس کی شرارت کا ہدف بن کر اسے چین آتا تھا۔ خوشی بھی ہوتی تھی — اور یہ ہستی نسیم کی تھی۔

ابھی وہ اس منزل پر نہیں پہنچا تھا کہ باقاعدہ عشق شروع کر دیتا لیکن غیر محسوس طور پر وہ اس سے واقعی عشق کرنے لگا تھا۔ اگر اس سے پوچھا جاتا۔

"تم نسیم سے عشق کرتے ہو"؟
تو اس کا جواب شاید انکار میں ہوتا۔ لیکن اگر اس سے پوچھا جاتا۔
"تم کس سے محبت کرتے ہو؟"
تو بے اختیار اس کی نگاہ تصور کے سامنے نسیم کی تصویر آجاتی اس کا دل دھڑکنے لگتا۔

اور وہ اپنے آپ سے یہ سوال کئے بغیر نہ رہتا۔
کیا میں نسیم سے محبت نہیں کرتا؟
لیکن یہ انجانی سی، اور لذت سے آشنا نہ ہو سکنے والی حالت اندر ہی جڑ پکڑ رہی تھی!

آج جب زلیخا نے گھڑی کا قصہ چھیڑا اور اس نے لطف لے لے کر ساری داستان سنی اور پھر نہایت اطمینان کے ساتھ اس سے گھڑی لے کر کوٹ کی جیب میں رکھ لی۔

اس نے سوچا واقعی لطف رہے گا۔ نسیم کو پریشان کرنے میں اور اسے پریشان دیکھ کر۔

اس نے سوچا۔ گھڑی تو بہر حال واپس کرنی ہے۔ لیکن کیا جرم ہے اگر اس بہانے اسے تھوڑا سا ستا لیا جائے۔ آخر وہ بھی تو جب موقع پاتی ہے شرارت سے نہیں چوکتی!

اعجاز نے گھڑی کوٹ کی جیب میں رکھ لی تو زلیخا مطمئن ہو گئی۔ پھر بھی احتیاطاً اس نے کہا۔

دیکھئے خبردار، خبردار نسیم کو پتہ نہ چلنے پائے۔

وہ جواب میں گویا ہوا۔
"اب تو بھئی چور کے ساتھی بن چکے۔ اب اس راز کا افشا کر کے اپنی شلامت بلانا ہے؟"
زلیخا کے ہونٹوں پر تبسم کھیلنے لگا، کہنے لگی۔
"ہاں ٹھیک ہے۔"

اعجاز نے کہا لیکن زیادہ عرصہ تک میں ضبط نہیں کر سکوں گا۔ کیوں کہ اسے پریشان دیکھ کر مجھے بھی کچھ پریشانی سی ہونے لگتی ہے لہٰذا آج ہی کل میں اس کی امانت اسے واپس کر دینا۔"

زلیخا نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"ہاں بھیا واپس کر دوں گی، اطمینان رکھئے۔"

پھر دفعتہً سوال کیا۔

"اُسے پریشان دیکھ کر واقعی آپ پریشان رہتے ہیں۔؟"

ہاں ہوتا تو ایسا ہی ہے — نہ جانے کیوں —؟

زلیخا نے کہا:" اور یہی حال خود نسیم کا بھی ہے۔ اس سے بھی آپ کا غم اور صدمہ نہیں دیکھا جاتا۔"

اعجاز کے دل میں کچھ گدگدی سی پیدا ہوئی۔

"یہ تم نے کیسے جانا"؟

"اس کی باتوں سے"!

"کس طرح کی باتیں"؟ مثلاً؟

جب سے امی کا انتقال ہوا ہے۔ آپ کتنے پریشان رہتے ہیں۔

اعجاز نے ایک ٹھنڈا سانس لے کر کہا۔

"ہاں زلیخا، انہیں میں کبھی نہیں بھول سکتا۔" — لیکن نسیم کا اس واقعہ سے کیا تعلق"؟"

"وہ اکثر میرے پاس آکر مجھے اکسایا کرتی ہے کہ آپ کو سمجھاؤں، اتنے زیادہ پریشان نہ ہوں۔ اس طرح آپ بیمار پڑ جائیں گے۔"

اعجاز نے مسکراتے ہوئے کہا۔

شاید وہ ڈرتی ہے تیمارداری کرنی پڑے گی۔"

زلیخا نے بچوں کی طرح ٹھنک کر کہا:" ہٹیے بھی — آپ نے بھی کیا بات کی ہے۔

"وہ بے چاری تو محبت سے ایسا کہتی ہے"!

(۷)

زلیخا اور اعجاز میں یہ باتیں ہو رہی تھیں اور باہر امتیاز کچھ برہم، کچھ مضطر بیٹھا نہ جانے کیا سوچ رہا تھا۔

اتنے میں احراز آ گیا۔ بھائی کو فکر مند دیکھا تو پوچھا۔

" آج خلاف معمول آپ کچھ پریشان سے نظر آتے ہیں — کوئی خاص بات ہے ؟"

امتیاز نے بجھے ہوئے حقہ کا ایک کش لگایا اور کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

ہاں پریشان ہوں اور فکر مند بھی — اور حد درجہ مشتعل بھی "

احراز نے حیرت سے بھائی کی طرف دیکھا اور پوچھا۔

" خیریت تو ہے ؟" کیا بات ہوئی ؟ آج تو آپ کو بہت خوش ہونا چاہیئے تھا "؟

امتیاز نے سوال کیا ۔

کیوں ! آج بہت زیادہ خوش کیوں ہونا چاہیئے تھا ؟"

احراز نے نشاط و طرب کے عالم میں جواب دیا

" کیا سارے صوبہ میں اعجاز کا اول آنا آپ کے لئے باعث مسرت نہیں ہے ؟" بھائی جان اس خوش خبری پر تو دشمن بھی بادل نخواستہ ہی سہی مگر خوش ہو رہے ہیں ۔"

" دشمن —؟"

جی ہاں ۔ ابھی میں آرہا تھا کہ راستے میں سکندر صاحب ملے ۔ میرے اور آپ کے پرانے دشمن ہیں بلکہ کہنا چاہیے ہمارے خاندانی دشمن ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی آگے بڑھے اور اعجاز کی کامیابی پر مبارک باد کہہ رہے تھے ، کسی وقت آپ کی خدمت میں بھی آئیں گے ۔ بہ ذات خود مبارک باد دینے ۔"

امتیاز نے ایک آہ سرد کے ساتھ کہا ۔

لیکن میں مبارکباد کا نہیں ۔ تعزیت کا مستحق ہوں ۔"

تعزیت کا لفظ سن کر احراز نے سوچا ۔ شاید بھائی صاحب کو بھابی مرحومہ یاد آرہی ہیں ؛ وہ کبھی کبھی کہا بھی تو کرتی تھیں —— یاد آئے گی تمھیں میری وفا میرے بعد —— شاید آج بھابی کی وفاداریاں یاد آرہی ہیں اسے مریم سے کوئی خاص لگاؤ نہیں تھا ۔ لیکن وہ بھی ایسے لوگوں میں تھا جو بیوی کے ساتھ امتیاز کے برتاؤ کو انتہا پسندی کی انتہا سمجھتے تھے ۔ اسے ایک گونہ خوشی ہوئی کہ چلو بھابی صاحبہ یاد تو آئیں کسی نہج سے ۔ اس نے بھی ایک سرد کے ساتھ کہا ۔

" بھائی جان ۔ یہ غم تو زندگی بھر کا ہے ۔ ان کے مرنے کا کسے افسوس نہیں ہے ۔ سارا گھر سونا ہو گیا ہے ۔ ایک ان اکیلی کے اٹھ جانے سے ۔ وہ نہ کسی کے بھلے میں تھیں نہ برُے میں ۔ اپنے کام سے کام ۔ پھر بھی ان کے دم سے رونق تھی ۔ گھر میں اور ان کے اُٹھتے ہوئے یہ رونق بھی اُٹھ گئی ۔

امتیاز نے بادل کی طرح گرجتے ہوئے کہا ۔

" کیا بکتے ہو "؟

احراز خاموش ہو گیا اور حیرت سے بھائی کی طرف دیکھنے لگا ۔ وہ چھوٹا

تھا اور اکثر بچپن میں بڑے بھائی کے ہاتھ سے پٹ تک چکا تھا۔ اور بہت دنوں تک یعنی بڑے ہونے کے بعد تک بھی اگر مار پیٹ کا نہیں تو ڈانٹ ڈپٹ کا سلسلہ جاری تھا۔ لیکن جب سے دونوں نے آزادانہ اور — جداگانہ زندگی بسر کرنا شروع کی تھی تو چھوٹا چھوٹے پن کے حدود میں رہتا تھا۔ اور بڑا اپنے بڑے پن کے رکھ رکھاؤ کو ملحوظ رکھتا تھا۔ مگر ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ اس نے یوں ڈانٹ دیا ہو۔ اسے سخت حیرت ہوئی اور وہ متحیر نظروں سے بھائی کی طرف دیکھنے لگا امتیاز نے اس کی کیفیت محسوس کر لی اور کہا:

"تم خیال کرتے ہو۔ میں مریم کو یاد کر رہا ہوں؟ اس کی موت پر تعزیت کا سزا وار قرار دے رہا ہوں اپنے تئیں"؟

احراز نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

جی میں تو یہی سمجھا تھا!

امتیاز نے بجھے ہوئے حقہ کا ایک زوردار کش لگایا اور کہا۔

بیوقوف ہو — مریم کے مرنے کا مجھے یقیناً افسوس ہے لیکن میں ان لوگوں میں نہیں ہوں جو بیوی کے مرنے کا ماں کے مرنے سے زیادہ غم مناتے ہیں۔ اور میں تو غم غلط قسم کا آدمی ہوں۔ میں نے کبھی کسی کا ماتم نہیں کیا۔ سوگ نہیں منایا۔ والدہ تک کے انتقال پر میری آنکھوں سے آنسو کا ایک قطرہ تک نہیں گرا۔ حالانکہ ان سے محبت تھی"۔

احراز نے بڑے بھائی کے ادب و احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں۔"

امتیاز نے گویا یہ — لفظ سنا ہی نہیں لیکن سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔

اور پھر اب مریم کا سوگ مناؤں گا۔ اس کے مرنے کے پندرہ بیس دن کے بعد؟ — کتنی غلط بات سوچی تھی تم نے احراز"!

احراز نے محسوس کیا، واقعی اس سے بہت بڑی حماقت سرزد ہوئی

جو اس نے سوچا کہ پتھر ہیں بھی جونک لگ سکتی ہے چٹان بھی آنسو بہا سکتی ہے لیکن اتنا کہے بغیر بھی نہ رہ سکا۔"

"تو بھائی صاحب پھر آپ کیوں ملول وافسردہ نظر آرہے ہیں؟ — بلکہ اپنے آپ کو تعزیت کا مستحق قرار دے رہے ہیں۔ خدانخواستہ اور کیا واقعہ رونما ہوا"؟

"امتیاز نے کہا" وہ بڑا جگر فگار، دل دوز اور حوصلہ فرسا حادثہ ہے۔"

احراز کی کچھ پوچھنے کی ہمت نہ پڑی وہ سوالیہ نظروں سے بھائی کی طرف دیکھنے لگا۔

امتیاز نے خفیف سے تامل وتوقف کے بعد پوچھا۔

"تم اب تک نہیں سمجھے شاید"؟

اس نے بلے کے ساتھ جواب دیا۔

"بھائی صاحب واقعی میں کچھ نہیں سمجھ سکا۔ مجھے سخت اختلاج ہو رہا ہے۔ خدا کے لئے بتایئے تو سہی، آپ کس حادثہ کی طرف اشارہ کر رہے ہیں"؟

امتیاز نے جذباتی لہجہ میں بتایا۔

اعجاز کی طرف سے — کیا اس سے بڑا حادثہ بھی ہو سکتا ہے کوئی میرے لئے۔؟

احراز کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ وہ گھبرا گیا۔ اس نے انتہائی اضطراب اور بے چینی کے ساتھ سوال کیا۔

اعجاز کو کیا ہو گیا، خدا کے لئے بتایئے۔ للّٰہ جلد ارشاد فرمایئے کیا بات ہے؟ — کیا بات ہے؟ — کیا خدانخواستہ وہ —

امتیاز نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں وہ مرا نہیں ہے۔ زخمی بھی نہیں ہوا ہے۔ زندہ ہے صحیح سلامت ہے لیکن اس کا دماغ پھر گیا ہے"!

"یعنی پاگل ہو گیا ہے ۔ ۔ ۔ ؟"
کاش وہ مر گیا ہوتا ۔ وہ پاگل ہو گیا ہوتا ۔ کاش وہ ۔"

احراز اس سے زیادہ نہ سُن سکا ۔ اس نے کہا ۔
"حد ہو چکی بھائی صاحب ، اب میں اس طرح کی باتیں نہیں سن سکتا ۔ آپ اعجاز کو کہہ رہے ہیں کہ اس کا دماغ پھر گیا ہے ۔ وہ پاگل ہو گیا ہے اور میں ۔۔"

"اور تم پاگل سمجھ رہے ہو ؟"
احراز نے کوئی جواب نہیں دیا لیکن اس کی خاموشی اس حقیقت کی غماز تھی کہ امتیاز نے اس کے خیالات کی بالکل صحیح ترجمانی کی ہے ۔

امتیاز نے ہمدردی کی نظروں سے بھائی کو دیکھا اور پھر اسی حسرت ناک انداز میں گویا ہوا ۔

مریم مر گئی ۔ زلیخا شادی کے بعد اپنے شوہر کے ہاں چلی جائے گی ۔ گویا جس دن اس کی شادی ہو گی ۔ اس دن وہ بھی میرے لئے مر جائے گی ۔ لڑکی جب پرائے گھر کی ہو گی ۔ تو اس سے ناطہ کیا رہا ایک اعجاز تھا جس سے میری اُمیدیں وابستہ تھیں جس سے میری نسل چل سکتی تھی ۔ میرا نام زندہ رہ سکتا تھا ۔ جسے پڑھا لکھا کر اور جس کا مستقبل سنوار کر میں امید کر سکتا تھا ۔ کہ بڑھاپے میں میرے کام آئے گا ۔ میری خدمت کرے گا ۔ میری آرزوئیں بر لائے گا ۔"

احراز نے کہا ۔
بھائی صاحب یہ سب کچھ ہو گا ۔ وہ تو بڑا سعید لڑکا ہے "؟

امتیاز نے زہر خندہ کرتے ہوئے احراز کی طرف دیکھا اور خاموش ہو گیا ۔

(۸)

اس زہر خند میں غصے اور نفرت کے علاوہ ایک آہنی فیصلہ جھلک رہا تھا۔

احراز بہر حال امتیاز کا بھائی تھا۔ اس کا مزاج داں اور طبیعت شناس تھا۔ اس کے انداز و اطوار رفتار و گفتار اور سیرت و کردار سے بہت اچھی طرح واقف تھا۔ وہ دل ہی دل میں کانپ گیا۔ اس نے محسوس کر لیا کہ اعجاز سے کوئی بھیانک اور خوفناک غلطی ہو گئی ہے اور اب یہ شخص اپنے اکلوتے لڑکے کو اس کے قصور کی سخت ترین سزا دے گا۔ اس سے سخت انتقام لے گا۔ اور اسے عبرت ناک سبق دے گا۔

لیکن اسے اعجاز سے اس کی سعادت مندی، خوش اطواری کے باعث گہرا لگاؤ تھا۔ وہ اسے دل سے چاہتا تھا۔ وہ ہرگز یہ برداشت نہیں کر سکتا تھا

کہ اسے کسی ذرا سی بات پر تختۂ مشق ستم بنا لیا جائے اور وہ بات یقیناً ذرا ہی سی ہو گی، کیونکہ اعجاز نہ چور ہے نہ ڈاکو، نہ شرابی، نہ آوارہ گرد نہ عیاش، نہ اوباش، اس نے اپنے اندر ہمت پیدا کی اور ڈرتے ڈرتے سوال کیا۔

"لیکن بھائی صاحب اگر آپ نے مجھے اس قابل سمجھا ہے کہ یہ ذکر میرے سامنے چھیڑیں، تو میرا یہ مطالبہ بھی آپ کو ماننے میں تامل نہ

ہونا چاہیے کہ پورا واقعہ بتادیں تاکہ بھی تو کچھ سوچ سکوں۔؟"

امتیاز نے چڑھی ہوئی تیوری کے ساتھ پوچھا۔

"تم سوچ کر کیا کرو گے ؟ — کیا اسے راہ راست پر لے آؤ گے ؟"

"مجھے امید تو یہی ہے"؟

"پھر تم احمقوں کی جنت میں رہتے ہو !"

لیکن بھائی صاحب بات بہر حال معلوم ہونی چاہیے۔ میں اگر کامیاب ہوگیا تو فبہا ورنہ اپنی ناکامی کا اعتراف کر لوں گا۔

امتیاز نے ایک مرتبہ پھر بجھے ہوئے حقہ کا ایک کش لگایا اور کچھ کہنے والا تھا کہ احراز کا ملازم آیا اور اس نے کہا۔

"بیگم صاحب نے کہا ہے، کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے"

ابھی احراز نے کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ امتیاز نے اسے زور سے گھرکا اور گرج دار آواز میں کہا۔

"بھاگ یہاں سے"

وہ یہ فقرہ سن کر زمین سے ایک بالشت اچھل گیا اور فوراً الٹے پاؤں تقریباً بھاگتا ہوا واپس چلا گیا۔ وہ میاں کے ڈنڈے سے اور غصہ سے اچھی طرح واقف تھا اور کئی ہولناک واقعات کا شاہد عینی بھی لہٰذا اپنے آپ کو کسی خطرے میں ڈالنے کے لئے ہر گز تیار نہ تھا۔

اس نے گھر جاتے ہی کلثوم کو بتادیا کہ میاں جلال کے عالم میں بیٹھے ہیں اور "صاحب" سے نہ جانے کیا باتیں کر رہے ہیں۔ وہ بھی چپ چاپ اور اداس سے بیٹھے ہیں۔ میں نے کھانے کو کہا تو صاحب نے کوئی جواب نہیں دیا اور میاں نے بڑے زور سے ڈانٹا۔ میں تو بھاگ آیا بیگم صاحب!

امتیاز کا غصہ کوئی نیا واقعہ نہیں تھا۔ گھر کا فرد اس سے واقف تھا اور ڈرتا بھی تھا۔ لیکن نئی بات یہ تھی کہ "میاں" غصہ میں بھرے بیٹھے ہیں اور "صاحب" (احراز) بھی چپ چاپ اور اداس سے ان کے قریب بیٹھے ہیں۔

اس کا کیا مطلب ؟

کیا دونوں بھائیوں میں کسی بات پہ کھٹک ہو گئی ؟ لڑائی ہو گئی ۔

بہ ظاہر اس کا کوئی امکان نہ تھا۔ میاں کا پندار اس سے مطمئن ہو جاتا تھا کہ احراز ان کے سامنے سر جھکائے رہتا تھا۔ اور کبھی آنکھ ملا کر بات نہیں کرتا تھا۔ اور اگر کبھی وہ کچھ ارشاد فرماتے تھے تو وہ بے چون وچراں کے ارشاد کی تعمیل کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی ، کہ دونوں بھائیوں کی اب تک بہت اچھی طرح نبھتی چلی آرہی تھی ۔ ویسے خود احراز بھی کم جلالی نہیں تھا۔

اور اگر آج واقعی کسی بات پر دونوں بھائیوں میں کھٹک گئی ، تو کیا ہو گا ؟

یہ سوچ کر کلثوم گھبرا گئی اور ضبط نہ کر سکی ۔ بھوندو کو جو سامنے کھڑا تھا دھکا دے کر اس نے پیچھے ہٹایا اور سیدھی ڈیوڑھی میں — !

وہ ڈیوڑھی میں دبے پاؤں پہنچی ۔ لیکن ڈر رہی تھی کہ اگر "میاں" کو معلوم ہو گیا کہ کوئی ان کی کن سوئیاں لے رہا ہے تو پھر نہ وہ میر کے نہ ہر کے قابو سے باہر ہو جائیں گے اور قیامت آجائے گی ۔ لیکن بات کچھ ایسی تھی کہ وہ غیر متعلق بھی نہیں رہ سکتی تھی ۔ چنانچہ بہت احتیاط سے ڈیوڑھی میں پہنچ کر دروازے سے ہٹ کر کھڑی ہو گئی اور پٹ کی دراز باہر کا منظر دیکھنے لگی

بھوندو نے غلط نہیں کہا تھا !

" واقعی معاملہ بے ڈھب نظر آرہا تھا ؟

آج تک اس نے ایسا منظر کبھی نہیں دیکھا تھا ۔

" میاں " پیکرِ آتش بنے بیٹھے تھے ۔ ان کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں چہرے پر انتہائی اضطراب اور اشتعال کے آثار نمایاں تھے اور احراز بھیگی بلی بنا اس طرح سر جھکائے بیٹھا تھا جیسے اس سے کوئی بہت خطا سرزد ہو گئی ہے اور اب وہ سزا کا حکم سننے کا منتظر ہے ۔

کلثوم کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا ! — یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے ۔

اس مختصر سی محفل پر جو صرف دو آدمیوں پر مشتمل تھی ۔ سناٹا چھایا ہوا تھا آخر امتیاز نے طلسم سکوت توڑا اور کہنے لگا ۔

تو تم معلوم کرنا چاہتے ہو کہ تمہارے بھتیجے نے کیا کیا ہے اور میں اس سے کیا سلوک کرنے والا ہوں ۔"؟

احراز نے سر اٹھا کر ایک مرتبہ بھائی کی طرف دیکھا اور خاموش ہو گیا۔

امتیاز نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔

احراز نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا :

" ارشاد — سن رہا ہوں "!

امتیاز نے بتایا۔

میں نے فیصلہ کر لیا ہے اور میرا یہ فیصلہ ایک حقیقت پر مبنی ہے کہ ایک میان میں دو تلواریں نہیں رہ سکتیں — لہٰذا میرا فیصلہ یہ ہے کہ صبح کا سورج طلوع ہونے کے بعد اعجاز اس گھر میں نہیں رہ سکے گا۔ میری موجودگی اور عدم موجودگی کسی حالت میں بھی وہ یہاں قدم نہیں رکھ سکتا۔ اسے بیک بینی دوگوش اس گھر سے نکلنا پڑے گا اسے اختیار ہے کہ چاہے کہ وہ مریم کی آغوش میں جا کر ہمیشگی کی نیند سو جائے۔ یا دربدر ٹھوکریں کھائے۔ اور بھیک مانگے۔ اس گھر کا کوئی فرد۔ تم کلثوم۔ زلیخا، نسیم، ریاض کوئی بھی اس سے نہیں مل سکے گا۔ نہ اس گھر کے اندر۔ نہ اس گھر کے باہر :

احراز یہ سن کر کانپ گیا۔ اس نے کہا :

بھائی صاحب، یہ فیصلہ تو بہت سخت ہے :

امتیاز نے پوری امتیاز شان کے ساتھ جواب دیا۔

ہاں۔ لیکن میرا فیصلہ ہے اور تم جانتے ہو کہ میں اپنا فیصلہ بدلا نہیں کرتا۔

بے شک بھائی صاحب آپ اپنا فیصلہ بدلا نہیں کرتے۔ لیکن اس کا سبب۔

ہاں وہ بھی سن لو۔

اور پھر امتیاز نے سارا واقعہ از اول تا آخر سنا دیا۔ اور کہا۔

ایسا لڑکا۔ کسی اعتبار سے بھی میرا لڑکا نہیں ہو سکتا۔ میرے زیر سایہ

نہیں رہ سکتا۔ سن لیا تم نے۔

وہ خوش مدانہ لہجہ میں گویا ہوا۔

سن لیا بھائی صاحب لیکن غلطی انسان ہی سے ہو جاتی ہے۔ بہر حال اسے ماں کا غم ہے۔ اس لئے بھٹک گیا۔ لیکن اپنی غلطی پر وہ نادم ہو گا۔ ضرور

معافی مانگ لے گا۔ اور میں یقین دلاتا ہوں، پھر کبھی آپ کو اس سے شکایت کا موقع نہیں ملے گا ـــــ تازندگی؟"

نہیں ـــــ جاؤ کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے اور مجھے بھی نیند آرہی ہے

(۹)

احراز گھر میں داخل ہوا تو کلثوم پیشوائی کے لئے موجود تھی۔ اس نے احراز پر یہ ظاہر نہیں کیا کہ وہ دونوں بھائیوں کی باتیں سن چکی ہے نہ اپنی اس بے پایاں مسرت کا اظہار کیا جو اعجاز کے بارے میں امتیاز کے فیصلہ سے ہوئی تھی کہ نسیم دو ملاؤں کی مرغی بنی ہوئی تھی احراز کی خواہش یہ تھی کہ اس کی شادی اعجاز سے ہو۔ بھتیجا ہے - سعادت مند ہے۔ خوش اطوار اور سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ لڑکی گھر کی گھر ہی میں رہے گی۔ لیکن کلثوم کی دیرینہ تمنا یہ تھی کہ نسیم صفدر سے بیاہی جائے۔ یہ اس کا بھتیجا تھا - گو سعادت مند اور خوش اطوار نہ تھا۔ لیکن اعجاز کے مقابلہ میں کہیں زیادہ دولت مند تھا۔ اعجاز کے پاس باپ کی رشوت کی آمدنی کے سوا جو آتی تھی اور اڑ جاتی تھی۔ کیا تھا۔ تھوڑی سی زمین اور مکان کا آدھا حصہ اس کے برعکس صفدر ایک زمیندار باپ کا بیٹا تھا۔ ایسے باپ کا بیٹا۔ جس نے اپنی جزرسی اور کفایت شعاری سے — جسے بعض لوگ بخل سے تعبیر کرتے تھے — تھوڑی سی جائداد کو بہت بڑی املاک میں تبدیل کر لیا تھا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ ماں باپ کا اکلوتا لڑکا تھا۔ اس کے معنی یہ تھے کہ ساری جائداد گویا نسیم کے ہاتھ آئے گی۔ دودھوں نہائے گی۔ پوتوں پھلے گی۔ لیکن یہ بات دونوں کے ذہن میں تھی۔ زبان پر نہیں آئی تھی۔ احراز یوں خاموش تھا کہ جب چاہے گا۔ لڑکی اور لڑکے کے ہاتھ پکڑے گا اور رضامندی سے دو

بول پڑھوا دے گا۔ نہ لڑکا انکار کر سکتا تھا، نہ اس کا باپ اور کلثوم یوں خاموش تھی کہ احراز کا عندیہ اس کے علم میں تھا اور اس میں اتنی سکت نہ تھی کہ شوہر کی مرضی کے خلاف کچھ سکے۔ یا کہہ سکے، البتہ کسی حسن اتفاق کی منتظر تھی اور وہ حسن اتفاق آج پیدا ہو گیا تھا۔ خدا کی مہربانی سے، یعنی حد درجہ برہم تھا۔ اعجاز سے اور اس نے فیصلہ کر لیا تھا۔ کہ اس نالائق اور ناخلف بیٹے کو تنبیہاً اور تادیباً ایک نامعلوم عرصہ کے لئے نکال دے گا اور یہ مجال احراز کی بھی نہیں تھی۔ کہ اس کے فیصلہ میں مداخلت کر سکے۔ اور اس فیصلہ کے عمل میں آ جانے کے بعد بلاشبہ صفدر کے لئے میدان صاف تھا۔

احراز جب ہاتھ دھو کر دسترخوان پر بیٹھا تو کلثوم پنکھا لے کر پاس بیٹھ گئی۔ مکھیاں اڑاتی جاتی تھی۔ اور شوہر سے باتیں کرتی جاتی تھی۔ اس نے کہا۔

" بھوندو کہہ رہا تھا آج بھائی صاحب (امتیاز) بہت خفا ہیں۔"

احراز نے ہنستے ہوئے کہا۔

" ہاں انہیں جب غصہ آتا ہے تو اسی طرح آتا ہے۔

کلثوم نے بڑے معصومیت اور سادگی کے ساتھ کہا۔

" تو کیا آپ سے خفا ہو گئے کسی بات پر "؟

احراز نے شامی کباب پر ہاتھ صاف کرتے ہوئے کہا۔

ہو تو سکتے ہیں۔ آخر بڑے بھائی ٹھہرے۔ لیکن اعجاز کی کسی بات پر بگڑے ہوئے ہیں "

اس طرح گویا یہ خبر سن کر اسے بہت صدمہ ہوا۔ بڑے ہمدردانہ طور پر بولیں۔

یہ تو۔ اعجاز بے چارے نے کیا بگاڑا ہے؛ وہ تو اتنا نیک لڑکا ہے کہ میری نظر سے تو آج تک کوئی ایسا گزرا نہیں۔ خدا عمر بڑی کرے۔

احراز نے کھانا ختم کرتے ہوئے اور تولیہ سے منہ ہاتھ پونچھتے ہوئے کہا۔

ہاں جانتا ہوں، بڑا نیک اور سعادت مند لڑکا ہے" —

— بھوندو حقہ — لیکن بہر حال آدمی ہے۔ فرشتہ نہیں اور غلطی آدمی سے ہو ہی جاتی ہے۔!

نہایت اضطراب اور پریشانی کی کیفیت اپنے اوپر ظاہر کرتی ہوئی کلثوم گویا ہوئی۔

وہ تو ٹھیک ہے لیکن بھائی صاحب غصہ ور ہیں، نہ جانے کیسی سزا دینے کا فیصلہ کر بیٹھیں۔"

بھوندو حقہ لے کر آ گیا۔ احراز نے ایک کش لگاتے ہوئے کہا۔

فیصلہ تو وہ کر چکے — گھر سے نکالنے کا — یہ سنتے ہی جیسے کلثوم پر بجلی گر پڑی۔

" ہائے غضب اب ؟"

احراز نے با تمکنت لہجہ میں کہا۔

" انشاء اللہ! میں رضا مند کر لوں گا۔ زیادہ پریشان ہونے کی بات نہیں۔"

یہ سن کر واقعی کلثوم پریشان ہو گئی۔

(۱۰)

صبح احراز وقت سے ذرا پہلے بیدار ہو گیا۔ اس کا ارادہ تھا کہ ذرا اعجاز کو اچھی طرح سمجھا بجھا لے اور پھر امتیاز کی خوشامد در آمد کر کے اسے فیصلہ نافذ نہ کرنے پر آمادہ کرے۔ غصہ بہر حال تھوڑی ہی دیر قائم رہتا ہے۔ رات بھر تو نہیں قائم نہیں رہ سکتا۔ اب اتر گیا ہو گا۔ اور یہ معلوم کر کے تو اسے اور زیادہ خوشی ہوئی، کہ صبح چار بجے اپنے عملہ کے بعض آدمیوں کے ساتھ وہ کسی اسمگلنگ کرنے والی پارٹی پر چھاپہ مارنے گیا ہوا ہے اور گیارہ، بارہ بجے دوپہر سے واپس نہیں آئے گا۔ اس نے سوچا اس عرصہ میں اعجاز کو بہت اچھی طرح راہ راست پر لایا جا سکتا ہے۔

اس نے اطمینان سے ناشتہ کیا۔ پھر بھوندو سے کہا۔

ذرا اعجاز کو بلا لاؤ۔

بھوندو اگر دو منٹ تاخیر سے پہنچتا تو شاید اعجاز باہر جا چکا ہوتا آج اس کے اسکول کے لڑکوں اور استادوں نے ایک تقریب مبارکباد کا انتظام کیا تھا۔ یہ تقریب صرف اس کے لئے منعقد ہو رہی تھی ساتھیوں اور استادوں سب کو فخر تھا۔ کہ اعجاز سارے صوبے میں اول آیا۔ وہ سائیکل لے کر باہر نکلنے ہی والا تھا کہ بھوندو نے جا لیا اور احراز کا پیغام پہنچایا۔ اس نے سائیکل وہی ڈیوڑھی میں رکھی اور سیدھا چچا کے حضور میں پہنچ گیا۔

اعزاز نے شفقت اور محبت کی نظروں سے اسے دیکھا اور کہا آؤ بیٹھو اعجاز — کیا تم نے ناشتہ کر لیا؟"

وہ ادب سے سر جھکا کر گویا ہوا۔

جی ہاں چچا جان ناشتہ کر چکا ہوں، ابھی ذرا دیر پہلے"

"کہیں باہر جا رہے تھے تم"؟

میری کامیابی کی خوشی میں آج اسکول کی طرف سے ایک تقریب مبارک باد ہو رہی ہے۔ وہیں جا رہا تھا۔

(ہنستے ہوئے) "ہاں بھئی، تم ہی تو بارات کے دولھا ہو، تم نہ جاؤ گے۔ تو تقریب کا لطف کیا؟ — مگر کس وقت ہے تقریب"

"دس بجے کا وقت مقرر ہے!"

اوہ ابھی بہت وقت ہے۔ سائیکل پر جاؤ گے۔ تو پندرہ منٹ میں پہنچ جاؤ گے۔ ابھی تو آٹھ بجنے میں بھی چند منٹ باقی ہیں —

"جی ہاں — ایک گھنٹہ کے بعد بھی جاؤں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ ذرا پہلے اس لئے جا رہا تھا۔ کہ بعض دوستوں نے تاکید کر دی تھی کہ —

ہاں بھئی دوستوں کا کہنا ماننا ہی پڑتا ہے۔ کبھی ہم بھی تمہاری طرح طرح اسی اسکول میں پڑھتے تھے، لیکن فیل ہی ہوتے رہے۔ کبھی اتفاق پاس بھی ہوئے تو تیسرے درجہ میں۔"

(مسکراتے ہوئے) "لیکن آپ کی قابلیت کا تو سب لوہا مانتے ہیں —

"مانیں گے — اندھوں میں کانا راجہ جو ہوا —"

بھوندوں کی طرف دیکھ کر ابے کھڑا کیا رہا ہے۔ جا چائے لا اعجاز میاں کے لئے — کیوں بیٹے چائے پی لینے میں کیا حرج ہے"؟

کوئی حرج نہیں، آپ کی خوشی ہے۔ تو پی لوں گا"

اتنے میں بھوندو چائے لے کر آ گیا اور ساتھ ہی ساتھ کچھ اور چیزیں بھی پھر کہنے لگا۔

بیٹا (نسیم) نے کہا ہے (سموسوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) یہ ضرور کھایئے گا۔

اعجاز کے زیرِ لب تبسّم کے ساتھ ایک سموسہ اٹھا لیا۔ احراز نے قہقہہ لگایا اور کہنے لگا۔

واقعی بڑے مزے کے ہیں۔ خود ہی پکاتے ہیں۔ اس نے سب کھانے پڑیں گے۔ ہیں ہی کتنے۔ بس چار ہی تو ہیں۔"

کچھ تو اس لئے کہ سموسے واقعی مزے کے تھے اور کچھ اس لئے کہ نسیم نے بھیجے تھے اور خصوصیت کے ساتھ کھانے کی فرمائش کی تھی وہ چاروں کے چاروں صاف کر گیا۔ پھر اس نے چائے کی پیالی اپنی طرف کھسکائی اور گھونٹ گھونٹ کر کے پینے لگا۔

(۱۱)

اعجاز چائے پیتا رہا اور احراز سگریٹ سے شغل کرتا رہا۔ دونوں مشغلے سے ایک ساتھ فارغ ہوئے۔ پھر احراز سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اس نے کہا۔

"بیٹے، بھائی صاحب تم سے بہت خفا ہیں!"

دفعتہً اعجاز کا رنگ رخ بدل گیا۔ ایک ہیجانی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ اس پر اس نے کہا۔

"یقیناً خفا ہوں گے — لیکن چچا جان میں بھی خفا ہوں، ان سے"

احراز کے منہ سے اس طرح کی بات سن کر ایک دھچکا سا لگا احراز کو اس نے اپنی کیفیت پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

"تم خفا ہو؟ — بھائی صاحب سے؟"

وہ بولا "صرف انہی سے نہیں ساری دنیا سے، خود اپنے آپ سے بھی!"

یہ باتیں اور زیادہ عجیب و غریب تھیں۔ اس نے سراپا حیرت بن کر بھتیجے کو دیکھا اور گویا ہوا۔

"بھائی صاحب سے بھی خفا ہو۔ ساری دنیا سے بھی اور خود اپنے آپ سے بھی — لیکن کیوں"؟

"ابا جان سے اس لئے کہ میری ماں کی قبل از وقت موت کا سبب

دہی ہیں۔ وہ ایک دن بھی انہیں خوش نہ رکھ سکے۔ وہ انہیں جلاتے رہے ذلیل کرتے رہے۔ ان کے ساتھ ان کا برتاؤ حد درجہ ظالمانہ اور سفاکانہ تھا۔ ساری دنیا سے اس لیئے کہ یہ دنیا ظالم کا ساتھ تو دیتی ہے، لیکن مظلوم کا ساتھ دیتی ہے نہ اس کی مدد نہیں کرتی۔ اس کے کام نہیں آتی۔ چنانچہ اس دنیا نے میرے والد کا ہاتھ کبھی نہیں پکڑا۔ ان کی مار دھاڑ کبھی نہیں روکی۔ انہیں کبھی اصلاح احوال کی ترغیب نہیں دی۔ خاموشی کے ساتھ ان کے مظالم دیکھتی رہی اور میری مظلوم ماں کو ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرتے دیکھتی رہی اور وہ میری ماں کے آنسو نہ پونچھ سکی۔ اس کا کیا بگاڑ سکتا ہوں؟ بار بار اپنے دل سے پوچھتا ہوں۔ آخر میری ماں کا قصور کیا تھا؟ اس سے کونسا جرم سرزد ہوا تھا۔ جس کی اتنی سخت اور عبرتناک سزا ملی کہ بیمار پڑی اور علاج تک سے محروم رہی۔ مگر صرف ایک ہی جواب ملتا ہے۔ یہ کہ میری ماں کا جرم صرف یہ تھا کہ وہ نیک تھی، شریف تھی، وفا پرست تھی، اس کے سوا اس کا کوئی جرم نہیں جس کی طرف اشارہ کیا جا سکے۔ اپنے آپ سے اس لئے خفا ہوں کہ بہر حال بچہ نہیں ہوں ہوش رکھتا ہوں، شعور رکھتا ہوں، برے بھلے کی تمیز رکھتا ہوں۔ آخر میں نے کیوں اپنی ماں کا ساتھ نہیں دیا۔ میں نے کیوں مزدوری نہیں کی۔ اور اس ظلم کدے سے نکال کر اسے کسی جھونپڑی میں لے جا کر کیوں نہ رکھا میرے پاس وہ فاقے کر کے بھی خوش رہتی۔ پھٹے کپڑے پہن کر بھی گزارہ کر لیتی، فقر و فاقہ کی تکلیف کتنی ہی بڑی سہی مگر اس جہنم کے مقابلہ میں بہت کم تھی جہاں اسے مرنا پڑا۔۔۔ چچا جان جب میں یہ باتیں سوچتا ہوں تو میرا خون کھولنے لگتا ہے، جی چاہتا ہے۔ خودکشی کر لوں، اس گھر کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ دوں گا۔ میری اس سے بڑھ کر بدنصیبی، بدقسمتی اور بےبسی کیا ہو سکتی ہے کہ جب اپنی ماں کی قبر پر فاتحہ پڑھنے گیا تو میں نے دیکھا کہ دو دن کی بارش نے اس قبر کو زمین میں دھنسا دیا تھا۔ گویا مرنے کے بعد بھی اسے چین نہ ملا۔ گویا موت کے بعد اسے گوشہ قبر بھی امان نہ دے سکا۔ اس سے

بڑھ کر بھی بے پروائی اور سنگدلی ہو سکتی ہے کہ اس قبر بھی اس طرح بنوائی جائے کہ پندرہ دن بھی ثابت نہ رہ سکے۔"

احراز خاموشی کے ساتھ اعجاز کی یہ مسلسل تقریر سنتا رہا۔ اس نے کوئی مداخلت نہیں کی اور اعجاز اس بات سے بے پرواہ کہ اس کی باتوں کا کیا اثر ہو رہا ہے اور ہو بھی رہا ہے یا نہیں، اپنی دھن میں مست، اپنی کہے جا رہا تھا۔ اس نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔

میں اس گھر میں نہیں رہ سکتا۔ یہاں کی چہار دیواری مجھے کاٹنے کو دوڑتی ہے۔ یہاں کے بام و در میرے نفرت کے جذبہ کو اور زیادہ ابھارتے ہیں۔ یہاں ہر وقت اور ہر لمحہ میں مجھے وہ مرنے والی یاد آتی رہتی ہے۔ جس پر شوہر ظلم و ستم کرتا رہا۔ جس کی دنیا نے دادرسی نہ کی۔ میں جو اس سے اتنی زیادہ محبت کا مدعی ہوں۔ میں بھی اس کے لئے کچھ نہ کر سکا۔

اب احراز خاموش نہ رہ سکا۔ اس نے سوال کیا۔

"پھر کیا فیصلہ کیا تم نے؟"

اس نے بے تامل اور بغیر کسی جھجک کے صاف الفاظ میں کہا۔

"میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اس گھر کو چھوڑ دوں گا۔ اس شہر کو بھی چھوڑ دوں گا۔"

"کہاں کا قصد ہے، کہاں جاؤ گے۔ کیا کرو گے؟ کیا ارادہ ہے؟

کچھ نہیں کہہ سکتا۔

اتنا بڑا قدم اٹھا رہے ہو مگر کچھ نہیں کہہ سکتے، کیا اسٹیشن پر جاؤ گے اور جو پہلی گاڑی مل جائے گی اس پر بیٹھ جاؤ گے۔ خواہ وہ مشرق کی طرف جا رہی ہو یا مغرب کی جانب، شمال کا رخ ہو یا جنوب کا"؟

"نہیں چچا جان! میں گاڑی پر بیٹھ کر نہیں جاؤں گا۔"

احراز کچھ اور پوچھنے والا تھا کہ کلثوم آ گئی اور اس نے آتے ہی کہا۔

"نسیم نے سارا گھر سر پر اٹھا رکھا ہے۔ جان دے رہی ہے۔"

احراز نے تیوری پر بل ڈال کر پوچھا۔

"

"کیوں؟" کس بات پر؟

کلثوم نے بتایا "اس کی گھڑی چوری ہوگئی ہے — وہی جو آپ نے سالگرہ کے موقع پر لاکر اسے دی تھی۔ وہ کوئی معمولی چیز نہیں ہے ساڑھے تین سو کی مالیت کی ہے — میں تو نام نکلواؤں گی۔"

احراز نے کچھ زیادہ نوٹس نہیں لیا اس خبر کا، بلکہ ایک حد تک بگڑ کر کہا۔

نام نکلوانے کا ڈھونگ رچانے سے کیا فائدہ ہوگا — کیا گھڑی مل جائے گی؟"

وہ بولی "نہیں کیسے ملے گی؟ چور کا پتہ چل جائے گا تو فوراً حلق میں انگلی ڈال کر اگلوانوں گی۔"

"لیکن سوال یہ ہے کہ نسیم اتنی حواس باختہ کیوں رہتی ہے؟ اتنی قیمتی چیز اور یہ بے پروائی؟"

"تو وہ کیا کرے؟ آدمی لاکھ اپنی چیز کی احتیاط کرے لیکن اگر کسی دن کسی اللہ کے بندے نے فیصلہ کر لیا ہو کہ چوری کرنی ہی ہے تو موقعہ مل ہی جاتا ہے — غضب خدا کا بھرے گھر سے یوں چیزیں غائب ہونے لگیں تو کا ہے کو زندگی بسر ہوگی۔ اس گھر میں"؟

"تمہارا شبہ ہے کسی پر —"؟

"ہے بھی اور نہیں بھی، سب پر ہے، کسی پر نہیں!"

"یہ کیا بات ہوئی؟"

آنکھوں سے دیکھا ہو چوری کرتے تو نام بھی لے دوں، جب اندازے ہی پر بات ٹھہری تو کئی نام ذہن میں آتے ہیں — آپ کی پولیس خود بخود پکڑ لے گی چور"!

"(مسکرا کر) پکڑ تو میں سکتا ہوں لیکن اس میں دیر بہت لگے گی۔ آسان نسخہ یہی ہے جو تم نے سوچا ہے۔ نام نکلواؤ۔"

"لیکن ایک بات کہے دیتی ہوں"

ایک نہیں دس کہو لیکن جلدی - میں بہت ضروری باتیں کر رہا ہوں -

"جس کا نام نکل آیا اس سے اقرار آپ کو کرانا پڑے گا ، اور مال بھی برآمد کرانا ہوگا -"

"یہ سب بھی ہوتا رہے گا -" "تم نام نکلواؤ پہلے — ہاں اعجاز سے مخاطب ہو کر اگر ریل پر نہیں جاؤ گے . تو کیا پیادہ پا راہ نوردی کرو گے ؟"

اعجاز نے حسرت اور بے کسی کے ساتھ کہا -

اور کیا کر سکتا ہوں چچا جان - میری کل پونجی پانچ . . . - روپے اور کچھ آنے ہیں — دیکھ لیجئے !

یہ کہہ کر اعجاز نے کوٹ کی بالائی جیب اُلٹ دی ، پانچ کا نوٹ تو کہیں اٹک گیا - چند آنے پیسوں کے ساتھ گھڑی باہر نکل آئی -

وہی نسیم کی گم شدہ گھڑی جس کے لئے کلثوم نام نکلوانے کا انتظام کر رہی تھی ؟"

(۱۲)

گھڑی دیکھتے ہی کلثوم اور اعجاز نے بیک وقت اسے اٹھانے کی کوشش کی۔ پہلا ہاتھ کلثوم کا پڑا۔ اس نے اٹھالی۔ کچھ دیر تک اسے ہاتھ سے لئے دیکھتی رہی۔ پھر شوہر کی طرف بڑھاتی ہوئی بولی۔

"دیکھ لیجیے، وہی ہے۔"

اعجاز نے بھی اسے الٹ پلٹ کر خوب اچھی طرح دیکھا اور اسے میز پر رکھتے ہوئے کہنے لگا۔

"ہاں وہی ہے"

ادھر اعجاز کا یہ عالم کہ کاٹو تو لہو نہیں بدن میں چہرے کا رنگ فق ہوائیاں اڑتی ہوئی۔ آنکھوں میں شرمندگی اور ندامت کے آثار، اضطراب گھبراہٹ، پریشانی، وہ لاکھ صفائی دیتا، اصل واقعہ بیان کرتا. مگر کون تھا۔ جو اس کی بات پر یقین کرتا۔ وہ ایک چور کی طرح کان دبائے بیٹھا تھا کچھ کہنا چاہتا تھا۔ مگر زبان ساتھ نہیں دیتی تھی۔

کئی منٹ مجلس پر سناٹا چھایا رہا۔ پھر کلثوم نے طنز کا تیر پھینکا۔

واہ بھیا واہ جیتے رہو، خوش رہو، نظر بد دور، واقعی بڑے نیک اور سعادت مند ہو روپے کی ضرورت تھی. مجھ سے کہتے میں دے دیتی اپنے چچا سے کہتے وہ دے دیتے. وہ تو اولاد کی طرح تمہارا مان رکھتے ہیں اور تمہیں چاہتے ہیں۔ پکے سے پکا چور بھی اپنے گھر سے سات گھر چھوڑ کر چوری

کرتا ہے۔ تم نے ڈاکہ ڈالا اپنے ہی گھر میں، اپنی بہن کے مال پر۔ اپنے چچا کی کمائی پر۔۔۔

اعجاز نے اس وقت جس صفائی اور بے باکی سے گفتگو کی تھی اور باپ کے ساتھ سارے خاندان کو دھنک کر رکھ دیا تھا۔ احراز اس پر بڑی دیر سے پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ اس نے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ اب امتیاز سے وہ اس کی سفارش نہیں کرے گا۔ اس لڑکے کی سعادت اور خوش اطواری کے بارے میں جو رائے اس قائم کی تھی، وہ قطعاً غلط تھی، یہ تو بڑا سرکش باغی اور شوریدہ پشت معلوم ہوتا ہے۔ ابھی یہ لچھن ہیں تو آگے چل کر نہ جانے کیا ستم ڈھائے گا۔ اور اب گھڑی کے واقعہ نے تو اُسے نعل در آتش کر دیا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ اس کے کان پکڑ کر خود ہی گھر سے باہر نکال دے۔ امتیاز کا انتظار بھی نہ کرے۔

لیکن اس کی ضرورت یوں نہیں پیش آئی کہ دفعتہً امتیاز آگیا اُسے آتا دیکھ کر کلثوم نے دل ہی دل میں خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا۔ کہ اس سے بہتر موقعہ اس کانٹے کو راستے سے ہٹانے کا کوئی نہیں مل سکتا یہ خداداد موقعہ ہے۔ اس سے پورا فائدہ اٹھانا چاہیے۔

چنانچہ جیسے ہی امتیاز آکر بیٹھا۔ کلثوم نے گھڑی اٹھائی۔ اور احراز سے کہا۔

اب بھائی صاحب (امتیاز) سے یہ قصہ لے کر نہ بیٹھ جایئے گا۔ (اعجاز سے) لیکن بیٹے تمہیں بھی آئندہ کے لئے توبہ کر لینی چاہیے۔ ابھی سے اگر چوری کرنے کی عادت پڑ گئی تو آئندہ چل کر تو ڈاکہ ڈالو گے۔

یہ عجیب و غریب باتیں سن کر امتیاز کے کان کھڑے ہوئے۔ اس نے کلثوم سے پوچھا۔

"کیا بات ہے بھئی"؟

کلثوم بات کو چھپانے کی کوشش کرتی ہوئی بولی۔

"کچھ نہیں بھائی صاحب" جو ہونا تھا ہو گیا۔

امتیاز نے احراز سے سوال کیا۔

"بتاتے کیوں نہیں کیا بات ہے؟"

اب احراز کو قطعاً کوئی ہمدردی اعجاز سے نہیں رہ گئی تھی اس نے وہ ساری گفتگو دوہرا دی جو اس کے اور اعجاز کے مابین ہوئی تھی اور گھڑی کا افسانہ بھی سنا دیا۔

امتیاز نے خون آشام نظروں سے اعجاز کو دیکھا اور کہا۔

کم بخت تو صرف بدتمیز آشفتہ دماغ اور اوباش نہیں چور بھی ہے۔"

— کیوں میاں احراز اب بھی اس ناخلف کی سفارش کرو گے؟ (اعجاز سے) میں ہرگز اس گھر میں تیرا منحوس وجود نہیں برداشت کر سکتا۔"

اعجاز نے کہا "میں سب کچھ ہوں، مگر چور نہیں ہوں" امتیاز نے اٹھ کر تابڑ توڑ کئی زوردار طمانچے لگائے اور کہا۔

تو چور کیوں ہوتا۔ چور تو میں ہوں، احراز ہے۔ کلثوم ہے۔ نکل جا یہاں سے خبردار جو اب کبھی اپنا روئے زشت لے کر اس گھر میں آیا ——" نالائق، ناخلف، ننگ خاندان۔

منزل بہ منزل

تو رہ نورد شوق ہے منزل نہ کر قبول

(۱)

اعجاز خاموشی کے ساتھ کمرہ سے باہر نکلا اور رخصت ہوگیا۔ اس نے وہ گھر چھوڑ دیا۔ جہاں وہ پیدا ہوا تھا۔ جہاں اس نے ہوش کی آنکھیں کھولی تھیں۔ جہاں ماں کی مامتا کا جلوہ دیکھا تھا۔ جہاں جورِ پدر کے کرشمے دیکھے تھے اور آج جہاں سے چور بن کر اسے نکلنا پڑا تھا۔

بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچہ سے ہم نکلے۔

یوں تو اس نے خود ہی فیصلہ کر لیا تھا کہ اب اس گھر میں نہیں رہے گا لیکن یہاں سے اس طرح نکلنا پڑے گا۔ اس کا اس نے کبھی تصور نہیں کیا تھا۔ وہ ایک اصول کی خاطر، ایک جذبہ سے متاثر ہو کر خود سے رضاکارانہ طور پر جلا وطن ہو رہا تھا۔ لیکن یہ کیا معلوم تھا کہ اس کی چوری پکڑی جائے گی اور نہایت ذلیل کر کے، گھر کے ہر آدمی کی نظر میں رسوا کر کے اسے یہاں سے نکالا جائے گا۔

اس وقت کیفیت یہ تھی کہ وہ پاؤں رکھتا کہیں تھا۔ پڑتے کہیں تھے دماغ گھوم رہا تھا۔ آنکھوں تلے اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ سارے بدن میں سنسنی ہو رہی تھی۔ آنکھیں خشک تھیں، لیکن دل حزن کے آنسو رو رہا تھا۔

کمرہ سے نکل کر صحن میں پہنچا تو حالات سے بے خبر زلیخا اپنے کمرہ کے سامنے کھڑی مسکرا رہی تھی۔ اس تبسم میں معصومیت بھی تھی اور نادانفیت بھی!۔

وہ بولی، "بھیا کہاں جارہے ہیں؟ — اپنا جلوس نکلوانے مٹھائی ہمارے لئے بھی لایئے گا۔"

اسے معلوم تھا اعجاز کہاں جارہا ہے۔ وہ جانتی تھی کہ اس کے استادوں نے اور ساتھیوں نے آج تقریب مبارک باد کا اہتمام کیا ہے اور وہ نہایت شان کے ساتھ اس میں شرکت کے لئے جارہا ہے۔

لیکن اس کا چہرہ اُترا ہوا کیوں ہے۔ یہ پریشان، مغموم، افسردہ اور وگرگوں نظر آرہا ہے۔

کیا کوئی خاص بات ہے؟ کوئی خاص حادثہ پیش آیا ہے؟

اس نے کچھ تذبذب اور تامل کے بعد کہا۔

بھیا وہاں خوش خوش جانا چاہیے۔ تم اتنے پریشان اور حواس باختہ کیوں نظر آرہے ہو؟

اعجاز نے نظر اٹھا کر زلیخا کو دیکھا۔ ان نگاہوں میں رحم بھی تھا — ہمدردی بھی اور فریاد بھی۔

لیکن زلیخا یہ کچھ نہ پڑھ سکی۔ اور اعجاز اس کے سوال کا جواب دیئے بغیر تیزی سے باہر نکل گیا۔

زلیخا کچھ نہ سمجھ سکی کہ ماجرا کیا ہے۔

اعجاز کے جانے کے تھوڑی دیر بعد نسیم ادھر سے گزری، زلیخا اب تک اپنے کمرے کے دروازے پر کھڑی تھی۔ اسے دیکھ کر شرارت سوجھی، پوچھا کیوں بی نسیم، بہت کھوئی کھوئی سی رہتی ہو آج کل — سنا ہے گھڑی جاتی رہی تمہاری لیکن اگر ہمارا منہ میٹھا کرنے کا وعدہ کرو تو۔

نسیم نے تیوری چڑھا کر سوال کیا۔

"تمہارا منہ میٹھا کرنے کا وعدہ کردوں تو کیا ہوگا۔؟"

وہ بولی "تلاش کرنے کی کوشش کریں گے ہم بھی!"

نسیم نے بے پروائی اور حقارت کے ساتھ کہا۔

"جی بخشئے آپ کی کوشش کے بغیر میری گھڑی مل گئی!"

زلیخا ہنس پڑی، کہنے لگی۔
"جھوٹی کہیں کی ــــ مل چکی!"
نسیم نے گھڑی نکال کر اُسے دکھاتے ہوئے کہا۔
یہ رہی ــــ ہے وہی یا نہیں؟"
زلیخا کھلکھلا ہنس پڑی۔
"ہاں ہے تو وہی، لیکن کیسے مل گئی؟ ضرور چور سے ملی ہوئی ہو۔ تم"
نسیم نے جواب نہیں دیا تھا کہ شیر ببر ادھر سے گزرا۔ اسے دیکھ کر دونوں چپ ہو گئیں۔ امتیاز نے نسیم سے پوچھا۔
"کیا باتیں ہو رہی تھیں بیٹی؟"
وہ جلی ہوئی تو تھی کہنے لگی۔
زلیخا کہہ رہی ہے اگر منہ میٹھا کرنے کا وعدہ کرو تو گھڑی تلاش کر دیں گے ہم۔ میں نے کہا۔ وہ مل گئی تو کہنے لگی، ضرور تم نے چور سے ساز باز کر رکھی ہو گی ــــ
امتیاز کے لئے اس سے زیادہ سننا دشوار ہو گیا، اس نے بادل کی طرح گرجتے ہوئے زلیخا سے سوال کیا۔
"تم کہاں تلاش کرتیں نسیم کی گھڑی؟"
زلیخا سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ وہ سٹ پٹا گئی، امتیاز نے پھر سوال کیا۔
تو جانتی تھی، یہ گھڑی کس کے پاس تھی؟
زلیخا پھر چپ رہی، امتیاز نے ڈپٹتے ہوئے پوچھا۔
"بتاؤ میں کیا پوچھ رہا ہوں؟"
اس نے سوچا جب بھیا (اعجاز) نے گھڑی دے ہی دی تو اب رازداری کی کیا ضرورت ہے کہنے لگی۔
"بھیا کے پاس تھی، انہی نے دی ہو گی۔"
۔امتیاز نے ایک مرتبہ گھور کر زلیخا کو دیکھا۔ اس کا سارا بدن کانپ

رہا، اور پھر اتنے زور سے کہ پانچوں انگلیوں کے نشانات ابھر آئے
گال پر ایک طمانچہ مارا اور کہا۔
تو بھی چور، وہ بھی چور —
اور کہتا ہوا باہر نکل گیا۔
چوٹ اتنی زبردست تھی کہ زلیخا کو چکر آگیا۔ سامنے کی تمام چیزیں
گھومتی ہوئی نظر آنے لگیں، وہ جہاں کھڑی تھی، اسی جگہ بیٹھ گئی۔
نسیم کو اعجاز کی اس حرکت پر صدمہ بھی تھا اور غصہ بھی، لیکن اب اسے
یقین ہوگیا کہ زلیخا بھی اس جرم میں برابر کی شریک تھی، تو اس کا صدمہ
اور غصہ بہت بڑھ گیا۔ اسے زلیخا کے پٹنے پر افسوس نہیں ہوا آخر دل کی
بات بے ساختہ زبان پر آگئی، اس نے کہا۔
"مجھے تم سے یہ توقع نہیں تھی، زلیخا نہ اعجاز بھائی سے اس کا گمان
تھا، آخر میری گھڑی چرا کر تم بہن بھائی کو کیا مل جاتا"؟
زلیخا دفعتہً اٹھ بیٹھی، اس نے حقارت کی ایک نظر نسیم پر ڈالی اور کہا۔
"کیا تم مجھے اور بھیا کو چور سمجھتی ہو"؟
وہ چڑا کر بولی "اکیلی میں ہی سمجھتی ہوں؟ ابھی بڑے بابا امتیاز کیا
کہہ گئے ہیں، سنا نہیں — تمہیں تو انہوں نے صرف ایک طمانچہ مارا لیکن
اعجاز بھائی کو تو گھر سے نکال دیا ہے"
زلیخا اپنی مار پیٹ اور چوٹ بھول گئی، اس نے باچشم پرنم سوال کیا
"کیا کہا تم نے؟ — کیا بھیا کو گھر سے نکال دیا؟"
نسیم نے جواب دیا "نکال نہیں دیا تو پھر گئے کہاں ہیں؟
وہ بولی "آج ان کے اسکول میں مبارکباد کا جلسہ ہے۔ وہاں گئے
ہیں اور کہاں جائیں گے"
نسیم نے متجسسانہ طور پر دریافت کیا۔
"مبارک باد کا جلسہ کیا؟"
وہ بولی "سارے صوبے میں وہ اول آئے ہیں نا میٹرک کے امتحان

ہیں اسی خوشی میں انہیں مبارک باد دینے اور ہار پھول سے لاد دینے کے لئے ان استادوں اور ساتھیوں نے اپنے پاس سے چندہ جمع کر کے ایک شاندار جلسے کا انتظام کیا ہے"؟

نسیم کچھ کہنے والی تھی کہ کلثوم کا ادھر سے گزر ہوا وہ دونوں کے قریب ہو کر کھڑی ہو گئی، اور نسیم سے کہنے لگی۔

بیٹی، اتنی مصیبت کے بعد تو گھڑی ملی ہے اب کیا کوئی اور بیز چھڑوانا چاہتی ہو؟ — بس پھر ہا یا آؤ چلو۔ خبردار جواب کبھی اس طرف میں نے تمہیں آتے دیکھا۔

آگے آگے کلثوم اور پیچھے پیچھے نسیم دونوں چلی گئیں۔ ان کے جانے کے بعد وہ چوٹ پھر ابھر آئی۔ جو امتیاز کے طمانچے کا نتیجہ تھی، وہ اضطراب اور قلق کے عالم میں آکر اپنے بستر پر لیٹ گئی۔

اتنے میں دبے پاؤں نادرہ آئی —— اسے لگائی بجھائی میں اور یہاں کی وہاں لگانے میں بڑا مزا آتا ہے۔ برسوں سے اس گھر میں

ملازم تھی۔ اور نہایت ہوشیاری کے ساتھ اپنے ذوق کا سامان پورا کر لیا کرتی تھی، اس نے آتے ہی ہمدردی اور اپنایت کے لہجہ میں کہا۔

" اے بی کیا اس طرح لیٹی رہو گی —— بھائی کی خبر تو لو؟" زلیخا اٹھ کر بیٹھ گئی، نسیم نے جو کچھ کہا۔ اعجاز کے بارے میں اور جسے اس نے تسلیم نہیں کیا تھا۔ اب وہ امر واقعہ نظر آنے لگا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا، اس نے پوچھا

" اور آخر بات کیا ہوئی، نادرہ"؟

نادرہ نے جو کن سوئیاں لینے کے فن میں ماہر تھی اور جس نے نہایت ہوشیاری کے ساتھ دروازے کی آڑ میں کھڑے ہو کر سارا ماجرا اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور تمام باتیں اپنے کان سے سنی تھیں، ایک ایک حرف پوری تفصیل کے ساتھ بلکہ نمک مرچ لگا کر بتا دیا اور پھر نہایت مکاری کے ساتھ تیز آواز میں بولی۔

نہ جانے بے چارہ کہاں ہوگا۔ اس وقت؟ کیا کر رہا ہوگا؟ کہاں جائے گا؟ کہاں رہے گا؟ کہاں سے اپنی ضروریات پوری کرے گا۔ میرے پاس زیادہ تو نہیں پانچ روپے کا نوٹ تھا۔ جی چاہا وہی اس کی جیب میں زبردستی ڈال دوں، لیکن بہن اس جلاد (امتیاز) کے ڈر سے ہمت نہ پڑی، میری بھی شامت آجاتی تو مجھے کہاں پناہ ملتی؟

(۴)

اعجاز کو گھر سے نکال کر اور زلیخا کی پٹائی کر کے امتیاز مردانے میں آکر بیٹھ گیا۔ اس کا غصہ اب تک نہیں اترا تھا۔ اگر اعجاز واقعی چلا نہ گیا ہوتا تو شاید زلیخا سے زیادہ اسے پیٹتا۔

حقہ سامنے رکھا تھا۔ اور تھوڑی دیر کے بعد، بے دلی سے ایک آدھ کش لگا لیتا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد کچھ لڑکے جو تقریباً اعجاز کے ہم عمر تھے۔ سائیکل پر آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ انہوں نے سائیکل دروازے کے پاس رکھی۔

خود اندر کمرے میں چلے آئے۔

امتیاز نے ان کے سر و پا پر ایک نظر ڈالی اور پوچھا۔

"تم کون لوگ ہو اور کس سے ملنا چاہتے ہو"؟

ان میں سے ایک نے جواب دیا۔

"ہم اعجاز کے اسکول فیلو ہیں اور انہی سے ملنے آئے ہیں — وہ ہیں یا گئے۔؟"

امتیاز نے ایک مرتبہ پھر غور سے دونوں کو دیکھا اور پوچھا

ہے تو نہیں، لیکن جانا کہاں تھا؟

ایک بولا، وہ سارے صوبے میں اوّل آئے ہیں۔ یہ بات اگر اعجاز

کے لئے باعث مسرت ہے تو ہمارے لئے باعث فخر، چنانچہ ان کے اعزاز میں ہم نے ایک شاندار پارٹی کا انتظام کیا ہے۔

دوسرا ساتھی بولا، لیکن پر لطف بات یہ ہے کہ بارات کا دولھا غائب ہے۔ انہیں ہم نے دس بجے کا وقت دیا تھا۔ اور اب ساڑھے گیارہ بج چکے ہیں۔

امتیاز نے سب کچھ سننے کے بعد کہا۔

"وہ یہاں سے تو گیا کافی دیر ہو گئی اسے گئے ہوئے۔"

"لیکن وہاں تو اب تک نہیں پہنچے۔"

"شاید اب پہنچ گیا ہوگا؟"

لیکن راستہ تو ایک ہی ہے۔ وہاں گئے ہوتے تو راستے میں مل نہ جاتے۔"

"تم لوگ بحث کیوں کر رہے ہو"؟ کہہ دیا وہ یہاں نہیں ہے اب اسکول گیا ہے یا جہنم؟ میں نہیں جانتا۔

دونوں لڑکوں نے حیرت سے امتیاز پر ایک نظر ڈالی اور واپس مڑے چلتے چلتے، ایک دوسرے سے سرگوشی کے لہجہ میں کہا۔

جسے امتیاز نے بھی سن لیا۔

"کتنا ڈراؤنا شخص ہے —— ہو نہ ہو یہی اعجاز کا باپ ہے۔"

اور پھر اُچک کر سائیکل پر بیٹھے اور نو دو گیارہ ہو گئے۔

اسٹیشن راستے میں پڑتا تھا۔ اگر اتنے وقت ان دونوں نے اوپر چھلانگ لیا ہوتا۔ تو شاید اعجاز سے ملاقات ہو جاتی، لیکن وہ ایسا کیوں کرتے۔ اعجاز گھر سے نکل کر سیدھا اسٹیشن پہنچا۔ میل جا چکا تھا۔ البتہ اتفاق کی بات کہ پسنجر ٹرین کھڑی تھی۔ یہ رات کے گیارہ بجے فیض آباد پہنچتی تھی۔ اعجاز بسم اللہ مجریہا و مرسا ہا کہہ کر اس میں بیٹھ گیا۔ ٹکٹ اس نے ایک درمیانی سٹیشن سعادت گنج کا لیا تھا۔ وہ پانچ روپے کا نوٹ جو اس نے اعزاز کو دکھانا چاہا تھا۔ اس وقت تو نہ ملا۔ اب دستیاب ہوا، اور بڑا کام

سعادت گنج کا ٹکٹ تین روپے بارہ آنے کا بنتا تھا۔ اس نے خرید لیا اور سفر شروع کر دیا۔

سعادت گنج میں اس کی بیوہ خالہ رہتی تھیں۔ سوچا وہاں چند روز رہے گا۔ پھر دس پندرہ روپے ان سے لے کر فیض آباد چلا جائے گا۔ وہ بے چاری بھی مریم کی طرح بڑی نیک اور محبت کرنے والی بی بی تھیں۔ اس طرح اور اس حالت میں وہاں جانے کو جی تو نہیں چاہ رہا تھا لیکن مجبوری تھی۔ اس کے سوا کوئی تدبیر بھی نہ تھی فیض آباد پہنچنے کی۔

کمپارٹمنٹ کے ایک گوشہ میں بیٹھا وہ باہر کے مناظر کی بظاہر سیر کر رہا تھا۔ لیکن درحقیقت وہ سخت ذہنی کشمکش میں مبتلا تھا۔

اسے گھر چھوڑنے کا صدمہ نہیں تھا۔ لیکن جس طرح گھر چھوڑنا پڑا تھا۔ اس کا بہت زیادہ صدمہ تھا۔

اور اب وہ ایک جلا وطن کی طرح فیض آباد کی طرف رواں دواں جا رہا تھا۔ لیکن سوچ رہا تھا۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ وہاں قسمت کا لکھا کیا پیش آتا ہے؟

کالج میں داخلہ کہاں سے ہوگا۔؟ کتابیں کس طرح خریدی جائیں گی بورڈنگ کے مصارف کہاں سے آئیں گے۔؟ روزمرہ کی ضروریات کے مصارف کس طرح پورے ہوں گے؟

خالہ بے چاری بیوہ تھیں۔ اور وہ جو مثل مشہور ہے۔ مولی اپنے تئوں آپ ہی بھاری، ان پر بالکل صادق آتی تھی، شوہر کا انتقال ہو چکا تھا۔

چھوٹے چھوٹے کئی بچے تھے۔ ان کی تعلیم و تربیت اور پرورش کا بار تمام تر انہی کے دوش ناتواں پر تھا۔ خالو نے کوئی جائیداد نہیں چھوڑی تھی صرف تین چار دوکانیں چھوڑی تھیں۔ جن کا ماہوار کرایہ کم و بیش دو ڈھائی سو آ جاتا تھا۔ بس اسی میں گزر بسر ہوتی تھی۔ ان حالات میں ان سے مکمل یا معقول امداد کی توقع رکھنا حماقت تھی وہ زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتی تھیں کہ دس پندرہ یا حد سے حد ۲۵ - ۳۰ روپے دے دیں۔ بلکہ سچ پوچھو تو اس رقم

کا نکالنا بھی ان کے لئے خاصا دشوار ہوگا۔

بہرحال اتنی رقم سے بنے گا کیا؟ — کالج اور بورڈنگ کے داخلہ سے لے کر کتابوں کی خریداری تک کا مرحلہ کس طرح طے ہوگا؟

یہی سوچتے سوچتے وہ سیٹ پر بیٹھے بیٹھے سو گیا۔

اعجاز کے ساتھیوں کو رخصت کرنے کے بعد امتیاز پر خلش، اضطراب اور وحشت کی کیفیت طاری ہوگئی۔ اس نے حقّہ ایک طرف رکھا اور اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ اتنا تیز، اتنا ذہین ساتھیوں اور استادوں میں اتنا ہر دلعزیز لڑکا — اور اس کے یہ لچھن؟ کتنے افسوس اور غیرت کا مقام ہے کہ اس نے چوری کی، گھر میں چوری کی۔ چچا زاد بہن کی چیز چرائی۔؟

لیکن اس نے چوری کیوں کی۔؟

"یقیناً اسے روپیہ کی ضرورت تھی — لیکن کیوں؟"

شاید اس لئے کہ وہ اپنے ظالم باپ کے پاس نہیں رہنا چاہتا تھا۔

اعزاز نے اس کی جو گفتگو میرے سامنے دوہرائی اس سے تو اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مجھے مریم کا قاتل سمجھتا ہے۔ مجھ سے متنفر ہے اور اس گھر سے رخصت ہونے کا منصوبہ پہلے ہی سے تیار کر چکا تھا۔

تو گھڑی اس لئے چرائی تھی کہ اسے فروخت کر کے یہاں سے رخت سفر باندھے!

بے وقوف لڑکا۔

اتنے میں پوسٹ مین آیا۔ امتیاز لپک کر آگے بڑھا۔ اس نے پوچھا

"کیوں بھئی کوئی خط لائے ہو"؟

پوسٹ مین نے دو خط بڑھاتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں — اعجاز میاں کے نام ہیں"!

خط دے کر پوسٹ مین چلا گیا۔ امتیاز نے لفافوں پر ایک نظر ڈالی پہلا لفافہ کھولا۔ یہ محکمہ تعلیمات کے ڈائریکٹر کا خط تھا۔

اتنے نمایاں طور پر تمہاری کامیابی سے متاثر ہو کر حکومت نے تمہارے لیے تیس روپے ماہوار کا وظیفہ منظور کیا ہے۔ چونکہ تمہارے وطن سے قریب ترین شہر فیض آباد ہے۔ لہٰذا وہاں کے گورنمنٹ کالج کے پرنسپل کو ہدایت کر دی گئی ہے۔ کہ تمہارا داخلہ کر لے، وظیفہ کی رقم پرنسپل کے توسط سے ہر مہینہ تم کو مل جایا کرے گی۔"

امتیاز نے اس خط کئی مرتبہ پڑھا۔ پھر نہایت احتیاط سے جیب میں رکھ لیا۔

اب دوسرے خط کی باری تھی۔ یہ گورنمنٹ کالج فیض آباد کے پرنسپل کا خط تھا۔

حکومت کی طرف سے ۳۰/ روپے ماہوار وظیفہ کی اطلاع تمہیں مل چکی ہوگی۔ میں نہایت مسرت سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔ تم آؤ تمہیں داخلہ کے سلسلہ ہر امکانی سہولت دی جائے گی۔ نیز میں نے تمہاری حوصلہ افزائی کے لئے یہ بھی طے کیا ہے کہ حکومت کے وظیفہ کے علاوہ

پرنسپل فنڈ سے بھی پندرہ روپے ماہوار بطور وظیفہ کے دیئے جائیں تا کہ بغیر کسی دشواری کے پوری یکسوئی کے ساتھ تعلیم کی تکمیل کر سکو۔ میں اطلاع دیتا ہوں کہ تمہارے لئے مزید سہولتیں بھی زیر غور ہیں۔

اس خط کو بھی امتیاز نے کئی مرتبہ پڑھا اور پھر کانپتے ہوئے ہاتھوں سے جیب میں رکھ لیا۔

اس وقت امتیاز کی آنکھیں پُرنم تھیں۔

وہ سوچ رہا تھا۔ اتنے ہونہار، اتنے ذہین، اتنے قابل لڑکے کو میں نے گھر سے نکال دیا۔ میں نے اس کا مستقبل تباہ کر دیا۔ اگر وہ یہاں ہوتا تو خط پا کر کتنا خوش ہوتا۔ کتنی خوشی اور مسرت کے ساتھ فیض آباد کا رخ کرتا۔

لیکن اب نہ جانے وہ کہاں ہوگا۔؟ کہاں ٹھوکریں کھا رہا ہوگا۔

نسیم کی گھڑی اگر اس نے چرائی تھی۔ تو اس لئے کہ اسے فروخت کر کے زادِ راہ کا انتظام کرے۔ کالج میں داخلہ لے اور اپنے مستقبل کی تعمیر۔

وہ مجھ سے متنفر تھا۔ اس لئے اسے چوری کرنی پڑی!
بے شک وہ مجھ سے نفرت کرتا۔ لیکن کیا حرج تھا۔ اگر چوری نہ کرتا اسے جتنے روپے درکار ہوتے لے لیتا۔ کیا میں انکار کر دیتا۔ انکار کس طرح کر سکتا تھا میں تو بڑی خوشی سے جو مانگتا دے دیتا۔

اتنے میں دروازے کے پاس آہٹ سی ہوئی۔ امتیاز نے کڑک کر پوچھا۔
"کون ہے؟"

زلیخا سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔

ماں کی تصویر مظلومیت کا پیکر۔ اس کے گال پر واقعی پانچوں انگلیوں کے نشانات ابھر آئے تھے۔

آج پہلی مرتبہ امتیاز کو احساس ہوا کہ واقعی اس نے بیوی کا حق ادا کیا

نہ اولاد کا، اگر اس نے بیوی کا حق ادا کیا ہوتا تو مریم ابھی نہ مرتی اور اُسے ابھی مرنا ہی نہ چاہیے تھا۔ اس کی ضرورت تھی، بچوں کو بھی — اور مجھے بھی؟"

دل ہی دل میں اس نے اعجاز کو معاف کر دیا۔

اس نے ضمیر میں ایک طرح کی خلش محسوس کی، اور اپنے آپ کو مستحق ملامت سمجھنے لگا۔ اس نے اپنے آپ سے پوچھا۔ مجھ جیسے باپ سے اولاد کو نفرت ہی ہونی چاہیے اور پھر دفعتہً اس نے زلیخا سے پوچھا۔

کیا تو بھی مجھ سے نفرت کرتی ہے"؟

زلیخا اس بے ہنگم سوال کا جواب نہ دے سکی۔ ٹکر ٹکر باپ کی طرف دیکھنے لگی۔ امتیاز نے بڑھ کر اسے اپنی طرف گھسیٹا اور اس کا سر اپنے سینے سے لگا کر رونے لگا۔ اسے روتا دیکھ کر اور مہر پدر کا یہ جلوہ دیکھ کر زلیخا کا بند غم بھی ٹوٹ گیا۔ وہ بھی اس کے سینے پر سر رکھے رکھے رونے لگی۔

اس برتاؤ نے وہ ساری دوری ختم کر دی۔ جو باپ اور بیٹی کے درمیان ہمیشہ سے چلی آ رہی تھی۔ دفعتہً اس نے سر اٹھایا اور باپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

ابا جی، نہ میں چور ہوں، نہ بھیا نے گھڑی چرائی تھی۔

امتیاز کو اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ اس نے پوچھا
" کیا کہا تو نے بیٹی ؟"
" اور پھر بیٹی نے گھڑی کی چوری کا سارا افسانہ شروع سے آخر تک
سنا دیا ۔"

(۳)

امتیاز خاموشی کے ساتھ لیکن باچشم پرنم یہ ساری داستان سنتا رہا
پھر اس نے ایک آہ مسرور کے ساتھ کہا۔
" تو یہ تھی اصل بات ؟"
زلیخا نے اقرار میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔
" ہاں ابا جان یہی بات تھی۔ صرف، یہی بات تھی۔ کہیے تو قرآن شریف اٹھا کر قسم کھا لوں ۔"
امتیاز نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔
" نہیں اس کی ضرورت نہیں، مجھے تمہاری زبان کا یقین ہے"!
زندگی میں آج پہلی مرتبہ باپ نے شفقت اور محبت کا اظہار کیا تھا لڑکی تھی کہ بچھی جا رہی تھی۔ جوش مسرت سے بے تاب ہوئی جا رہی تھی وہ ذرا دیر کے لئے ماں کا غم بھول گئی۔ اس نے محسوس کیا، باپ کی ذات میں مہر پدر اور الفت اور دونوں چیزیں جمع ہو گئی ہیں یہ کتنی خوشی کی بات تھی۔

آج تک ایسا نہیں ہوا تھا۔ آج تک باپ نے کبھی اس کی بات نہیں پوچھی تھی۔ اس نے سیدھے منہ بات نہیں کی تھی۔ اس کی گفتگو کو درخور اعتنا نہیں سمجھا تھا۔ لیکن آج وہ گھل مل کر باپ سے باتیں کر رہی تھی

یہ انقلاب، یہ انقلاب اپنے جلو میں مسرت اور نشاط و انبساط کی کتنی لازوال نعمتیں لایا تھا۔

کچھ سوچتے ہوئے زلیخا نے کہا۔

"شاید بھیا اپنے اسکول گئے ہوں؟"

امتیاز نے افسردہ لہجہ میں جواب دیا۔

"نہیں بیٹی، وہاں نہیں گیا۔ وہ بھی اس کے ساتھی تلاش کرتے ہوئے آئے تھے یہاں!"

زلیخا نے بے کلی کے ساتھ کہا۔

"تو پھر کہاں گئے وہ؟"

"میں نہیں جانتا۔"

شاید غیرت کے مارے بھاگ گئے کہیں!

"ہاں شاید ایسا ہی ہو — لیکن نہ بھاگتا تو بھی جاتا؟"

"کیوں اباجی پھر کیوں جاتے؟"

"اس لئے وہ مجھ سے نفرت کرتا تھا؟"

"آپ سے؟ — آپ سے نفرت؟"

میں نے اس کی ماں کو جلا جلا کر مار ڈالا۔ وہ ماں کی محبت میں مجھ سے نفرت کرنے لگا، اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اس گھر کو چھوڑ دے گا اور اسے اپنے فیصلے پر عمل کا وقت بھی مل گیا۔"

مجھے اس سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ اب اپنا جائزہ لیتا ہوں تو ایسا محسوس ہوتا ہے، جیسے اس کی نفرت بے جا نہیں تھی۔ میں مستحق بھی تھا۔ اس کا۔ واقعی میں جان ہار مریم کو خوش نہ رکھ سکا۔ میں نے اپنی اولاد کا حق ادا نہ کیا — شاید تو بھی مجھ سے نفرت کرتی ہو گی۔

اباجی میں —؟

ہاں — کیا نہیں کرتی"؟

"بھلا کوئی بھی اپنے باپ سے نفرت کرتی ہے، کبھی نہیں کر سکتی۔

چاہے وہ کیسا ہی ہو"!

گویا تیرا بھی میرے متعلق وہی خیال ہے جو اعجاز کا تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ نفرت نہیں کرتی۔"

اور پھر ذرا چپ رہ کر امتیاز نے کہا

"تو نفرت کرے یا محبت لیکن میں بہرحال اب تجھ سے محبت کروں گا۔"

زلیخا نے بالکل بچوں کی طرح معصوم لہجہ میں سوال کیا۔

"صرف مجھ سے؟ — بھیا سے نہیں؟"

امتیاز نے کانپتی ہوئی آواز کے ساتھ جواب دیا۔

اس سے تو میں نے ہمیشہ کی۔ یہ دوسری بات ہے کہ اظہار نہیں کیا۔"

زلیخا نے پھر ایک سوال کیا۔

چچا جان نے ان کی جو باتیں بتائی ہیں ان کے بعد بھی؟

گویا ہتھیار ڈالتے ہوئے امتیاز نے جواب دیا۔

ہاں بیٹی، میں نے تنبیہہ و تادیب اور تربیت کے لئے بارہا اس پر غصہ کیا۔ کبھی کبھی مارا پیٹا بھی، لیکن میرا دل اس کی محبت سے خالی رہا ہے۔ ایسا تو کبھی نہیں ہوا۔"

وہ بھی آپ کی طرح غصہ ور ہیں۔ اور ذرا سی بات کو بہت زیادہ محسوس کر کے خفا ہو جاتے ہیں بگڑ جاتے ہیں۔ لیکن دل آئینہ کی طرح صاف ہے"!

"اسی لئے تو مجھے اور تجھے چھوڑ کر چلا گیا"!

"اباجی لیکن سچ کہیے گا اگر آپ ان کی جگہ ہوتے تو کیا کرتے؟"

امتیاز نے کچھ سوچا اور کہا۔

"میں؟ — میں بھی وہی کرتا جو اس نے کیا ہے!"

پھر وہ قہقہہ لگا کر ہنسنے لگا۔ اور فوراً ہی یہ قہقہہ گریہ بے اختیار میں تبدیل ہو گیا۔

(۴)

زلیخا یہ تو ہمیشہ سے محسوس کرتی تھی کہ گھر میں اگر ابا جان کسی کا کچھ تھوڑا بہت خیال کرتے ہیں۔ تو وہ اعجاز ہے، لیکن اسے چاہتے ہیں اور اتنا زیادہ چاہتے ہیں۔ اس کا اندازہ آج ہوا۔ باپ کی اس زار و زبوں حالت پر اس کا دل بہت کڑھا۔ وہ کچھ کہنے والی تھی، کہ امتیاز کے لب ہلے۔ اس نے کہا۔

مجھے غم اس کا ہے کہ یہاں سے وہ ایک داغ لے کر گیا ہے — چوری کا داغ!"

لیکن ابا جی! وہ ہرگز چور نہیں تھے۔ گھڑی پر میری نظر پڑی تھی میں نے اُٹھا لی تھی۔ میں نے سازش کی تھی، میں نے زبردستی انہیں سازشی کیا تھا، اور میں نے ہی اسے ان کی جیب میں رکھا۔ اور اپنی جان کی قسم دے کر رازداری کی تاکید کی تھی۔ اگر چور ہوں تو میں ہوں۔ وہ کہاں سے ہوئے؟"

"لیکن بیٹی، نکلی تو اس کی جیب سے!"

"اس سے کیا ہوتا ہے"؟"

"کیوں نہیں ہوتا؟" دیکھ لو سب کچھ ہو گیا، اب باقی کیا رہا ہے؟"

لیکن میں اپنے بھیا پر یہ داغ نہیں لگنے دوں گی"؟

"کیا کرو گی تم"؟

"میں ابھی جاتی ہوں اور نسیم کو سارا ماجرا سنا دوں گی۔ چچی، ماں کو اور چچا جان کو سارا واقعہ بتا دوں گی۔"

"اور وہ یقین کر لیں گے؟"

"کیوں نہیں کریں گے؟"

"وہ سمجھیں گے بھائی کے ہاتھ سے کلنک کا ٹیکہ چھڑانے کی یہ ترکیب گھڑی گئی ہے — نہیں بیٹی نسیم احراز یا کلثوم کسی سے کچھ نہ کہنا۔ اب تو جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ اب اسے قسمت کے حوالے کرو۔"

"کیا آپ بھیا کو بلائیں گے نہیں؟"

"مجھے کیا معلوم وہ کہاں ہے؟"

"ڈھونڈیئے، تلاش کیجئے۔ مل ہی جائیں گے۔"

"میں یہ بھی نہیں کر سکتا، میری بچی!"

"کیوں ابا جی۔ کیوں نہیں کر سکتے؟"

"کیا ایک چور کو گھر میں بلواؤں۔ کیا ایک چور کی تلاش کروں؟ نہیں ایسا نہیں کر سکتا"!

"پھر چور —"

میری اور تمہاری نظر میں نہیں، لیکن کلثوم، احراز اور نسیم کی نگاہ میں وہ چور ہی ہے، ہم اس کی صفائی دینے کی جتنی کوشش کریں گے وہ الٹی پڑے گی۔ رہنے دو اس بات کو نہ چھیڑو، اگر وہ بے گناہ ہے، اور میرا دل کہتا ہے کہ بے گناہ ہے۔ تو قدرت خود ہی اسے بے گناہ ثابت کر دے گی؟"

"اس عرصہ میں جو کچھ بھی ان پر گزرتی رہے؟"

ہاں — اور بلانے کا جہاں تک تعلق ہے۔ اگر یہ واقعہ پیش نہ آیا ہوتا لیکن وہ چلا گیا ہوتا۔ تب بھی میں اسے نہ بلاتا۔"

"کیوں نہ بلاتے؟"

(پندار کے ساتھ) میں اس کا باپ ہوں، لاکھ خطار کار اور عصیاں شعار سہی، لیکن اپنے بیٹے کے سامنے جھک نہیں سکتا۔ اس کی خوشامد نہیں کر سکتا۔ وہ بہر حال میرا بیٹا ہے اور میں اس کا باپ ہوں"۔

اور پھر ذرا دیر خاموش رہ کر امتیاز نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"بیٹی زلیخا تم نہیں جانتیں۔ مجھے اس کے جانے کا کتنا صدمہ ہے اور یہ صدمہ اس لئے اور زیادہ ہے کہ میں اپنے آپ کو خطا کار اور اُسے بے قصور سمجھتا ہوں، لیکن امتیاز نے آج تک کسی کے سامنے گردن نہیں جھکائی، کسی تیس مار خاں اور طرم خاں کے سامنے بھی نہیں، وہ اپنے بیٹے کے سامنے جھک جائے گا۔؟"

"یہ کیسا ہو سکتا ہے، اس غم میں گھل گھل کر مر جانا منظور ہے مگر اپنی آن توڑ دوں، یہ نہیں ہو سکتا"؟

"تو پھر اب کیا ہو گا ابا جی"!

"بھیا کس طرح آئیں گے؟"

"میں کچھ نہیں کہہ سکتا بیٹی"

اور ایک بار پھر تاکید کرتا ہوں۔ خبردار، کلثوم یا نسیم یا احرانہ کے سامنے اعجاز کی بے گناہی کا قصہ کبھی نہ چھیڑنا، ورنہ مجھے صدمہ ہو گا اور میں تم سے خفا ہو جاؤں گا۔

آپ کے حکم کے خلاف میں کچھ نہیں کر سکتی لیکن بھیا ——"

اور یہ کہتے کہتے پھر اس کا گریہ گلوگیر ہو گیا۔ امتیاز نے ایک مرتبہ پھر اس کا سر سینہ سے لگایا اور شفقت و محبت کے ساتھ اس کے سر پہ ہاتھ پھرنے لگا۔

زلیخا دیکھ نہ سکی، دیکھ سکتی تو یہ دیکھ کر اور زیادہ رونے لگتی کہ اس کا آن اور شان والا باپ بھی رو رہا تھا اور پوری قوت سے اپنے آنسو اور اپنی سسکی روکنے کی کوشش کر رہا تھا — خود اس کا جی چاہ رہا تھا کہ روئے اور پھوٹ کر روئے

(۵)

بڑی دیر تک اعجاز اپنی سیٹ پہ بیٹھا سوتا رہا۔ آنکھ کھلی تو کوئی بڑا اسٹیشن تھا۔ مسافروں کا ایک ریلا چڑھنے کی اور دوسرا ریل سے اترنے کی کوشش کر رہا تھا۔ خاصی کش مکش سفر کرنے والوں اور سفر ختم کرنے والوں کے درمیان ہو رہی تھی۔ بعض منچلے کھڑکی کے راستے کود رہے تھے اور اتر رہے تھے گاڑی یہاں زیادہ دیر ٹھہرتی تھی۔ لیکن اتنی دیر بھی نہیں کہ سارا وقت یہیں صرف کر دے کافی کش مکش اور کافی دیر کے بعد یہ طوفان اور افراتفری کا دور ختم ہوا۔ جنہیں جگہ ملی وہ بیٹھ گئے۔
جو جگہ نہ پا سکے وہ اس امید میں کھڑے ہو گئے کہ اگلے اسٹیشن پہ کون مسافر اترتا ہے، جیسے اترے فوراً اس کی سیٹ پر قبضہ کر لیں۔ کچھ لوگ آس پاس کھڑے تھے، کہ مسافر پیشاب کے لئے اٹھے تو اس کی جگہ پر براجمان ہو جائیں اور جب وہ اعتراض کرے تو اسے اپنا ٹکٹ دکھا دیں اور کہیں ۔

"ہم نے بھی ٹکٹ خریدا ہے، کوئی یہ سیٹ ریزرو تھوڑی ہی ہے تمہارے لئے، ایسے ہی دھنا سیٹھ ہو تو سیکنڈ یا فسٹ کلاس میں سفر کرو یہاں تھرڈ میں کیوں مرے تھے آ کر۔"

گاڑی نے رخصت ہونے کا بگل بجایا۔ لیکن ابھی جنبش میں نہیں آئی تھی۔ کہ پاس بیٹھے ہوئے مسافر نے اعجاز سے پوچھا۔

"آپ کہاں تشریف لے جارہے ہیں؟"

اعجاز نے بے رخی اور سرد مہری کے ساتھ جواب دیا۔

فیض آباد تک ــــ

وہ ہنستا اور کہنے لگا۔

"یعنی آپ فیض آباد تک کا سفر کر رہے ہیں؟"

اعجاز نے تیوری چڑھا کر سوال کیا۔

"مطلب کیا ہے آپ کا؟"

وہ ہنستا ہوا بولا۔ مطلب یہ ہے کہ جس اسٹیشن سے گاڑی چھوٹ رہی ہے، یہ فیض آباد ہے۔ اس کے بعد دوسرا فیض آباد اب کہاں آئے گا۔ یہ آپ ہی جانتے ہوں گے۔

یہ سن کر اعجاز ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا، بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا ارے ــــ

اور پھر، ٹھسا ٹھس بھرے ہوئے کمپارٹمنٹ سے باہر نکلنے کی کوشش کرنے لگا۔ اتنی دیر میں گاڑی نے رینگنا شروع کر دیا تھا۔ بہر حال جس طرح بھی ہو سکا۔ بعد از خرابی بسیار دروازے تک پہنچا۔ اب گاڑی نے اسپیڈ پکڑ لی تھی لیکن اس نے ہمت کی اور پلیٹ فارم پر کود گیا۔ جیسے ہی زمین پر پاؤں ٹکے ایک نئی مصیبت ٹکٹ کلکٹر کی صورت میں نظر آئی اس نے ایک مرتبہ اعجاز کا سر سے پاؤں تک جائزہ لیا۔ پھر پوچھا۔ کودے کیوں۔

وہ بولا "میں سو گیا تھا۔ مجھے پتہ نہیں تھا کہ فیض آباد آ گیا۔

اس جواب سے وہ مطمئن نہیں ہوا۔ اس نے پوچھا

"سامان کہاں ہے کیا گاڑی میں رہ گیا؟"

اعجاز نے ہراساں ہو کر جواب دیا۔

"سامان میرے ساتھ کچھ نہیں تھا۔"

اب ٹکٹ کلکٹر اس کی طرف سے مشکوک ہو چلا تھا، اس نے اور چبھتا ہوا سوال کیا۔

" اور ٹکٹ ؟ وہ ساتھ ہے یا نہیں ؟"

اعجاز کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں، اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ٹکٹ نکالا اور اس کی طرف بڑھتے ہوئے ایک مجرم کی طرح بجھے ہوئے لہجہ میں کہا۔

ٹکٹ تو یہ ہے —— لیکن سعادت گنج کا ہے ؟

ٹکٹ کلکٹر نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا، کہنے لگا۔

بہت اچھے قابل رشک ذہانت رکھتے ہو۔ کتنا اچھا گُر ہے فیض آباد اترنے کے لئے ٹکٹ سعادت گنج کا لیا جائے، اسے کہتے ہیں" ہلدی لگے نہ پھٹکری رنگ آئے چوکھا ؟"

اعجاز لاجواب ہو گیا۔ ٹکٹ کلکٹر نے پوچھا۔

جواب کیوں نہیں دیتے بھئی ؟

وہ بولا جواب کیا دوں، سوا اس کے کہ غلطی ہو گئی، دراصل مجھے اترنا سعادت گنج ہی تھا۔ اس کے بعد فیض آباد آج آنا تھا۔

وہ گرگ باراں دیدہ ٹٹولنے والی نظروں سے گھورتا ہوا بولا۔

بہت اچھے جا رہے ہو بھئی — گویا آپ فیض آباد قبل از وقت تشریف لائے

" جی نہیں وہاں مجھے کام تھا۔"

اور یہاں بھی کام ہی سے آنے والے تھے ؟ لیکن وہاں کے بجائے یہاں آ گئے، خیر زیادہ بحث و گفتگو کی ضرورت نہیں۔ جرمانے سمیت بارہ روپے تین آنے نکالو جیب سے۔

(۶)

لیکن اعجاز کے پاس روپے کہاں تھے جو پیش کرتا۔ ایک خطا کار کی طرح دم سادھے چپ چاپ کھڑا رہا۔ ٹکٹ کلکٹر کو غصہ آ گیا۔ اس نے کہا۔

"نکالتا ہے یا پولیس کے حوالے کر دوں؟"

نہایت سکون کے ساتھ اعجاز نے جواب دیا۔

"پولیس کے حوالے کر دیجئے۔"

"تم روپے نہیں دو گے"؟

"میں کہاں سے دوں"؟

"پھر سفر کس بوتے پر کیا تھا، جب جیب خالی تھی؟"

اسی لئے تو سعادت گنج جا رہا تھا کہ یہاں آنے کے لئے کرایہ کا بندوبست کر لوں؟

خیر تم کرایہ کا بندوبست نہیں کر سکے۔ ہم تمہارے روٹی کپڑے کا انتظام کئے دیتے ہیں۔ جیل میں بڑی اچھی خوراک ملتی ہے اور بڑا صاف ستھرا لباس رہنے کو شاندار کمرے، خدمت کو ملازم دست بستہ حاضر، ریڈیو کا بندوبست بھی ہوتا ہے۔ بڑے ٹھاٹھ سے رہو گے۔ آؤ چلو۔

اور وہ چپ چاپ کلکٹر کے پیچھے ہو لیا۔ دل ہی دل میں اپنے آپ کو اور اپنی بے وقت کی نیند کو ملامت کر رہا تھا۔ لیکن اب کیا

کے لئے باعث مسرت ہے تو ہمارے لئے باعث فخر، چنانچہ ان کے اعزاز میں ہم نے ایک شاندار پارٹی کا انتظام کیا ہے۔

دوسرا ساتھی بولا، لیکن پر لطف بات یہ ہے کہ بارات کا دولھا غائب ہے۔ انہیں ہم نے دس بجے کا وقت دیا تھا۔ اور اب ساڑھے گیارہ بج چکے ہیں۔

امتیاز نے سب کچھ سننے کے بعد کہا۔

"وہ یہاں سے تو گیا کافی دیر ہو گئی اسے گئے ہوئے۔"

"لیکن وہاں تو اب تک نہیں پہنچے۔"

"شاید اب پہنچ گیا ہو گا؟"

لیکن راستہ تو ایک ہی ہے۔ وہاں گئے ہوتے تو راستے میں مل نہ جاتے۔"

"تم لوگ بحث کیوں کر رہے ہو"؟ کہہ دیا وہ یہاں نہیں ہے اب اسکول گیا ہے یا جہنم؟ میں نہیں جانتا۔

دونوں لڑکوں نے حیرت سے امتیاز پر ایک نظر ڈالی اور واپس مڑے چلتے چلتے، ایک دوسرے سے سرگوشی کے لہجہ میں کہا۔

جسے امتیاز نے بھی سن لیا۔

"کتنا ڈراؤنا شخص ہے —— ہو نہ ہو یہی اعجاز کا باپ ہے۔"

اور پھر اُچک کر سائیکل پر بیٹھے اور نو دو گیارہ ہو گئے۔

اسٹیشن راستے میں پڑتا تھا۔ اگر آتے وقت ان دونوں نے اوپر چھلانگ لیا ہوتا۔ تو شاید اعجاز سے ملاقات ہو جاتی، لیکن وہ ایسا کیوں کرتے۔

اعجاز گھر سے نکل کر سیدھا اسٹیشن پہنچا۔ میل جا چکا تھا۔ البتہ اتفاق کی بات کہ پسنجر ٹرین کھڑی تھی۔ یہ رات کے گیارہ بجے فیض آباد پہنچتی تھی۔ اعجاز بسم اللہ مجریہا و مرساہا کہہ کر اس میں بیٹھ گیا۔ ٹکٹ اس نے ایک درمیانی سٹیشن سعادت گنج کا لیا تھا۔ وہ پانچ روپے کا نوٹ جو اس نے احراز کو دکھانا چاہا تھا۔ اس وقت تو نہ ملا۔ اب دستیاب ہوا، اور بڑا کام

سعادت گنج کا ٹکٹ تین روپے بارہ آنے کا بنتا تھا۔ اس نے خرید لیا اور سفر شروع کر دیا۔

سعادت گنج میں اس کی بیوہ خالہ رہتی تھیں۔ سوچا وہاں چند روز رہے گا۔ پھر دس پندرہ روپے ان سے لے کر فیض آباد چلا جائے گا۔ وہ بے چاری بھی مریم کی طرح بڑی نیک اور محبت کرنے والی بی بی تھیں۔ اس طرح اور اس حالت میں وہاں جانے کو جی تو نہیں چاہ رہا تھا لیکن مجبوری تھی۔ اس کے سوا کوئی تدبیر بھی نہ تھی فیض آباد پہنچنے کی۔

کمپارٹمنٹ کے ایک گوشہ میں بیٹھا وہ باہر کے مناظر کی بظاہر سیر کر رہا تھا۔ لیکن درحقیقت وہ سخت ذہنی کش مکش میں مبتلا تھا۔

اسے گھر چھوڑنے کا صدمہ نہیں تھا۔ لیکن جس طرح گھر چھوڑنا پڑا تھا۔ اس کا بہت زیادہ صدمہ تھا۔

اور اب وہ ایک جلا وطن کی طرح فیض آباد کی طرف رواں دواں جا رہا تھا۔ لیکن سوچ رہا تھا۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ وہاں قسمت کا لکھا کیا پیش آتا ہے؟

کالج میں داخلہ کہاں سے ہوگا۔؟ کتابیں کس طرح خریدی جائیں گی بورڈنگ کے مصارف کہاں سے آئیں گے۔؟ روزمرہ کی ضروریات کے مصارف کس طرح پورے ہوں گے؟

خالہ بے چاری بیوہ تھیں۔ اور وہ جو مثل مشہور ہے۔ مولی اپنے توں آپ ہی بھاری، ان پر بالکل صادق آتی تھی، شوہر کا انتقال ہو چکا تھا۔

چھوٹے چھوٹے کئی بچے تھے۔ ان کی تعلیم و تربیت اور پرورش کا بار تمام تر انہی کے دوش ناتواں پر تھا۔ خالو نے کوئی جائیداد نہیں چھوڑی تھی صرف تین چار دو کانیں چھوڑی تھیں۔ جن کا ماہوار کرایہ کم و بیش دو ڈھائی سو آ جاتا تھا۔ بس اسی میں گزر بسر ہوتی تھی۔ ان حالات میں ان سے مکمل یا معقول امداد کی توقع رکھنا حماقت تھی وہ زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتی تھیں کہ دس پندرہ یا حد سے حد ۲۵ - ۳۰ روپے دے دیں۔ بلکہ سچ پوچھو تو اس رقم

کا نکالنا بھی ان کے لئے خاصا دشوار ہوگا۔

بہرحال اتنی رقم سے بنے گا کیا؟ — کالج اور بورڈنگ کے داخلہ سے لے کر کتابوں کی خریداری تک کا مرحلہ کس طرح طے ہوگا؟

یہی سوچتے سوچتے وہ سیٹ پر بیٹھے بیٹھے سوگیا۔

اعجاز کے ساتھیوں کو رخصت کرنے کے بعد امتیاز پر خلش، اضطراب اور وحشت کی کیفیت طاری ہوگئی۔ اس نے حقہ ایک طرف رکھا اور اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ اتنا تیز، اتنا ذہین ساتھیوں اور استادوں میں اتنا ہر دلعزیز لڑکا — اور اس کے یہ لچھن؟ کتنے افسوس اور غیرت کا مقام ہے کہ اس نے چوری کی، گھر میں چوری کی۔ چچازاد بہن کی چیز چرائی۔؟

لیکن اس نے چوری کیوں کی۔؟

"یقیناً اسے روپیہ کی ضرورت تھی — لیکن کیوں؟"

شاید اس لئے کہ وہ اپنے ظالم باپ کے پاس نہیں رہنا چاہتا تھا۔ احراز نے اس کی جو گفتگو میرے سامنے دوہرائی اس سے تو اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مجھے مریم کا قاتل سمجھتا ہے۔ مجھ سے متنفر ہے اور اس گھر سے رخصت ہونے کا منصوبہ پہلے ہی سے تیار کر چکا تھا۔

تو گھڑی اس لئے چرائی تھی کہ اسے فروخت کر کے یہاں سے رخت سفر باندھے!

بے وقوف لڑکا۔

اتنے میں پوسٹ مین آیا۔ امتیاز لپک کر آگے بڑھا۔ اس نے پوچھا

"کیوں بھئی کوئی خط لائے ہو"؟

پوسٹ مین نے دو خط بڑھاتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں — اعجاز میاں کے نام ہیں"!

خط دے کر پوسٹ مین چلا گیا۔ امتیاز نے لفافوں پر ایک نظر ڈالی پہلا لفافہ کھولا۔ یہ محکمہ تعلیمات کے ڈائریکٹر کا خط تھا۔

اتنے نمایاں طور پر تمہاری کامیابی سے متاثر ہو کر حکومت نے تمہارے لئے تیس روپے ماہوار کا وظیفہ منظور کیا ہے۔ چونکہ تمہارے وطن سے قریب ترین شہر فیض آباد ہے۔ لہٰذا وہاں کے گورنمنٹ کالج کے پرنسپل کو ہدایت کر دی گئی ہے۔ کہ تمہارا داخلہ کر لے، وظیفہ کی رقم پرنسپل کے توسط سے ہر مہینہ تم کو مل جایا کرے گی۔"

امتیاز نے اس خط کئی مرتبہ پڑھا۔ پھر نہایت احتیاط سے جیب میں رکھ لیا۔

اب دوسرے خط کی باری تھی۔ یہ گورنمنٹ کالج فیض آباد کے پرنسپل کا خط تھا۔

حکومت کی طرف سے ۳۰ روپے ماہوار وظیفہ کی اطلاع تمہیں مل چکی ہوگی۔ میں نہایت مسرت سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔ تم آؤ تمہیں داخلہ کے سلسلہ ہر امکانی سہولت دی جائے گی۔ نیز میں نے تمہاری حوصلہ افزائی کے لئے یہ بھی طے کیا ہے کہ حکومت کے وظیفہ کے علاوہ

پرنسپل فنڈ سے بھی پندرہ روپے ماہوار بطور وظیفہ کے دیئے جائیں تاکہ بغیر کسی دشواری کے پوری یکسوئی کے ساتھ تعلیم کی تکمیل کر سکو۔ میں اطلاع دیتا ہوں کہ تمہارے لئے مزید سہولتیں بھی زیر غور ہیں۔

اس خط کو بھی امتیاز نے کئی مرتبہ پڑھا اور پھر کانپتے ہوئے ہاتھوں سے جیب میں رکھ لیا۔

اس وقت امتیاز کی آنکھیں پُرنم تھیں۔

وہ سوچ رہا تھا۔ اتنے ہونہار، اتنے ذہین، اتنے قابل لڑکے کو میں نے گھر سے نکال دیا۔ میں نے اس کا مستقبل تباہ کر دیا۔ اگر وہ یہاں ہوتا تو خط پا کر کتنا خوش ہوتا۔ کتنی خوشی اور مسرت کے ساتھ فیض آباد کا رخ کرتا۔

لیکن اب نہ جانے وہ کہاں ہوگا۔؟ کہاں ٹھوکریں کھا رہا ہوگا۔

نسیم کی گھڑی اگر اس نے چرائی تھی۔ تو اس لئے کہ اسے فروخت کر کے زادراہ کا انتظام کرے۔ کالج میں داخلہ لے اور اپنے مستقبل کی تعمیر۔

وہ مجھ سے متنفر تھا۔ اس لئے اسے چوری کرنی پڑی!
بے شک وہ مجھ سے نفرت کرتا۔ لیکن کیا حرج تھا۔ اگر چوری نہ کرتا اسے جتنے روپے درکار ہوتے لے لیتا۔ کیا میں انکار کر دیتا۔ انکار کس طرح کر سکتا تھا میں تو بڑی خوشی سے جو مانگتا دے دیتا۔
اتنے میں دروازے کے پاس آہٹ سی ہوئی۔ امتیاز نے کڑک کر پوچھا۔
"کون ہے ؟"
زلیخا سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔
ماں کی تصویر مظلومیت کا پیکر۔ اس کے گال پر واقعی پانچوں انگلیوں کے نشانات ابھر آئے تھے۔
آج پہلی مرتبہ امتیاز کو احساس ہوا کہ واقعی اس نے بیوی کا حق ادا کیا

نہ اولاد کا، اگر اس نے بیوی کا حق ادا کیا ہوتا تو مریم ابھی نہ مرتی اور اُسے ابھی مرنا ہی نہ چاہیے تھا۔ اس کی ضرورت تھی، بچوں کو بھی — اور مجھے بھی؟"
دل ہی دل میں اس نے اعجاز کو معاف کر دیا۔
اس نے ضمیر میں ایک طرح کی خلش محسوس کی، اور اپنے آپ کو مستحق ملامت سمجھنے لگا۔ اس نے اپنے آپ سے پوچھا۔ مجھ جیسے باپ سے اولاد کو نفرت ہی ہونی چاہیے اور پھر دفعتہً اس نے زلیخا سے پوچھا۔
کیا تو بھی مجھ سے نفرت کرتی ہے "؟
زلیخا اس بے ہنگم سوال کا جواب نہ دے سکی۔ ٹکر ٹکر باپ کی طرف دیکھنے لگی۔ امتیاز نے بڑھ کر اسے اپنی طرف گھسیٹا اور اس کا سر اپنے سینے سے لگا کر رونے لگا۔ اسے روتا دیکھ کر اور مہر پدر کا یہ جلوہ دیکھ کر زلیخا کا بند غم بھی ٹوٹ گیا۔ وہ بھی اس کے سینے پر سر رکھے رکھے رونے لگی۔
اس برتاؤ نے وہ ساری دوری ختم کر دی۔ جو باپ اور بیٹی کے درمیان ہمیشہ سے چلی آ رہی تھی۔ دفعتہً اس نے سر اٹھایا اور باپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔
ابا جی، نہ میں چور ہوں، نہ بھیا نے گھڑی چرائی تھی۔

امتیاز کو اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ اس نے پوچھا
"کیا کہا تو نے بیٹی؟"
"اور پھر بیٹی نے گھڑی کی چوری کا سارا افسانہ شروع سے آخر تک
سنا دیا۔"

(۳)

امتیاز خاموشی کے ساتھ لیکن باچشم پرُنم یہ ساری داستان سنتا رہا
پھر اس نے ایک آہ مسرور کے ساتھ کہا۔

"تو یہ تھی اصل بات؟"

زلیخا نے اقرار میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

"ہاں ابا جان یہی بات تھی۔ صرف، یہی بات تھی۔ کہیے تو قرآن شریف اٹھا کر قسم کھالوں ۔"

امتیاز نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"نہیں اس کی ضرورت نہیں، مجھے تمہاری زبان کا یقین ہے"!

زندگی میں آج پہلی مرتبہ باپ نے شفقت اور محبت کا اظہار کیا تھا لڑکی تھی کہ بچھی جا رہی تھی۔ جوش مسرت سے بے تاب ہوئی جا رہی تھی وہ ذرا دیر کے لئے ماں کا غم بھول گئی۔ اس نے محسوس کیا، باپ کی ذات میں مہر پدر اور الفت اور دونوں چیزیں جمع ہوگئی ہیں یہ کتنی خوشی کی بات تھی۔

آج تک ایسا نہیں ہوا تھا۔ آج تک باپ نے کبھی اس کی بات نہیں پوچھی تھی۔ اس نے سیدھے منہ بات نہیں کی تھی۔ اس کی گفتگو کو درخور اعتنا نہیں سمجھا تھا۔ لیکن آج وہ گھل مل کر باپ سے باتیں کر رہی تھی

یہ انقلاب، یہ انقلاب اپنے جلو میں مسرت اور نشاط و انبساط کی کتنی لازوال نعمتیں لایا تھا۔

کچھ سوچتے ہوئے زلیخا نے کہا۔

"شاید بھیا اپنے اسکول گئے ہوں؟"

امتیاز نے افسردہ لہجہ میں جواب دیا۔

"نہیں بیٹی، وہاں نہیں گیا۔ وہ بھی اس کے ساتھی تلاش کرتے ہوئے آئے تھے یہاں!"

زلیخا نے بے کلی کے ساتھ کہا۔

"تو پھر کہاں گئے وہ؟"

"میں نہیں جانتا۔"

شاید غیرت کے مارے بھاگ گئے کہیں!

"ہاں شاید ایسا ہی ہو — لیکن نہ بھاگتا تو بھی جاتا؟"

"کیوں ابا جی پھر کیوں جاتے۔"

"اس لئے وہ مجھ سے نفرت کرتا تھا؟"

"آپ سے؟ — آپ سے نفرت؟"

میں نے اس کی ماں کو جلا جلا کر مار ڈالا۔ وہ ماں کی محبت میں مجھ سے نفرت کرنے لگا، اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اس گھر کو چھوڑ دے گا اور اسے اپنے فیصلے پر عمل کا وقت بھی مل گیا۔"

مجھے اس سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ اب اپنا جائزہ لیتا ہوں تو ایسا محسوس ہوتا ہے، جیسے اس کی نفرت بے جا نہیں تھی۔ میں مستحق بھی تھا۔ اس کا۔ واقعی میں جان ہار مریم کو خوش نہ رکھ سکا۔ میں نے اپنی اولاد کا حق ادا نہ کیا — شاید تو بھی مجھ سے نفرت کرتی ہوگی۔

ابا جی میں —؟

ہاں — کیا نہیں کرتی"؟

"بھلا کوئی بھی اپنے باپ سے نفرت کرتی ہے، کبھی نہیں کر سکتی۔

چاہے وہ کیسا ہی ہو"!
گویا تیرا بھی میرے متعلق وہی خیال ہے جو اعجاز کا تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ نفرت نہیں کرتی۔"
اور پھر ذرا چپ رہ کر امتیاز نے کہا
"تو نفرت کرے یا محبت لیکن میں بہر حال اب تجھ سے محبت کروں گا۔"
زلیخا نے بالکل بچوں کی طرح معصوم لہجہ میں سوال کیا۔
"صرف مجھ سے؟ — بھیا سے نہیں؟"
امتیاز نے کانپتی ہوئی آواز کے ساتھ جواب دیا۔
اس سے تو میں نے ہمیشہ کی۔ یہ دوسری بات ہے کہ اظہار نہیں کیا۔"
زلیخا نے پھر ایک سوال کیا۔
چچا جان نے ان کی جو باتیں بتائی ہیں ان کے بعد بھی؟
گویا ہتھیار ڈالتے ہوئے امتیاز نے جواب دیا۔
ہاں بیٹی، میں نے تنبیہ و تادیب اور تربیت کے لئے بارہا اس پر غصہ کیا۔ کبھی کبھی مارا پیٹا بھی، لیکن میرا دل اس کی محبت سے خالی رہا ہے۔ ایسا تو کبھی نہیں ہوا۔"
وہ بھی آپ کی طرح غصہ ور ہیں۔ اور ذرا سی بات کو بہت زیادہ محسوس کر کے خفا ہو جاتے ہیں بگڑ جاتے ہیں۔ لیکن دل آئینہ کی طرح صاف ہے"!
"اسی لئے تو مجھے اور تجھے چھوڑ کر چلا گیا"!
"ابا جی لیکن سچ کہیے گا اگر آپ ان کی جگہ ہوتے تو کیا کرتے؟"
امتیاز نے کچھ سوچا اور کہا۔
"میں؟ — میں بھی وہی کرتا جو اس نے کیا ہے"!
پھر وہ قہقہہ لگا کر ہنسنے لگا۔ اور فوراً ہی یہ قہقہہ گریہ بے اختیار میں تبدیل ہو گیا۔

(۴)

زلیخا یہ تو ہمیشہ سے محسوس کرتی تھی کہ گھر میں اگر ابا جان کسی کا کچھ تھوڑا بہت خیال کرتے ہیں۔ تو وہ اعجاز ہے، لیکن اسے چاہتے ہیں اور اتنا زیادہ چاہتے ہیں۔ اس کا اندازہ آج ہوا۔ باپ کی اس زار و زبوں حالت پر اس کا دل بہت کڑھا۔ وہ کچھ کہنے والی تھی، کہ امتیاز کے لب ہلے۔ اس نے کہا۔

مجھے غم اس کا ہے کہ یہاں سے وہ ایک داغ دے کر گیا ہے — چوری کا داغ!"

لیکن ابا جی! وہ ہرگز چور نہیں تھے۔ گھڑی پر میری نظر پڑی تھی میں نے اُٹھالی تھی۔ میں نے سازش کی تھی، میں نے زبردستی انہیں سازش کیا تھا، اور میں نے ہی اسے ان کی جیب میں رکھا۔ اور اپنی جان کی قسم دے کر رازداری کی تاکید کی تھی۔ اگر چور ہوں تو میں ہوں۔ وہ کہاں سے ہوئے؟"

"لیکن بیٹی، نکلی تو اس کی جیب سے!"

"اس سے کیا ہوتا ہے"؟

"کیوں نہیں ہوتا؟" دیکھ لو سب کچھ ہو گیا، اب باقی کیا رہا ہے؟"

لیکن میں اپنے بھیا پر یہ داغ نہیں لگنے دوں گی"؟

"کیا کرو گی تم"؟

"میں ابھی جاتی ہوں اور نسیم کو سارا ماجرا سنا دوں گی۔ چچی اماں کو اور چچا جان کو سارا واقعہ بتا دوں گی۔"

"اور وہ یقین کر لیں گے؟"

"کیوں نہیں کریں گے؟"

"وہ سمجھیں گے بھائی کے ماتھے سے کلنک کا ٹیکہ چھڑانے کی یہ ترکیب گھڑی گئی ہے — نہیں بیٹی نسیم احراز یا کلثوم کسی سے کچھ نہ کہنا۔ اب تو جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ اب اسے قسمت کے حوالے کرو۔"

"کیا آپ بھیا کو بلائیں گے نہیں؟"

"مجھے کیا معلوم وہ کہاں ہے؟"

"ڈھونڈیے، تلاش کیجیے۔ مل ہی جائیں گے؟"

"میں یہ بھی نہیں کر سکتا، میری بچی!"

"کیوں ابا جی۔ کیوں نہیں کر سکتے؟"

"کیا ایک چور کو گھر میں بلواؤں۔ کیا ایک چور کی تلاش کروں؟" نہیں ایسا نہیں کر سکتا"!

"پھر چور —"

میری اور تمہاری نظر میں نہیں، لیکن کلثوم، احراز اور نسیم کی نگاہ میں وہ چور ہی ہے، ہم اس کی صفائی دینے کی جتنی کوشش کریں گے وہ الٹی پڑے گی۔ رہنے دو اس بات کو نہ چھیڑو، اگر وہ بے گناہ ہے، اور میرا دل کہتا ہے کہ بے گناہ ہے۔ تو قدرت خود ہی اسے بے گناہ ثابت کر دے گی؟"

"اس عرصہ میں جو کچھ بھی ان پر گزرتی رہے؟"

ہاں — اور بلانے کا جہاں تک تعلق ہے۔ اگر یہ واقعہ پیش نہ آیا ہوتا لیکن وہ چلا گیا ہوتا۔ تب بھی میں اسے نہ بلاتا۔"

"کیوں نہ بلاتے؟"

(پندار کے ساتھ) میں اس کا باپ ہوں، لاکھ خطار کار اور عصیاں شعار سہی، لیکن اپنے بیٹے کے سامنے جھک نہیں سکتا۔ اس کی خوشامد نہیں کر سکتا۔ وہ بہر حال میرا بیٹا ہے اور میں اس کا باپ ہوں۔"

اور پھر ذرا دیر خاموش رہ کر امتیاز نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"بیٹی زلیخا تم نہیں جانتیں۔ مجھے اس کے جانے کا کتنا صدمہ ہے اور یہ صدمہ اس لئے اور زیادہ ہے کہ میں اپنے آپ کو خطا کار اور اُسے بے قصور سمجھتا ہوں، لیکن امتیاز نے آج تک کسی کے سامنے گردن نہیں جھکائی، کسی تیس مار خاں اور طرم خاں کے سامنے بھی نہیں، وہ اپنے بیٹے کے سامنے جھک جائے گا۔؟"

"یہ کیسا ہو سکتا ہے، اس غم میں گھل گھل کر مر جانا منظور ہے مگر اپنی آن توڑ دوں، یہ نہیں ہو سکتا۔"؟

"تو پھر اب کیا ہو گا ابا جی"!

"بھیا کس طرح آئیں گے؟"

"میں کچھ نہیں کہہ سکتا بیٹی"

اور ایک بار پھر تاکید کرتا ہوں۔ خبردار، کلثوم یا نسیم یا اعجاز کے سامنے اعجاز کی بے گناہی کا قصہ کبھی نہ چھیڑنا، ورنہ مجھے صدمہ ہو گا اور میں تم سے خفا ہو جاؤں گا۔

آپ کے حکم کے خلاف میں کچھ نہیں کر سکتی لیکن بھیا ——"

اور یہ کہتے کہتے پھر اس کا گریہ گلوگیر ہو گیا۔ امتیاز نے ایک مرتبہ پھر اس کا سر سینہ سے لگایا اور شفقت و محبت کے ساتھ اس کے سر پہ ہاتھ پھیرنے لگا۔

زلیخا دیکھ نہ سکی، دیکھ سکتی تو یہ دیکھ کر اور زیادہ رونے لگتی کہ اس کا آن اور شان والا باپ بھی رو رہا تھا اور پوری قوت سے اپنے آنسو اور اپنی سسکی روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ خود اس کا جی چاہ رہا تھا کہ روئے اور پھوٹ کر روئے

(۵)

بڑی دیر تک اعجاز اپنی سیٹ پہ بیٹھا سوتا رہا۔ آنکھ کھلی تو کوئی بڑا اسٹیشن تھا۔ مسافروں کا ایک ریلا چڑھنے کی اور دوسرا ریل سے اترنے کی کوشش کر رہا تھا۔ خاصی کش مکش سفر کرنے والوں اور سفر ختم کرنے والوں کے درمیان ہو رہی تھی۔ بعض منچلے کھڑکی کے راستے کود رہے تھے اور اتر رہے تھے گاڑی یہاں زیادہ دیر ٹھہرتی تھی۔ لیکن اتنی دیر بھی نہیں کہ سارا وقت یہیں صرف کر دے کافی کش مکش اور کافی دیر کے بعد یہ طوفان اور افراتفری کا دور ختم ہوا۔ جنہیں جگہ ملی وہ بیٹھ گئے۔

جو جگہ نہ پا سکے وہ اس امید میں کھڑے ہو گئے کہ اگلے اسٹیشن پہ کون مسافر اترتا ہے، جیسے اترے فوراً اس کی سیٹ پر قبضہ کر لیں۔ کچھ لوگ آس پاس کھڑے تھے، کہ مسافر پیشاب کے لئے اٹھے تو اس کی جگہ پر براجمان ہو جائیں اور جب وہ اعتراض کرے تو اسے اپنا ٹکٹ دکھا دیں اور کہیں۔

"ہم نے بھی ٹکٹ خریدا ہے، کوئی یہ سیٹ ریزرو تھوڑی ہی ہے تمہارے لئے، ایسے ہی دھنا سیٹھ ہو تو سیکنڈ یا فسٹ کلاس میں سفر کرو یہاں تھرڈ میں کیوں مرے تھے آ کر۔"

گاڑی نے رخصت ہونے کا بگل بجایا۔ لیکن ابھی جنبش میں نہیں آئی تھی۔ کہ پاس بیٹھے ہوئے مسافر نے اعجاز سے پوچھا۔

"آپ کہاں تشریف لے جا رہے ہیں ؟"

اعجاز نے بے رخی اور سرد مہری کے ساتھ جواب دیا۔

فیض آباد تک —

وہ ہنستا اور کہنے لگا۔

"یعنی آپ فیض آباد تک کا سفر کر رہے ہیں ؟"

اعجاز نے تیوری چڑھا کر سوال کیا۔

"مطلب کیا ہے آپ کا ؟"

وہ ہنستا ہوا بولا۔ مطلب یہ ہے کہ جس اسٹیشن سے گاڑی چھوٹ رہی ہے، یہ فیض آباد ہے۔ اس کے بعد دوسرا فیض آباد اب کہاں آئے گا۔ یہ آپ ہی جانتے ہوں گے۔

یہ سن کر اعجاز ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا، بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا

ارے —

اور پھر، ٹھسا ٹھس بھرے ہوئے کمپارٹمنٹ سے باہر نکلنے کی کوشش کرنے لگا۔ اتنی دیر میں گاڑی نے رینگنا شروع کر دیا تھا۔ بہر حال جس طرح بھی ہو سکا۔ بعد از خرابی بسیار دروازے تک پہنچا۔ اب گاڑی نے اسپیڈ پکڑ لی تھی لیکن اس نے ہمت کی اور پلیٹ فارم پر کود گیا۔ جیسے ہی زمین پر پاؤں ٹکے ایک نئی مصیبت ٹکٹ کلکٹر کی صورت میں نظر آئی اس نے ایک مرتبہ اعجاز کا سر سے پاؤں تک جائزہ لیا۔ پھر پوچھا۔ کودے کیوں۔

وہ بولا " میں سو گیا تھا۔ مجھے پتہ نہیں تھا کہ فیض آباد آ گیا۔

اس جواب سے وہ مطمئن نہیں ہوا۔ اس نے پوچھا

"سامان کہاں ہے کیا گاڑی میں رہ گیا ؟"

اعجاز نے ہراساں ہو کر جواب دیا۔

"سامان میرے ساتھ کچھ نہیں تھا۔"

اب ٹکٹ کلکٹر اس کی طرف سے مشکوک ہو چلا تھا، اس نے اور چبھتا ہوا سوال کیا۔

"اور ٹکٹ؟ وہ ساتھ ہے یا نہیں؟"

اعجاز کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں، اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ٹکٹ نکالا اور اس کی طرف بڑھتے ہوئے ایک مجرم کی طرح جھجے ہوئے لہجہ میں کہا۔

"ٹکٹ تو یہ ہے —— لیکن سعادت گنج کا ہے؟"

ٹکٹ کلکٹر نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا، کہنے لگا۔

"بہت اچھے قابلِ رشک ذہانت رکھتے ہو۔ کتنا اچھا گُر ہے فیض آباد اترنے کے لئے ٹکٹ سعادت گنج کا لیا جائے، اسے کہتے ہیں" ہلدی لگے نہ پھٹکڑی رنگ آئے چوکھا؟"

اعجاز لاجواب ہو گیا۔ ٹکٹ کلکٹر نے پوچھا۔

جواب کیوں نہیں دیتے بھئی؟

وہ بولا جواب کیا دوں، سوا اس کے کہ غلطی ہو گئی، دراصل مجھے اترنا سعادت گنج ہی تھا۔ اس کے بعد فیض آباد آج آنا تھا۔

وہ گرگ باراں دیدہ ٹٹولنے والی نظروں سے گھورتا ہوا بولا۔

بہت اچھے جا رہے ہو بھئی — گویا آپ فیض آباد قبل از وقت تشریف لائے

"جی نہیں وہاں مجھے کام تھا۔"

اور یہاں بھی کام ہی سے آنے والے تھے؟ لیکن وہاں کے بجائے یہاں آگئے، خیر زیادہ بحث و گفتگو کی ضرورت نہیں۔ جرمانے سمیت بارہ روپے تین آنے نکالو جیب سے۔

(۶)

لیکن اعجاز کے پاس روپے کہاں تھے جو پیش کرتا۔ ایک خطاکار کی طرح دم سادھے چپ چاپ کھڑا رہا۔ ٹکٹ کلکٹر کو غصہ آگیا۔ اس نے کہا۔

" نکالتا ہے یا پولیس کے حوالے کر دوں ؟"

نہایت سکون کے ساتھ اعجاز نے جواب دیا۔

پولیس کے حوالے کر دیجئے۔

" تم روپے نہیں دو گے "؟

" میں کہاں سے دوں "؟

" پھر سفر کس بوتے پر کیا تھا، جب جیب خالی تھی ؟"

اسی لئے تو سعادت گنج جا رہا تھا کہ یہاں آنے کے لئے کرایہ کا بندوبست کر لوں ؟"

خیر تم کرایہ کا بندوبست نہیں کر سکے۔ ہم تمہارے روٹی کپڑے کا انتظام کئے دیتے ہیں۔ جیل میں بڑی اچھی خوراک ملتی ہے اور بڑا صاف ستھرا لباس رہنے کو شاندار کمرے، خدمت کو ملازم دست بستہ حاضر، ریڈیو کا بندوبست بھی ہوتا ہے۔ بڑے ٹھاٹھ سے رہو گے۔ آؤ چلو۔

اور وہ چپ چاپ کلکٹر کے پیچھے ہو لیا۔ دل ہی دل میں اپنے آپ کو اور اپنی بے وقت کی نیند کو ملامت کر رہا تھا۔ لیکن اب کیا

ہو سکتا تھا۔

اتنے میں اسٹیشن ماسٹر کا کمرہ آگیا۔ ٹکٹ کلکٹر نے اسٹیشن ماسٹر سے اعجاز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے۔

آپ سے ملئے — آپ جیل جانے کے لئے بے تاب ہیں "۔

اسٹیشن ماسٹر نے عینک اتار کر الگ رکھ دی اور غور سے اعجاز کا معائنہ فرمایا۔ پھر کہا۔

کیوں صاحب زادے جیل کیوں جانا چاہتے ہو "؟

اعجاز نے اپنی اور ٹکٹ کلکٹر کی گفتگو مختصر طور پر دہرائی۔

اسٹیشن ماسٹر صاحب غور سے اعجاز کی باتیں سنتے رہے، پھر پوچھا سعادت گنج کس کے پاس جا رہے تھے ؟"

" وہاں میری خالہ رہتی ہیں "!

" کیوں جا رہے تھے۔ ان کے پاس "؟

گو ان کی بھی حالت اچھی نہیں لیکن مجھے امید تھی کہ وہ پندرہ بیس روپے مجھے دے دیں گی "!

" ان روپوں کا کیا کرتے "؟

" فیض آباد کا ٹکٹ لیتا اور یہاں آجاتا "!

" یہاں آکر کیا کرتے "؟

" کالج میں داخلہ لیتا "

" کیا تم نے میٹرک کا امتحان پاس کر لیا ہے "؟

" جی ہاں —

" مارک کتنے لئے "؟

" ہزار میں ۹۱۵ "

یہ مارک تو اس لڑکے کے ہیں۔ جو سارے صوبے میں اول آیا ہے آج ہی میں نے کسی سے سنا ہے "!

" وہ میں ہی ہوں "

(حیرت سے) سارے صوبے میں اول آنے والے تم ہو"؟

جی ہاں — جس طرح چاہیے تصدیق کر لیجئے"!

خوب — لیکن کالج میں داخلہ کچھ خالہ جی کا گھر تو ہے نہیں داخلہ کے لئے روپے چاہئیں، کتابیں بھی خریدنی ہوں گی، بورڈنگ میں رہو گے تو اس مصارف الگ ہوں گے ڈے اسکالر بن کر رہنا چاہتے ہو، تو بھی قیام وطعام کا بندوبست کرنا ہی پڑے گا"۔

جی ہاں، یہ سب ہو گا۔

"اگر خالہ سے پندرہ بیس روپے مل جاتے یہ سارے کام اس سے انجام پا جاتے"؟

جی نہیں — ان روپوں سے تو یہاں تک آجاتا اور دو چار روز کا خرچ چلا لیتا"؟

"اس کے بعد کیا کرتے؟"

"سب کچھ سکتا ہوں"

"کیا کر سکتے ہو، کچھ معلوم بھی تو ہو"!

ایک نوجوان شخص ہوں۔ ٹیوشن کر سکتا ہوں۔ پارٹ ٹائم ملازمت کر سکتا ہوں۔

اور اگر ٹیوشن نہ ملے، پارٹ ٹائم ملازمت کا بندوبست بھی نہ ہو سکے تو؟ — کیونکہ ضروری نہیں جو ٹیوشن کی تلاش میں نکلے، اسے مل ہی جائے۔ یہی حال ملازمت کا بھی ہے۔ ملی تو ملی، نہ ملی تو نہ ملی!"

"جی ہاں یہ پہلو بھی غور طلب ہے"!

"پھر کیا غور کیا تم نے"؟

"مزدوری تو مل ہی جائے گی"!

مزدوری تو مل ہی جائے گی" مزدوری بھی کر لو گے"؟

کیوں نہیں؟ — اگر آپ اجازت دیں اس اسٹیشن پر قلی کی حیثیت

سے بھی کام کرنے کو آمادہ ہوں۔ اس طرح اتنی بات ہو جائے گی کہ اپنے مصارف پورے کر لوں۔"

کیا واقعی اس کے لئے تیار ہو تم؟"

بے شک، آخر مجھے اپنی زندگی بنانی ہے، اپنے مستقبل کی تعمیر کرنی ہے، اپنی حالت سُدھارنی ہے، ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ رہنے سے تو کچھ نہیں ہوگا۔"

"کیا تمہارے کنبہ میں کوئی ایسا نہیں جو کفالت کر سکے؟"

جی نہیں"

ٹکٹ کلکٹر نے پوچھا

"ماں باپ سب مر گئے؟"

اسٹیشن ماسٹر نے اُسے ٹوکا۔

"کیوں ایسے بے دردانہ سوالات کرتے ہو، دو ہی باتیں ہیں، یا تو ماں باپ مر گئے یا زندہ ہیں۔ مگر کفالت نہیں کر سکتے، کر سکتے ہوتے تو خالہ کے ہاں سعادت گنج کیوں جاتا؟"

ٹکٹ کلکٹر نے پھر چوٹ کی "گیا کہاں؟ وہ تو اسٹیشن ہی سے انہیں سلام کرتا ہوا یہاں آن ٹپکا —"

اسٹیشن ماسٹر نے اعجاز سے خطاب کرتے ہوئے کہا

بہر حال اگر تم سچے ہو تو میں تمہاری مدد کروں گا" — جتنے ہی زیادہ تم سچے ثابت ہو گئے، اتنی ہی زیادہ میری مدد بڑھتی جائے گی۔"

(۷)

اسٹیشن ماسٹر صاحب کا نام خلیق احمد تھا اور واقعی یہ اسم بامسمیٰ ثابت ہوئے ، حد درجہ خلیق ، متواضع اور شریف ، انہیں اعجاز کی باتوں میں صداقت جھلکتی محسوس ہوئی انہوں نے ایک پریشان حال اور آشفتہ روزگار کی مدد کرنا اپنا فرض سمجھا۔ جس کوارٹر میں وہ رہتے تھے اس کا ایک کمرہ جس کا رخ باہر کی طرف تھا۔ انہوں نے اعجاز کے لئے خالی کرا دیا۔ کھانا کھلایا ، بستر کا انتظام کیا اور بڑی دیر تک دلجوئی کی باتیں کرتے رہے ۔

صبح ناشتہ کے بعد وہ اعجاز کو لے کر خود گورنمنٹ کالج گئے۔ پرنسپل صاحب سے ان کی دیرینہ شناسائی تھی ، اُدھر چٹ بھیجی ادھر بلا لئے گئے۔ خلیق نے اعجاز کا تعارف کرایا اور سفارش کی کہ اسے زیادہ سے زیادہ رعایت کے ساتھ داخل کر لیا جائے اور جتنی زیادہ سے زیادہ سہولتیں ممکن ہوں بہم پہنچائی جائیں۔ پرنسپل نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور کہا ۔

آپ کس کی سفارش کر رہے ہیں ؟ جو لڑکا سارے صوبے میں اول آیا ہو اس کے لئے بھی سفارش کی ضرورت پیش آ سکتی ہے ۔ اور پھر رعایت و سہولت کا سوال ہی کیا ہے۔ حکومت کی طرف سے بیس روپے ماہوار وظیفہ اس کے لئے اعلان ہوا ہے اور پندرہ روپے ماہوار

میں پرنسپل فنڈ سے دوں گا۔ اس کے بعد اگر کچھ کمی رہی تو دیکھا جائے گا اس کا بھی کوئی نہ کوئی بندوبست ہو جائے گا — کیوں میاں صاحبزادے میرا خط اور گورنمنٹ کا لیٹر مل گیا تھا"؟

اعجاز کچھ سٹ پٹا سا گیا۔ پہلو بدل کر رہ گیا۔ پرنسپل زندہ دل اور خوش طبع آدمی تھے۔ ایک بار پھر زور سے ہنسے اور فرمایا۔

"شاید وفورِ شوق میں تم خط ملنے سے پہلے ہی چل کھڑے ہوئے"!

پھر پرنسپل صاحب نے دریافت کیا، بورڈنگ میں رہو گے؟ یا شہر میں کہیں بندوبست کر سکتے ہو قیام کا؟

اعجاز نے کہا۔ "شہر میں کہیں انتظام نہیں ہے"

پرنسپل صاحب نے سر کھجاتے ہوئے فرمایا۔

"اچھا بھئی گنجائش نکالنا ہی پڑے گا — بات یہ ہے اس مرتبہ بورڈنگ پر بڑی یلغار ہے ہر چہار طرف سے"!

اسٹیشن ماسٹر صاحب بول پڑے۔

کوئی مضائقہ نہیں، قیام کا انتظام ہو جائے گا۔ جب تک میرا تبادلہ نہیں ہو جاتا۔ یہ میرے پاس رہے گا۔

پرنسپل صاحب کو اعتراض ہو سکتا تھا۔ پھر انہوں نے چند رسمی سی کارروائیوں کے بعد داخلہ کر لیا اور اعجاز سے کہا۔

اب تم جا سکتے ہو، داخلہ ہو گیا۔ کل سے پابندی کے ساتھ حاضری دو۔ جس طرح تم نے اپنے اسکول کا نام روشن کیا ہے اسی طرح مجھے امید ہے اس کالج کا نام روشن کرو گے اپنے کنبہ اور خاندان کا نام روشن کرو گے۔

کالج میں داخلہ سے اور ۴۵ روپے ماہوار وظیفہ سے اور اسٹیشن ماسٹر صاحب کے ہاں قیام کے بندوبست سے اعجاز کو بڑی خوشی ہوئی تھی۔ اس کا خیال تھا۔ کہ بورڈنگ میں بہت وقت بہت ضائع ہوتا ہے ڈے اسکالر رہ کر آدمی زیادہ محنت اور یکسوئی کے ساتھ پڑھ سکتا ہے

لہٰذا اسٹیشن ماسٹر کی پیش کش کو اس نے دلی شکریہ کے ساتھ قبول کر لیا تھا۔

لیکن جب پرنسپل صاحب نے اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے یہ امید ظاہر کی کہ وہ کالج کا باپ دادا کا، کنبہ اور خاندان کا نام روشن کرے گا۔ تو وہ دبی ہوئی سی آہ کرنے پر مجبور ہو گیا۔ اسے اپنا باپ یاد آیا، جس سے وہ نفرت کرتا تھا؛ چچا یاد آیا۔ چچی اماں یاد آئی۔ ان سب کی بے مہریاں اور کج ادائیاں یاد آئیں۔ گھر سے بے آبرو ہو کر نکلنا یاد آیا، چوری کا الزام یاد آیا، باپ کے ہاتھ سے پٹنا یاد آیا اور وہ سوچنے لگا۔

کیا میں اس خاندان کا اور اس باپ کا نام روشن کروں گا؟ اور پھر آنکھوں کے سامنے مرحومہ ماں کی تصویر گردش کرنے لگی۔ اور —— زلیخا کا اترا ہوا چہرہ نظر کے سامنے آ گیا۔ ساری خوشی کافور ہو گئی، سارا ولولہ ختم ہو گیا۔

(۸)

فیض آباد ایک پرانا شہر تھا۔ یہاں کی جامع مسجد، یہاں کا امام باڑہ۔ یہاں کے شاہی مقبرے، یہاں کے اہل اللہ کے مزارات اور اور صوفیوں کی خانقاہیں اپنے اندر بڑی کشش رکھتی تھیں۔

کالج سے واپسی پر اسٹیشن ماسٹر خود تو اسٹیشن اپنی ڈیوٹی پر چلے گئے، مگر اپنے لڑکے لئیق کو حکم دے گئے کہ بہت اچھی طرح اعجاز کو شہر کے قابل دید مقامات کی سیر سہ پہر کو اپنے ساتھ لے جاکر کرا دے۔

دوپہر کے کھانے سے فراغت کے بعد اعجاز لیٹ گیا اور اپنے ماضی، حال اور مستقبل پر غور کرنے لگا۔

لوگ ماضی کو بڑے شوق سے یاد کرتے ہیں، لیکن اس کے ماضی میں اشک و آہ اور حسرت و محرومی کے سوا کیا تھا۔ لوگ حال میں اتنے مگن ہوتے ہیں کہ مستقبل کو یکسر فراموش کر دیتے ہیں لیکن اس کا حال کیا تھا ——— سعیِ ناتمام، طلب نارسا۔

لوگ مستقبل کے سہارے زندہ رہتے ہیں۔ کیسی کیسی امیدیں باندھتے ہیں، اپنے روشن مستقبل سے۔

لیکن اس کا مستقبل بھی روشن ہوگا؟

"کیا وہ بھی مستقبل کے دامن میں ماضی کی محرومیوں اور حال کی ناسازیوں کی تلافی کر سکے گا؟"

یہ تھے وہ خیالات جو رہ رہ کر اس کے دماغ میں گردش کر رہے تھے وہ کروٹوں پر کروٹیں بدل رہا تھا۔ لیکن نہ نیند آتی تھی نہ ان خیالات کی یورش سے پیچھا چھوٹتا تھا۔

اتنے میں چار بج گئے اور لئیق، ایک نوخیز، خوب رو، اور تنومند نوجوان بہت اچھے لباس میں ملبوس آکر بالکل سامنے کھڑا ہو گیا اور آتے ہی تقاضا کیا۔

"چلئے سیر کرا لاؤں میں آپ کو"!

اعجاز اُٹھ کھڑا ہوا اور افسردگی کے ساتھ گویا ہوا۔

"آیئے — چلیں سیر کر آئیں۔

لئیق ٹھٹھا مار کر ہنسا اور کہنے لگا۔

"کیا یوں ہی؟"

اعجاز نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔

"جی ہاں — پھر اور کس طرح"؟

لئیق ان لوگوں میں تھا۔ جو بہت جلد بے تکلف ہو جاتے ہیں چنانچہ بڑے بے تکلفانہ لہجہ میں گویا ہوا۔

خدا کے بندے، ہم باہر جا رہے ہیں۔ سیر کو جا رہے ہیں، قابل دید مقامات کی زیارت کو جا رہے ہیں، آدمی بن کے چلو — کپڑے تو بدل لو!

اعجاز تلملا گیا۔ اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"اچھا تو پھر کبھی دیکھا جائے گا!"

اور یہ کہہ کر وہ اپنے بستر پہ بیٹھ گیا۔

لئیق نے متحیر ہو کر اُسے دیکھا اور پوچھا۔

پھر کبھی کیوں دیکھا جائے گا؟ — تم جاتے جاتے بیٹھ کیوں گئے ارادہ کیوں بدل دیا —؟

اعجاز نے ایک پھیکے سے تبسم کے ساتھ جواب دیا۔ بات یہ ہے کہ جو کپڑے میرے بدن پر ہیں۔ ان کے سوا میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے نہ

لباس، نہ ٹوپی، نہ جوتا۔"

لئیق نے خلوص اور محبت کی نظروں سے اپنے اس نئے اور عجیب مہمان کو دیکھا اور بولا۔

تو اتنی سی بات پر حضور نے ارادہ ملتوی کر دیا۔ حد ہو گئی مغائرت کی ہم تو تمہیں بھائی سمجھیں اور تم ـــــ

اور پھر کچھ کہے بغیر وہ تیزی سے اندر گیا اور ذرہ دیر میں ایک عمدہ سا سوٹ لے کر واپس آگیا۔

لیجیے جناب، "زیب تن فرمایئے اس ملبوس کو"!

اعجاز نے انکار کیا۔ لاکھ لاکھ انکار کیا، لیکن لئیق کے اصرار اور بے تکلفی میں کچھ اس درجہ اپنائیت تھی کہ آخر اسے ہتھیار ڈالنا پڑے اور لئیق کا لایا ہوا لباس پہن لینا پڑا۔ لئیق نے اُسے لے جا کر آئینہ کے سامنے کھڑا کر دیا اور کہا۔

"سچ کہنا، کیا معلوم نہیں ہوتا کہ یہ سوٹ صرف تمہارے لیے ہی سیا گیا تھا؟"

اور واقعہ بھی یہی تھا، لئیق اعجاز کا ہم عمر بھی تھا اور ہم قد بھی اس کا سوٹ اعجاز کے بالکل فٹ آگیا۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کہیں یہ میرا ہی تو نہیں ہے"؟

لئیق ہنستا ہوا بولا۔ اگر نہیں تھا تو اب ہے۔ آؤ چلیں، مغرب تک ہمیں واپس آجانا چاہیئے"! اعجاز منہ سے کچھ کہے بغیر اس کے ساتھ ہو لیا کبھی وہ اپنے آپ کو دیکھتا، کبھی اپنے لباس کو کبھی لئیق کو!

❀

(۹)

تھوڑی ہی دیر میں اعجاز نے محسوس کر لیا کہ لیئق بہت اچھا ساتھی بہت اچھا دوست اور بہت اچھا رفیق راہ ہے، ساتھ ہی ساتھ بذلہ سنج، حاضر جواب اور خوش طبع بھی، خلوص سے بھرپور اخلاق کا پیکر۔ یہ اعجاز کا نہیں لیئق کا کمال تھا کہ اس نے راستہ چلتے چلتے اسے بھی بے تکلف دوست بنا لیا۔ ورنہ وہ تو آہوئے رم خوردہ کی طرح کسی سے مانوس ہونا جانتا ہی نہیں تھا۔ محرومیوں اور مایوسیوں نے شوق کی چنگاری افسردہ کر دی تھی زمانہ کی ٹھوکروں اور اپنوں کی بے اعتنائیوں نے نشاط کار کا جذبہ چھین لیا تھا۔ باپ چچا اور دوسرے عزیزوں کے سنگ دلانہ برتاؤ نے اس کا اعتماد انسانیت کے اوپر سے اٹھا دیا تھا۔ وہ سوچا کرتا تھا۔ جب یہ لوگ اپنے نہ ہوئے۔ تو دوسروں سے کیا توقع کی جا سکتی ہے؟

لیکن اسٹیشن ماسٹر صاحب اور ان کے فرزند دلبند لیئق نے اسے سوچنے پر مجبور کر دیا کہ — ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں۔ اس کا وہ اعتماد جو متزلزل ہو چکا تھا اتنی ہی سی دیر میں پھر بحال ہونے لگا، اب تک وہ اپنے آپ سے بھی نفرت کرتا تھا اور دوسروں سے بھی اپنے بزرگوں اور عزیزوں تک سے بھی، لیکن اب اس مختصر سی مدت میں وہ محسوس کرنے لگا ہر شخص نفرت کا سزاوار نہیں ہوتا، ایسے لوگ بھی ہیں جو دوسروں کو اپنے ساتھ مانوس ہونے پر مجبور کر دیتے ہیں — لیئق نے بھی تو یہی کر دکھایا ہے

بہت دنوں کے بعد آج پھر اعجاز اپنے آپ کو چونچال محسوس کر رہا ہے۔ مسرت کا چشمہ ابل رہا تھا۔ اس کے دل حسرت نصیب سے۔

لئیق نے اسے بہت اچھی طرح سارے شہر کی سیر کرائی۔ کوئی بھی قابل دید اور قابل ذکر مقام ایسا نہیں تھا جو اس نے نہ دکھایا ہو۔ جہاں تک اعجاز کا تعلق تھا۔ آج زندگی میں پہلی مرتبہ اس تپاک اور گرمجوشی کے ساتھ اس کی پذیرائی ہو رہی تھی۔ اس کی دلجوئی کی جا رہی تھی۔ ان باتوں کا نفسیاتی طور پر اثر پڑنا ہی چاہیے تھا اور وہ پڑا بھی۔ یعنی اب اسنے زندگی میں رعنائی اور کشش محسوس ہونے لگی۔ وہ زندگی جو اسے کاٹنے کو دوڑتی تھی، جو اس کے لیے بلائے جان ہو گئی تھی جس کا روئے زشت اس کے لئے سوہان روح بن چکا تھا۔ اب اس کی کشش اسے اپنی طرف کھینچ رہی تھی اور وہ کھنچتا چلا جا رہا تھا۔ نہ ہاتھ باگ پر تھا نہ پا تھا رکاب میں۔

مغرب کے قریب یہ سفر ختم ہو گیا۔ اعجاز نے کہا۔

"اب چلنا چاہیے۔ تم کہہ رہے تھے، مغرب تک ہمیں گھر واپس آجانا ہے۔"

لئیق نے جواب دیا۔ ہاں بھئی اصول یہی ہے۔ اماں اسے گوارا ہی نہیں کر سکتیں۔ کہ ہم میں سے کوئی بھی غروب آفتاب کے بعد گھر سے باہر رہے۔ لیکن آج کی آزادی ہمیں معاف ہے۔

" اعجاز نے پوچھا۔ "وہ کس طرح"؟

لئیق نے جواب دیا "تمہاری وجہ سے آج کسی طرح کی بازپرس نہیں ہو گی۔ آخر مہمان کا بھی تو کچھ حق ہوا کرتا ہے۔

اعجاز نے کہا" لیکن مہمان تو گھر چلنے کے لئے تیار ہے۔"

"مگر میزبان کی یہ مرضی نہیں ہے۔ سینما دیکھیں گے ذرا۔"

"سینما ۔۔"

اس سے زیادہ اعجاز کچھ نہ کہہ سکا۔ اس نے سینما کا ذکر تو بہت سنا تھا لیکن آج تک دیکھنے کا موقع نہ ملا تھا۔ اگر لئیق کا کوئی اور پروگرام ہوتا تو

شاید وہ انکار کر دیتا اور اصرار کر کے واپس جاتا۔ سینما کی دعوت ایسی نہیں تھی، جو مسترد کی جا سکتی، خود اس کا جی بھی چاہ رہا تھا کہ اس عجیب و غریب چیز کو ایک مرتبہ تو دیکھ لے جس کے لئے خلقت ٹوٹی پڑتی ہے لوگ ٹکٹ کے انتظار میں گھنٹوں اور پہروں قطار بنائے کھڑے رہتے ہیں۔

" لیئق نے پوچھا " تو پھر کیا ارادہ ہے "؟

اعجاز نے جواب دیا، وہی جو تمہارا ہے "؟ پھر کہنے لگا۔

اپنی خوشی سے نہ آئے، نہ اپنی خوشی چلے، البتہ اگر گھر میں باز پرس ہوئی تو جواب دہی تمہیں کرنی پڑے گی اسوچ لو اچھی طرح ابھی وقت ہے اور موقع ہے۔"

لیکن لیئق نے قلندرانہ شان سے کہا۔

جو کچھ ہو گا۔ دیکھا جائے گا، اب تو چلتے ہیں۔

❁

(۱۰)

کھیل خاصا دلچسپ تھا!

اور نہ دلچسپ ہوتا تو بھی دلچسپ تھا۔ کیوں کہ آج پہلی مرتبہ اسے سینما ہال میں قدم رکھنے اور پردۂ سیمیں پر متحرک بلکہ "بولتی گاتی" تصویریں دیکھنے کا موقع حاصل ہوا تھا۔

لیئق کے لئے یہ کوئی نئی چیز نہ تھی۔ وہ مہینے میں ایک آدھ بار کبھی ماں سے اجازت لے کر ۔ کیوں کہ والد اس طرح کے معاملات میں بالکل غیر جانبدار تھے ۔ کبھی چوری چھپے دیکھ ہی آیا کرتا تھا۔ چنانچہ وہ سینما بھی دیکھتا رہا اور فلم پر تنقید بھی کرتا رہا اعجاز محو تھا۔ فلم بینی میں کہ یہ تنقید اسے بے لطف کئے دے رہی تھی۔ لیکن ہوں ہاں کرنے پر مجبور تھا۔

تنقید کے ساتھ ہی ساتھ تعارف کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ لیئق نے اپنے سارے معلومات کا دفتر آج اعجاز کے سامنے کھول دینے کا تہیہ کر لیا تھا۔ ہر اداکار کے بارے میں وہ ایک مستقل رائے رکھتا تھا اور نہیں چاہتا تھا۔ کہ اعجاز گمراہی میں مبتلا ہو کر کوئی رائے قائم کرے جو اس کی رائے سے مطابقت نہ رکھتی ہو۔ لہٰذا وہ اپنا فرض سمجھ رہا تھا۔ کہ اعجاز کی رہنمائی کرتا رہے۔

یہ ایکٹر نہایت نالائق ہے ۔ کبھی کوئی اچھا پارٹ نہ کر سکا، نہ جانے فلم والے کیوں اسے سر پہ اُٹھائے ہوئے ہیں ۔

یہ ایکٹرس خوب صورت ضرور ہے لیکن مکالمے بولنے کی صلاحیت سے بالکل محروم ہے، لاحول ولا قوۃ۔ اور گانا تو بالکل نہیں جانتی۔ افسانہ اچھا ہے لیکن ڈائرکشن کمزور ہے!"

فوٹوگرافی ٹھیک ہے۔ لیکن صدابندی بالکل لغو اور مہمل۔"

جب تک فلم چلتی رہی۔ لئیق کی تنقید و تعارف کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ نہایت بے دلی، لیکن پوری مستعدی کے ساتھ اعجاز برابر ہاں میں ہاں ملاتا رہا۔ لیکن درحقیقت اس کی ساری توجہ فلم کی طرف مرکوز تھی۔ اور واقعہ یہ ہے کہ وہ بہت لطف اندوز ہوا۔

انٹرول کے وقت لئیق نے آئس کریم کا آرڈر دیا۔ پھر بھنے ہوئے خستہ بادام اور پستے خریدے۔ خود بھی ان چیزوں سے لذت اندوز ہوا اور اعجاز کو بھی اپنے ساتھ برابر کا شریک رکھا۔

آئس کریم کھانے کے دوران میں اس نے پوچھا۔

"کہو کیا رائے ہے فلم کے بارے میں؟"

اعجاز نے جو کچھ لئیق کی زبان سے ابھی ذرا دیر پہلے سنا تھا۔ وہی دوہرا دیا۔ اس سعادت مندی سے بہت خوش ہوا۔ اس نے پوچھا۔

"کس کمپنی کی فلمیں تم زیادہ پسند کرتے ہو؟"

اعجاز نے بڑے بھولے پن سے جواب دیا۔

اسی کمپنی کی جس کی یہ فلم ہے۔

یہ جواب لئیق کو بالکل پسند نہیں آیا۔ کہنے لگا۔

بڑے بدذوق ہو کیا" ایورگرین پکچرز کی فلمیں تمہیں پسند نہیں آتیں؟"

اعجاز نے اس سادگی اور معصومیت کے ساتھ جواب دیا۔

دیکھے بغیر کیسے رائے قائم کرسکتا ہوں؟"

لئیق کو بڑی حیرت ہوئی۔ اس نے پوچھا۔

تم نے آج تک ایورگرین کی کوئی پکچر نہیں دیکھی

اعجاز نے جواب میں کہا۔
میں نے زندگی میں آج پہلی فلم دیکھی ہے۔ لہٰذا جو کچھ پوچھنا ہے۔
اس کے بارے میں پوچھو!"

"لیئق اچھل پڑا" واقعی — تم نے اس سے پہلے کوئی فلم نہیں دیکھی؟"

" اعجاز نے جواب دیا"، قسم لے لو — جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے مجھے؟"

لیئق کا یقین کرنے کو جی نہ چاہا۔ لیکن الفاظ کی بے ساختگی نے اسے یقین کرنے پر مجبور کر لیا۔

اتنے میں انٹرول ختم ہوا اور فلم پھر شروع ہو گئی۔

(۱۱)

کوئی نو بجے کے قریب یہ لوگ گھر واپس پہنچے، خلیق صاحب کوارٹر کے صحن میں خاموشی کے ساتھ ٹہل رہے تھے۔ لئیق کو دیکھتے ہی پوچھا۔

"کہاں تھے اب تک؟ — بے چارے اعجاز کو بھی تھکا مارا ہو گا؟"

لئیق نے جواب دیا۔ ابا جان، اعجاز نے آج تک فلم نہیں دیکھی تھی۔ شہر کی سیر کرانے کے بعد انہیں سینما لے گیا تھا۔

تم اسے بھی خراب کرو گے — کس سے پوچھ کر گئے تھے۔

امی سے پوچھ لیا تھا میں نے جاتے وقت!"

"جھوٹ — وہ خود پریشان ہو رہی تھیں۔ اور بار بار مجھ سے دریافت کر رہی تھیں۔"

(ہنستے ہوئے) تو وہ بھی گئی ہوں گی۔ یہ تو ان کی عادت ہے۔

تھوڑی دیر تک اس طرح کی باتیں ہوتی رہیں۔ پھر خلیق صاحب نے حکم دیا۔

"جاؤ کھانا لاؤ؟"

اور اعجاز سے کہا آؤ بیٹے!

وہ اعجاز کو لے کر اسی کمرہ میں پہنچے جو اس کے لئے انہوں نے مخصوص کر دیا تھا۔ اعجاز یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس عرصہ میں کمرہ کی کایا پلٹ گئی تھی۔ ضرورت کی تمام چیزیں وہاں رکھ دی گئی تھیں۔ تولیہ، صابن جگ، گلاس، لوٹا، گھڑا، بستر پہلے ہی سے آراستہ کیا جا چکا تھا۔ ایک میز بھی موجود تھیں اور اس کے ساتھ دو کرسیاں بھی۔

خلیق نے کہا "اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو فوراً طلب کر لینا۔ دیکھ لو سب ٹھیک ہے۔؟"

اعجاز نے ممنون نظروں سے انہیں دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ آسائش تو مجھے گھر میں بھی نہیں ملتی تھی۔"

پھر خلیق نے الماری کھولی اور ایف، اے کا کورس لا کر سامنے رکھ دیا۔ سب نئی کتابیں تھیں۔ اور ان کی مالیت دو ڈھائی سو سے کسی طرح کم نہیں تھی۔

اعجاز کے دل میں رہ رہ کر یہی خیال آ رہا تھا کہ نصاب کی کتابوں کا کیا ہوگا؟ خود اس کے پاس خریدنے کے لئے روپے تھے۔ نہیں خلیق سے وہ کہنا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن خدا نے یہ مشکل خود ہی حل کر دی۔ خلیق نے اس ضرورت کو محسوس کیا اور خود ہی لے آیا۔ جاکر، اس نے اور زیادہ متشکر نگاہوں سے اسے دیکھا اور کہا۔

"یہ اتنا بڑا احسان ہے جس سے میں زندگی بھر سبکدوش نہیں ہو سکوں گا۔"

خلیق نے حسب عادت ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ اتنے میں لبیق کھانا لے کر آ گیا۔ تینوں نے بیٹھ کر ایک ساتھ کھایا۔ پھر تھوڑی دیر بات چیت کر کے خلیق چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد اعجاز نے پوچھا۔

گھر میں پٹائی تو نہیں ہوئی دیر سے آنے پر"؟

وہ ہنسنے لگا اور گویا ہوا۔

" تم بیچ میں نہ ہوتے تو ضرور ہوتی ۔ بات یہ ہے کہ ابھی مغرب کے بعد

گھر سے باہر رہنے کی قطعاً اجازت نہیں دیتیں۔ سینما کی بھی اگر اجازت دیتی ہیں تو دن ہی میں رات میں نہیں اور اس اصول میں اتنی سخت ہیں کہ میں ابا جان تک کو تعمیل کرنی پڑتی ہے اس کی!"

اعجاز نے حیرت بھری نظروں سے اسے دیکھا اور پوچھا۔
یعنی وہ بھی مغرب کے بعد غیر حاضر نہیں رہ سکتے گھر سے؟

لیئق نے کہا "قطعاً نہیں۔ ڈیوٹی کی بات اور ہے ورنہ انہیں بھی حاضر رہنا پڑتا ہے۔

بھئی بات یہ ہے کہ امی سے سب ہی ڈرتے ہیں۔

"ابا جان بھی"؟

ہاں وہ بھی۔

"کیا وہ گھر کے فرد نہیں ہیں"؟

تھوڑی دیر گپ شپ کرکے لیئق بھی چلا گیا۔

لیئق کے جانے کے بعد بڑی دیر تک اعجاز ان کتابوں کو الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا جو خلیق اس کے لئے لایا تھا۔

پھر انہیں ایک طرف احتیاط سے رکھ کر کوئی ساڑھے گیارہ بجے کے قریب سونے کے لئے بستر پر لیٹ گیا۔

لیکن نیند کا کہیں کوسوں پتہ نہیں تھا۔

اس کے کانوں میں اپنے اور لیئق کے الفاظ گونج رہے تھے۔

"امی سے سب ہی ڈرتے ہیں۔"

"ابا جان بھی؟"

ہاں وہ بھی۔

"کیا وہ گھر کے فرد نہیں ہیں"؟

اور پھر نہ جانے کیوں اسے مریم یاد آ گئی۔ جو شوہر سے اس طرح ڈرتی تھی جیسے شیر سے بکری۔ امتیاز یاد آ گیا جو بیوی پر اس طرح حاوی تھا جیسے ملک الموت ۔ بس آج کی شب بھی سو چکے ہم۔

بپتا

جو گزرتے ہیں داغ پر صدمے
آپ بندہ نواز کیا جانیں

(۱)

اعجاز کی گمشدگی بھر میں کسی نے پرواہ نہیں کی، احراز کو خوشی ہوئی کہ ایسا نالائق اور گستاخ لڑکا جو باپ تک سے نالاں اور بیزار تھا اور جو چوری کر کے ننگ خاندان ثابت ہو چکا تھا۔ اچھا ہوا جو رخصت ہو گیا احراز اس سے کامل طور پر مایوس تھا۔ اسے یقین تھا یہ اب نہیں سدھر سکتا، چچی اماں بھی بہت مسرور تھیں کہ پاپ کٹا اور صفدر کے لئے راستہ ہموار ہو گیا۔

اگر وہ یہاں رہتا تو ممکن نہ تھا۔ کہ نسیم کی شادی اس سے کر دی پڑتی اور خود نسیم کا جہاں تک تعلق تھا۔ بے شک اس کا تھوڑا بہت ربط اور لگاؤ اس سے پیدا ہو گیا تھا۔ لیکن وہ اب ختم ہو چکا تھا۔ ایسے ہی وہ روپے پیسے اور مال و دولت کے معاملہ میں ماں پر پڑی تھی۔ یعنی ایک پیسہ کی چیز کو بھی ایک لاکھ روپے سے زیادہ سمجھنا اور زیور پر تو جان دیتی تھی۔ اور گھڑی تو اُسے بہت ہی زیادہ محبوب تھی۔ بھلا اپنی گھڑی کے چور کو وہ ڈاکو کیوں نہ سمجھتی۔ امتیاز کا نقطۂ نظر اصل حقیقت معلوم ہونے کے بعد بالکل بدل چکا تھا۔ لیکن اسے وہ اپنی ہیٹی سمجھتا تھا کہ بھائی کے سامنے بیٹے کی صفائی دے وہ اسے اپنی توہین خیال کرتا تھا کہ جس بیٹے کو غلط یا صحیح نالائق اور ناخلف سمجھ کر اس نے گھر سے نکال دیا تھا۔ اسے اس وقت تک گھر میں داخل ہونے دے۔ جب تک وہ خود آ کر قدموں پر سر نہ رکھ دے اور

اس کے بعد بھی جب تک گھر کے دوسرے ممتاز لوگ مثلاً اعجاز وغیرہ سفارش نہ کریں لہٰذا اسے بے گناہ سمجھتے ہوئے بھی اور اس کے فراق و جدائی سے کڑھتے ہوئے بھی، نہ وہ اس کا نام زبان پر لا سکتا تھا، نہ اس کے ذکر کو برداشت کر سکتا تھا۔ صرف زلیخا اس پابندی سے مستثنیٰ تھی، وہ البتہ اس کے سامنے جب چاہے اعجاز کا ذکر کر سکتی تھی، اور وہ خاموشی سے سنتا رہتا تھا۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ ایک آہ سرد بھر کر کوئی اور ذکر چھیڑ دیتا۔

جب سے اعجاز گیا تھا، امتیاز کا گھر سے تعلق اور زیادہ کمزور پڑ گیا تھا وہ دورے پر نکل جاتا، تو کئی کئی دن نہ آتا، رات کو احباب کی محفل میں جا بیٹھتا تو گھر اس وقت پہنچتا، جب سب لوگ سو جاتے زلیخا کے ساتھ اس کا طرز عمل اب بہت اچھا ہو گیا تھا، لیکن اس سے بھی دنوں اور ہفتوں ملنے کی فرصت نہ ہوتی، مردانہ حصہ پہلے بھی اس کا مستقل نشیمن تھا اور اب تو گویا گھر میں قدم نہ رکھنے کی اس نے قسم کھالی تھی، زلیخا سے کوئی بات کہنی ہوتی تو وہیں مردانہ میں پردہ ہو جاتا اور وہ جا کر بات کر آتی، لیکن یہ ملاقات اور گفتگو ہمیشہ نامکمل رہتی، اس لئے کہ کسی نہ کسی ملاقاتی کے آنے کی اطلاع ملتی اور جو بات کہنا یا کرنا ہوتی وہ کسی دن کے لئے ملتوی رہتی۔

اس صورت حال سے کلثوم اور نسیم نے بہت زیادہ فائدہ اٹھایا اور زلیخا کو دق کرنا اور ستانا شروع کر دیا۔ وہ طبعاً لگائی بجھائی سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتی تھی جو ستم اس پر ٹوٹتے رہتے، برداشت کرتی رہتی، باپ سے ایک لفظ نہ کہتی اور کہتے ہوئے ڈرتی بھی تھی، کیونکہ جانتی تھی وہ بھائی اور بھاوج کے اثر میں ہیں۔

ایک روز وہ اپنے کمرے میں چپ چاپ اداس اور مضمحل بیٹھی تھی

اور اعجاز کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ نہ جانے زندہ بھی ہے یا مر گیا کہ دبے پاؤں نادرہ آئی، اسے دیکھ کر زلیخا چونک پڑی اور ذرا بگڑے ہوئے لہجہ میں کہا۔

بس تمہاری یہ باتیں زہر لگتی ہیں، تجھے کئی مرتبہ کہا ہے، چوروں کی طرح دبے پاؤں نہ آیا کرو میرے پاس۔"

نادرہ نے اس گرم گفتاری کا کوئی اثر نہیں لیا۔ سرگوشی کے لہجہ میں کہنے لگی۔

"تقریر بند کرو تو کچھ کہوں"؟

زلیخا نے غور سے دیکھا تو محسوس کیا کہ کوئی خاص بات ہے، اس نے پوچھا۔

تو اتنی تمہید کی کیا ضرورت ہے، جو کچھ کہنا ہے کہہ ڈالو، کسی نے تمہاری زبان پکڑ رکھی ہے۔"

نادرہ نے ادھر اُدھر دیکھ کر آہستہ سے کہا۔

"آج تلاشی ہوگی ― ہوشیار رہنا۔"

زلیخا نے سراپا تحیّر بن کر اسے گھورا اور سوال کیا۔

"یہ کیا کہہ رہی ہو تم"؟

وہ بولی، "ہاں بیٹا، جھوٹ نہیں کہتی، خدا تمہاری ماں کو جنت نصیب کرے، مجھے ان سے محبت تھی۔"

" زلیخا نے اُلجھتے ہوئے کہا، وہ تو ٹھیک ہے تمہیں ― اماں سے محبت تھی لیکن بات کیا ہے؟"

اس نے گویا کچھ سنا ہی نہیں، اپنی کہتی چلی گئی۔

اعجاز کا کیا ہے؟ وہ ٹھہرا مرد ذات، چوری نہیں ڈاکہ ڈالے

پھر بھی دو کو کھلا کر کھلائے گا، لیکن تم؟

زلیخا نے آگے نہ کہنے دیا۔

"میں کیا"؟

وہ بولی "تم ٹھہریں عورت ذات ― اگر تمہارے دامن پر چوری کا دھبہ لگ گیا تو زندگی بھر نہیں چھوٹ سکے گا!"

زلیخا کا بدن سنسنانے لگا۔ کچھ حیرت، کچھ غصہ، کچھ غم، کچھ تجسس

اس نے پوچھا۔

"تو کیا میں چور ہوں"؟ نادرہ تم مجھے چور سمجھتی ہو؟" وہ بولی "نہیں جو چور سمجھے وہ کافر۔ لیکن ہر کوئی نادرہ کے دماغ سے تو نہیں سوچتا"۔

پریشان ہو کر زلیخا بولی۔

تو اور کون مجھے چور سمجھتا ہے؟" —

"تمہاری چچی، تمہارے چچا، تمہاری بہن نسیم سب"

غلبہ تاثر اور وفورِ جذبات سے زلیخا کی آواز لڑکھڑانے لگی۔

اس نے سوال کیا۔

یہ سب لوگ مجھے چور سمجھتے ہیں نادرہ؟"

ہاں — سب —"

لیکن کیوں؟ کیا ہوا؟ کوئی چیز چوری گئی ہے؟"

"ہاں — سونے کے بندے نسیم کے"

تو ان لوگوں کا خیال ہے، میں نے چرائے"؟

اور اتنی دیر سے کہہ کیا رہی ہوں۔ سمجھ ہی میں نہیں آچکتا کس طرح اور کیوں کر کہوں؟"

یہ لوگ تلاشی لیں گے میرے کمرے کی؟ میری؟"

"ہاں —"

آنے دو — دیکھتی ہوں، کون تلاشی لیتا ہے"!

"اس طرح تو تم الزام اوڑھ لو گی اپنے اوپر"!

"وہ کیسے —؟"

پھر بات میاں (امتیاز) تک پہنچے گی۔ پھر ان کے سامنے تلاشی لی جائے گی۔ اور بندے ضرور برآمد ہو جائیں گے یہاں سے دیکھ لینا"

"کس طرح برآمد ہو جائیں گے؟ کیا ان کے پاؤں ہیں کہ چل کر یہاں آجائیں گے؟"

"ایسا ہی سمجھ لو، وہ تو بہر حال آچکے"

تو کہاں ہیں؟

"تمہارے کپڑوں کے بکس میں۔ کسی قمیض کی جیب میں کسی جوڑے کی تہ میں، کسی کپڑے کے نیچے"!

"اتنی جگہوں پر"؟

"نہیں ۔ ان میں سے کسی ایک جگہ"!

لیکن یہ سب کچھ تمہیں کیسے معلوم ہوا"؟

"میں نے اپنے کانوں سے سازش کی یہ پوری اسکیم سُنی ہے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے۔ ان بندوں کو اس (اشارہ کرتے ہوئے) کالے بکس میں رکھتے ہوئے دیکھا ہے"؟

زلیخا کے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ اس نے سوچا، یہ تو غضب ہو گیا۔ اگر واقعی بندے میرے کمرے سے اور میرے بکس کے اندر سے نکل آئے تو قیامت آجائے گی، بات ابا جی تک پہنچے گی بھیا کے بارے میں تو انہوں نے مان لیا کہ مذاق تھا۔ لیکن جب چوری

ہو اور مال مسروقہ ہم بھائی بہن کے پاس سے برآمد ہو۔ تو ان کی رائے بھی بدل جائے گی۔ وہ بھیا سے بھی اور زیادہ نالاں ہو جائیں گے۔ اور میری صورت دیکھنا بھی زندگی بھر گوارا نہیں کریں گے۔ ممکن ہے مجھے بھی بھیا کی طرح نکال دیں گھر سے۔ پھر میں کہاں جاؤں گی۔ وہ تو ٹھرے مرد آدمی، جدھر منہ اٹھایا، جہاں سینگ سمایا چل دیئے۔ میں کہاں جا سکتی ہوں؟ مجھے کہاں پناہ ملے گی۔؟ میں اکیلی سعادت گنج تک بھی نہیں جا سکتی اور گرتی پڑتی چلی بھی جاؤں تو بے چاری خالہ خود اپنی مصیبت میں گرفتار ہیں۔ مجھے کہاں سے کھلائیں گی؟ میرا بوجھ کس طرح اٹھا سکیں گی۔ ہائے ابا جی کا غصہ، پھر وہ ہوش میں کہاں رہتے ہیں جو کچھ بھی نہ کر گزریں۔ وہی کم ہے کتنی اللہ آمین کے بعد تو ذرا ٹھیک ہوئے ہیں۔ ٹھیک سے باتیں کرنے لگے ہیں۔ اب اگر ایسا ہوا تو مرتے جائیں گے مگر خوش نہیں ہونے کے، یا اللہ یہ نئی مصیبت کیسی آکھڑی ہوئی میرے

سر پر ؟
میں کیا کروں ؟
کیا کروں یا اللہ ؟

(۲)

دفعتہً زلیخا اپنی جگہ سے اٹھی، اس نے سیاہ رنگ کا بکس کھولا جس میں اس کے کپڑے رکھے رہتے تھے، ایک ایک چیز اٹھا کر دیکھنا شروع کی۔ اور واقعی فیروزی رنگ کی شلوار کی تہہ میں دونوں بندے جگمگا رہے تھے!

اس نے جلدی سے ان بندوں کو اٹھایا۔ بکس بند کیا اور نادرہ کے پاس آکر کھڑی ہو گئی۔ بندے اس کے ہاتھ میں تھے۔

نادرہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

دیکھا؟ میں نہ کہتی تھی۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے اس دروازے کی دراز سے جھانک کر نسیم کو رکھتے ہوئے دیکھا تھا۔

زلیخا نے کہا۔" لیکن وہ میرے کمرے میں بہت دنوں سے نہیں آئی۔ جس دن سے بھیا گئے ہیں۔ اس نے قدم تک نہیں رکھا یہاں۔

نہیں رکھا تو یہ آ کہاں سے گئے"؟

یہی تو سوچ سوچ کر میں خود حیران ہو رہی ہوں۔"

کل تم شہر گئی تھیں"؟"

"ہاں۔ پھر"؟

اسی وقت یہ کارروائی ہوئی تھی"؟

(روتے ہوئے) یا اللہ میری مصیبتوں کے دن ختم ہوں گے بھی یا نہیں؟ — اب میں کیا کروں۔ اگر وہ لوگ آگئے تو کیا جواب دوں گی میں؟

" ابھی نہیں آئیں گی۔"؟

وہ اس وقت آئیں گے جب کھانے کے وقت میاں (امتیاز) آ چکے ہوں گے۔ یا آنے والے ہوں گے تاکہ مجرم ان کے سامنے پیش کیا جا سکے اور اسے حسب دلخواہ سزا دلوائی جائے اور ان کے آنے میں ابھی ایک گھنٹہ کی دیر ہے"؟

" اچھا تو ان بندوں کا کیا کروں۔ پھینک آؤں جاکر باہر"؟

" کہیں اب ایسا غضب بھی نہ کرنا"! ہر آنکھ تمہاری نگرانی کر رہی ہے۔"

" پھر؟ — پھر آخر کیا کروں"؟

" مجھے دے دو"!

تمہیں دے دوں؟ تم کیا کرو گی

میں وہ کروں گی کہ مزا آجائے گا!" جانتی ہو۔ کیا کروں گی"؟

" میں کیا جانوں؟ سوچا ہوگا تم نے"؟

" ہاں میں نے سوچ لیا ہے۔ جس وقت نسیم اپنی امی جان کے ساتھ یہاں تلاشی لینے آئے گی اور جب تلاشی لے چکے گی۔ تو میں آگر یہ پیش کر دوں گی۔ کہوں گی۔ یہ تو آپ کے تکیہ کے نیچے رکھے ہوئے تھے۔ ابھی جب میں بستر صاف کرنے لگی۔ تو وہاں تم جانتی نہیں۔ لہٰذا یہ گمان کیا جا سکتا کہ یہ حرکت تمہاری ہے۔ گھڑوں پانی نہ پڑ جائے۔ ماں بیٹی پر تو امیرا ذمہ"!

کچھ سوچتے ہوئے زلیخا نے بندے نادرہ کو دے دیئے اور اس طرح کھڑے کھڑے رونے لگی۔

نادرہ نے پیار اور محبت کی نظر سے اسے دیکھا اور پوچھا۔

ارے ؟ یہ رونے کا کیا موقع ہے" ؟

وہ بولی " خدا مجھے موت بھی نہیں دیتا کہ اس آئے دن کی ذلت اور روسیاہی سے نجات ملے" ؟

یہ نہ کہو، ان باتوں سے اللہ میاں خفا ہو جاتے ہیں ۔

زلیخا نے اس طرح جیسے وہ اللہ میاں سے مخاطب ہے۔

پوچھا:- تو آخر کب تک یہ روسیاہی برداشت کرتی رہوں" ؟

وہ بولی، ان آزمائشوں کی بھٹی سے سونے کی طرح تپ کر نکلو گی۔ ہراساں کیوں ہوتی ہو ؟ خدا پر بھروسہ رکھو۔ جو اس پر بھروسہ رکھتا ہے اسے وہ کبھی مایوس اور نا امید نہیں کرتا "

" لیکن ان باتوں کا مقصد کیا ہے آخر" ؟

وہ تو بڑا دلچسپ ہے تم نہیں جانتی " ؟

بالکل نہیں جانتی ! مجھے کیا معلوم" ؟

" تمہارے باپ اور چچا دونوں کی مرضی یہ تھی کہ اعجاز کی شادی نسیم سے کی جائے، لیکن بی بی (کلثوم) اپنے بھتیجے صفدر سے بیاہنا چاہتی ہیں اسے"

بیاہ دیں، یہاں کون مرا جا رہا ہے نسیم کے لئے !

" سنو تو ! — اصل بات تو آگے آتی ہے" ؟

" سن رہی ہوں کہے جاؤ"

صفدر کا بھائی ایک منور بھی ہے ۔

وہی کانا، جس کا سارا بدن سفید ہے" ؟

" ہاں وہی، جانتی تو ہو اسے !

" اچھا پھر ؟ تو منور" ؟

اسکیم یہ ہے کہ جب تمہاری چوری پکڑ لی جائے اور میاں (امتیاز) تمہارا خون چوسنے پر تیار ہو جائیں تو ان سے سفارش کر کے تمہاری جان بخشی کرالی جائے۔ اور منور کا پیغام تمہارے لئے دیا جائے کہ ایسی لڑکی

کا کہیں غیر جگہ جانا ٹھیک نہیں۔ خاندان کے نام کو بٹہ لگائے گی، منوّر بہر حال گھر کا آدمی ہے۔ گزارہ کرے گا۔ اور منوّر میاں وہ ہیں جنہیں بیوی جڑتی نہیں۔ کس کی لڑکی ایسی بھاری ہے۔ کہ وہ اٹھا کر ان کے حوالے کر دے گا۔

اور اس میں صرف یہی عیب تو نہیں کہ وہ کانا ہے اور اس کا بدن سفید ہے اور بھی ہزاروں عیب ہیں، جواری، شرابی، نہ جانے کیا کیا، میاں اعجاز سے نفرت کرتے ہی ہیں۔ تم سے بھی کرنے لگیں گے اور بڑی آسانی سے اس کے لئے تیار ہو جائیں گے۔ کہ تمہیں منوّر سے بیاہ دیں — پھر یہ کوشش کی جائے گی۔ کہ وہ منور کو خانہ داماد بنا لیں۔ یہ ہے ساری اسکیم، اس لئے چور بنائی جا رہی ہو تم"

زلیخا پھر رونے لگی۔ اس نے کہا۔

"اور پھر تم کہتی ہو کہ میں اپنے تئیں نہ کوسوں؟ نادرہ خدا کی قسم میں زہر کھالوں گی۔ چھت سے کود پڑوں گی، جان دے دوں گی۔ مگر ان کی یہ اسکیم، ہرگز کامیاب نہیں ہونے دوں گی!"

تم کیا کر سکتی ہو؟ بندہ کیا چیز ہے۔ یوں کہو خدا دشمنوں کے منہ میں کالک لگائے گا۔

زلیخا نے دونوں ہاتھ دعا کے لئے اٹھاتے ہوئے کہا۔

"آمین —"

نادرہ ہنسنے لگی اور گویا ہوئی۔

بہت بدحواس ہو گیئں۔ اس اسکیم کا ماجرا سن کر

زلیخا کی آنکھوں میں پھر آنسو بھر آئے، لیکن زبان سے اس نے کچھ نہ کہا، نادرہ نے پھر اپنے دوپٹہ سے اس کے آنسو پونچھے اور کہنے لگی۔

"خدا پر بھروسہ رکھو، ناامید نہ ہو!"

پھر وہ بولی" اچھا میں جاتی ہوں — تم امتحان کے لئے تیار ہو جاؤ اور دیکھو میری ایک بات گرہ میں باندھ لو، ہرگز کوئی ایسی بات نہ کرنا جس

سے انہیں یہ شبہ ہو کہ اس سازش کا تمہیں علم ہے نہ غصہ اور خفگی کا اظہار کرنا، بلکہ دل ہی دل ہنستی رہنا، لطف لیتی رہنا! — کروگی ایسا؟"

زلیخا نے گردن کے اشارے سے اقرار کیا، نادرہ جس طرح دبے پاؤں آئی تھی، اسی طرح واپس چلی گئی۔

(۳)

اور واقعی دوپہر کو امتحان کی وہ گھڑی آگئی جس کی بشارت نادرہ دے گئی تھی۔

سب سے پہلے کلثوم بیگم وارد ہوئیں۔ یہ خلاف معمول بات تھی۔ بھلا وہ اس غم کدہ میں کہاں قدم رکھتی تھیں، لیکن زلیخا نے سروقد کھڑے ہو کر خیر مقدم کا فریضہ انجام دیا۔ کلثوم کے چہرے سے خشونت اور درشتی ہویدا تھی۔ زلیخا نے کہا۔

آیئے چچی اماں تشریف رکھیئے۔

وہ اس ننھے بستر پر رونق افروز ہوتی ہوئی بولیں۔

بیٹھوں کیا بیٹی، یہاں تو زندگی اجیرن ہوگئی ہے۔

ارے بھوندو!

بھوندو فوراً آموجود ہوا، کلثوم نے کہا۔

جا باہر دیکھو۔ بڑے صاحب اور چھوٹے صاحب آئے ہیں یا نہیں کھانے کا وقت ہوگیا اور اب تک۔

بھوندو جا چکا تھا۔

کلثوم نے زلیخا کو مخاطب کیا

ایسا معلوم ہوتا ہے چور نے گھر دیکھ لیا۔

زلیخا نے بڑی سادگی سے سوال کیا۔

" لیکن چچی اماں ہوا کیا — کوئی چیز چوری ہو گئی کیا "؟

وہ بولیں۔" ہاں — پہلے نگوڑ ماری۔ گھڑی کی باری آئی۔

" وہ اللہ اللہ کر کے ملی تو اب بندوں کی باری آئی۔ یہ تو گھڑی سے کئی گناہ زیادہ قیمتی ہیں "!

زلیخا اب واقعی لطف لینے لگی تھی، پوچھا۔

ارے — واقعی چوری ہو گئے۔

وہ کھا جانے والی نظروں سے اسے گھورتی ہوئی بولیں۔

" ہاں — کیا میں جھوٹ بول رہی ہوں! — خدا غارت کرے ان چوروں کو کوڑھ ٹپکے ان کے ہاتھوں پر، میری بچی کے بندے چرا کر ایک پل بھی چین نہ پائیں، لیکن میں بھی پولیس افسر کی بیوی ہوں، نہ ڈھونڈھ نکالوں تو میرا نام کلثوم نہیں۔ "

طنز و تعریض سے بھری ہوئی ان باتوں سے زلیخا ذرا بھی متاثر نہیں ہوئی، البتہ بڑے ہمدردانہ لہجہ میں وہ گویا ہوئی۔

لیکن چچی اماں یہ بندے گئے کس طرح "؟

انہوں نے فوراً تیر پھینکا۔ فرمایا۔

" جس طرح گھڑی گئی تھی۔ "

زلیخا کا رنگ فق ہو گیا، سٹ پٹا گئی، کچھ جواب نہ دے سکی اتنے میں خزاں حرا اماں نسیم آئی۔ زلیخا نے اس سے بھی ہمدردانہ لہجہ میں کہا۔

" سنا ہے تمہارے بندے چوری ہو گئے ہیں "؟

بے پروائی سے اس نے جواب دیا۔

ہاں — لیکن مل جائیں گے۔ اماں نے بڑا زبردست عمل کیا ہے

اور ان کا عمل کبھی خالی نہیں جاتا۔ گھڑی والی دفعہ میں تو قائل ہو گئی۔

بار بار گھڑی کا ذکر سن کر زلیخا کو غصہ تو بہت آیا، آخر امتیاز کی بیٹی اور اعجاز کی بہن تھی، لیکن نادرہ کی نصیحت یاد آ گئی۔ لہٰذا ضبط سے کام

لیا اور خاموش رہی۔ اینٹ کا جواب پتھر سے نہیں۔
اتنے میں نسیم نے بچوں کی طرح مچلتے ہوئے کہا۔
اماں میں آج سینما دیکھنے ضرور جاؤں گی۔"
وہ بولیں، خدا تمہیں سلامت رکھے، ضرور جاؤ۔
"اور وہ میری شلوار؟"
"شلوار کیسی؟"
میں نے کہا تو تھا۔ کہ فیروزی رنگ کی ایک شلوار بنا دیجئے۔
مجھے یہ رنگ بہت پسند ہے؟"
ہاں بیٹی کہا تو تھا۔ لیکن مجھے یاد نہیں رہا!"
"بنوا دوں گی۔"
"تو پھر میں سینما کیسے جاؤں؟"
یہ کیوں؟ وہاں جانے کو کس نے منع کیا ہے؟
"لیکن میں تو وہی شلوار پہن کر جاؤں گی!"
اتنے میں بھوندو حاضر ہوا۔ کلثوم نے بیتابی اور بیقراری کے ساتھ اس کی طرف امید بھری نظروں سے دیکھا کہ کیا خبر لایا ہے؟ اس نے کہا۔
بڑے صاحب (امتیاز) تو آ گئے ہیں۔ چھوٹے صاحب ابھی نہیں۔
یہ سن کر کلثوم اور نسیم کے چہرے پر رونق آ گئی، زلیخا اٹھ کھڑی ہوئی۔
"کھانا نکال دوں تو دے آ کر جا کر"
نسیم نے اسے روک کا کہنے لگی۔
"کھانا دیر کے بعد نکال دینا۔ ہمارا کام کرتی جاؤ"۔
زلیخا جاتے جاتے ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے پوچھا۔

کون سا کام تمہارا؟ بتاؤ؟ ۔

"وہ بولی مجھے یاد پڑتا ہے۔ تمہارے پاس ایک فیروزی رنگ کی شلوار ہے؟"

زلیخا نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا ۔

" ہاں ہے تو۔"

وہ بولی " تو نکال دو اماں تو اسی طرح بولتی رہیں گی، نہ جانے کب بنائیں، تمہاری ہی پہن لوں گی ۔"

زلیخا نے جواب دیا، لے لو، لیکن تنگ تو نہ ہوگی، آ جائے گی ۔

کلثوم بیگم درشتی کے ساتھ گویا ہوئیں ۔

اسے ہے تم کون سی دبلی ہو اور وہ کونسی ایسی موٹی ہے، آ کیوں نہ جائے گی؟

" زلیخا بولی ۔" تو میں کب منع کرتی ہوں ۔"

یہ کہہ کر وہ بیاہ ... کی طرف بڑھی، نسیم بھی ساتھ ساتھ آئی، اس نے بیٹھ کر بکس کھولا، نسیم بھی اس کے پاس بیٹھ گئی وہ اپنے کپڑے ایک ایک کر کے نکالنے لگی، نسیم غور سے بیٹھی دیکھتی رہی، اتنے میں فیروزی رنگ کی شلوار کی باری آ گئی، نسیم نے بے ساختہ کہا ۔

ہاں یہ ۔

زلیخا نے شلوار نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دی، اور کہا لے لو ۔ پہن جاؤ ۔

نسیم نے شلوار کی تہہ بگاڑ کر ایک مرتبہ اسے جھٹکا، پھر مایوسی کے عالم میں ماں کی طرف دیکھا۔ ان کے چہرے کی رونق بھی حیرت اور بے کلی سے بدل گئی۔ جھپٹ کر اٹھیں، اور شلوار نسیم کے ہاتھ سے لے لی ۔

یہ ہے ۔ ہا!

" نسیم نے کہا " ہاں امی یہی ہے ۔ بالکل یہی ۔"

کلثوم نے بھی ایک مرتبہ خوب زور سے اسے جھٹکا کہ شاید گوہر مقصود اب گرے، اور اب گرے، مگر وہاں تھا کیا جو گرتا؟ دونوں نے ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

اتنے میں نادرہ دوڑتی ہوئی آئی، اس کی ہتھیلی پر دونوں بندے رکھے ہوئے تھے، وہ نسیم سے مخاطب ہوئی۔

بٹیا یہ رہے بندے —

کلثوم نے سراپا برق و آتش بن کر پوچھا۔

"ماں زادی کہاں سے ملے تجھے؟"

وہ بولی۔ بٹیا کے تکئے کے نیچے رکھے تھے۔

کلثوم نے وہ شلوار وہیں زمین پر پٹخ دی اور بندے لے کر تیزی سے نکلی ہوئی چلی گئیں — ان کے پیچھے پیچھے نسیم بھی۔

⭘

(۴)

طوفان گزر گیا۔

لیکن زلیخا کے دل میں ایک طوفان برپا ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں طوفان اشک اُمڈ آیا جب تک کلثوم بیگم چوری کا ذکر فرماتی رہیں اور جب تک نسیم شلوار کے سلسلے میں اس کا جائزہ لیتی رہی۔ وہ لطف لیتی رہی۔ جب لوگ چلے گئے، تو وہ سوچنے پر مجبور ہو گئی۔

آخر یہ کیا ہو رہا ہے؟

اس گھر میں میری حیثیت کیا ہے؟

کیا اباجی نے اس لئے شادی کی تھی کہ ایک لڑکے اور لڑکی کے باپ بن جائیں۔ بیوی کو کڑھا کڑھا کر اور جلا جلا کر مار ڈالیں، لڑکے کو گھر سے نکال دیں۔ اس کی بے گناہی کا یقین رکھتے ہوئے بھی۔ اسے واپس بلانے پر آمادہ نہ ہوں اور لڑکی کو بھیڑیوں کے آگے ڈال دیں۔ خود سارا وقت یار باشیوں اور مجلس آرائیوں میں صرف کر دیں یا باہر بیٹھے دوست احباب دوست گپ شپ کرتے رہیں دورے پر جاتے رہیں اور ان کی لڑکی گھر میں چوربنی بیٹھی رہے، آئے دن نت نئے الزامات اس پر عائد کئے جایا کریں۔ اسے ذلیل کیا جایا کرے اس کے مستقبل کو برباد کرنے کی اسکیمیں بنائی جایا کریں اور وہ کچھ نہ کر سکے، سوا اشک حسرت کے سوا دل ہی دل میں آہ کرنے کے۔

کیا زندگی اس طور سے بسر ہو سکتی ہے؟
آج جب یہ سب کچھ ہو رہا ہے تو کل کیا کچھ نہ ہوگا۔ کیا مرا وجود ایک کانٹا ہے جسے یہ لوگ راستے سے ہٹا دینا چاہتے ہیں، اور اس کے بعد اس کی ہر چیز پر قبضہ کر لینا چاہتے ہیں۔

"اور یہ منوّر؟"
یہ کیا بلا ہے؟ — کیوں اسے میرا مالک و مختار بنانے کی تدبیریں کی جا رہی ہیں۔ کیا میرا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے؟
میری حیثیت اس مشت خاک کی ہے، جسے ہوا کے جھکڑ ادھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر اُڑائے پھرتے ہیں؟ کیا میں وہ سنگریزہ ہوں جو صرف اس لئے ہے کہ پامال ہو؟ ٹھوکریں؟
میرا اپنا وجود کچھ نہیں؟ میری اپنی ہستی کچھ نہیں، میں خود کچھ نہیں؟
بھائی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے یہ گھر چھڑوا دینے کے بعد بھی ان لوگوں کو قرار نہیں آیا۔ اب میرے در پے آزار ہیں۔ چاہتے ہیں مجھے فنا کے گھاٹ اتار دیں۔

اور میرا باپ؟
وہ ایک غیر جانبدار تماشائی کی حیثیت سے یہ ناٹک دیکھ رہا ہے اگر خدا نے نادرہ کو میری دستگیری پر آمادہ نہ کر دیا ہوتا۔ تو آج میری قسمت کا فیصلہ تو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہو گیا تھا۔ پہلے میرے منہ میں سیاہی لگتی۔ پھر مجھے ذلیل کیا جاتا۔ اور اس کے بعد مجھے منوّر کے حوالے کر دیا جاتا!
آج اگر اماں زندہ ہوتیں تو یہ ہو سکتا تھا۔
بے شک ابا کی نظر میں ان کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ یہ بھی سچ ہے کہ ابا کے سامنے انہیں مجال دم زدن بھی نہ تھی۔ اور یہ بھی واقعہ ہے کہ ان کے ہر فیصلہ کو وہ بے چوں و چرا تسلیم کر لیتی تھیں۔
لیکن اگر ان کے سامنے بھیا کو گھر سے نکالا جاتا تو کیا وہ گوارا کر

لیتیں؟ کیا وہ بھی ان کے ساتھ ہی اس کمرے کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ کر رخصت نہ ہو چکی ہوتیں؟

کیا ان کی زندگی میں بھی مجھے اس طرح ذلیل کیا جا سکتا تھا؟ مجھ پر چوری کی تہمت لگائی جا سکتی، میری تلاشی لی جا سکتی تھی؟

اور،

اور مجھے منور کی باندی بنا دینے کا، ایک بدصورت جواری اور شرابی کی باندی بنا دینے کا فیصلہ کیا جا سکتا تھا۔ کیا وہ ان لوگوں کا خون نہ چوس لیتیں؟

لیکن اب کیا ہوگا؟

اگر ان لوگوں کا واقعی یہی پروگرام ہے تو کسی نہ کسی طور پر، کسی نہ کسی بہانے سے یہ اباجی کو راضی کر ہی لیں گے۔ خود اباجی کئی مرتبہ کہہ چکے ہیں کہ اب زلیخا سیانی ہو چکی ہے۔ اس کا کوئی بندوبست کرنا چاہیئے۔

اگر ان لوگوں نے اباجی کو راضی کر لیا تو کیا ہوگا؟

کاش اس وقت بھیا ہوتے، وہ کسی قیمت پر بھی ان گھناؤنی چالوں کو کامیاب نہ ہونے دیتے۔

لیکن نہ جانے وہ کہاں گئے۔؟ لاکھ لاکھ چیخوں، چلاؤں، فریاد کروں، مگر ان تک میری آواز نہیں پہنچ سکتی، میں روتے روتے جل تھل کر دوں، مگر ان کی آنکھیں میری چشم نمناک کو نہیں دیکھ سکتیں، اس دھڑکے میں میری جان چلی جائے۔ مگر انہیں خبر بھی نہ ہوگی، کہ زلیخا

پر کیا بنی اس کا کیا حشر ہوا۔

اگر میں لڑکا ہوتی تو ان باتوں کی ذرا پرواہ نہ کرتی۔ میں بھی بھیا کی طرح بیک بینی دو گوش کسی دن چپ چپاتے یہاں سے سدھار جاتی اور کسی کو خبر بھی نہ دیتی، لیکن میں تو لڑکی ہوں، عورت ذات ہوں میں کس طرح گھر سے باہر قدم نکال سکتی ہوں؟

کس طرح دردر کی ٹھوکریں کھا سکتی ہوں۔

پھر کیا ہوگا؟
یا اللہ تو ہی میری دستگیری کر۔
کیا اباجی کو یہ سارا واقعہ بتا دوں جاکر۔
کیا وہ سن لیں گے؟ مان لیں گے؟
اور پھر بے چاری نادرہ کا کیا حشر ہوگا؟ اس نے تو اپنی عزت آبرو اور نوکری کو خطرے میں ڈال کر اتنا بڑا کام کیا ہے، کیا اس بے گناہ کو بھی پھنسوا دوں؟
اس حیص و بیص میں وہ بیٹھی تھی، کہ مسکراتی ہوئی نادرہ آگئی اور کہنے لگی؟
اب مسکوٹ ہو رہی ہے۔ ماں بیٹی میں؟"
زلیخا نے آنسو بھری ہوئی آنکھوں سے نادرہ کو دیکھا اور ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔
نادرہ تم کب تک مجھے بچاؤ گی، آخر ایک ہی گھر ہے اور اقتدار و اختیار انہی کے ہاتھ میں ہے۔ آج تم نے اتفاق سے سب کچھ سن لیا۔ دیکھ کر ان کی تدبیر ناکام بنا دی، لیکن کل وہ کچھ اور سوچ لیں گے اور اس پر عمل بھی کر گزریں گے۔ وہی بات ہے کہ بکری کی ماں کب تک خیر منائے گی۔
نادرہ توجہ سے زلیخا کی باتیں سنتی رہی، پھر گویا ہوئی۔
تم تو خواہ مخواہ پریشانی میں مبتلا ہو —
زلیخا نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔
"خواہ مخواہ کی پریشانی ہے"
وہ بولی" ہاں اور کیا — اتنا بڑا داؤں ان کا ناکام ہوا ہے کہ چکرا گئے ہیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ کیا ہو گیا۔ ماں لڑکی کو دوش دے رہی ہے اور لڑکی ماں کو۔ دونوں میں بڑے زور کی لڑائی ہو رہی ہے۔ مجھے تو مزہ آگیا اللہ قسم اس وقت ان لوگوں کی باتیں سن کر۔

وہ بولی " تمہیں مزہ آگیا، اللہ قسم میری تو جان پر بن گئی "۔
وہ کہنے لگی " جان پر بنانے کی کوئی ضرورت نہیں ۔ اب انشااللہ عرصہ تک یہ لوگ اس طرح کی کوئی بات کرتے ہو ہچکچائیں گے اور میں نے بھی تو یہ سوچ ہی لیا ہے !

زلیخا نے پوچھا ۔ کیا سوچا ہے تو نے ؟
وہ بولی ، چاہے جوتے پڑیں یا چٹیا مونڈی جائے ، ملازمت رہے یا جائے میں نے فیصلہ کر لیا ہے ۔ موقعہ دیکھ کر میاں کو سب کچھ بتا دوں گی ۔ اور ان سے صاف صاف بات کر کے رہوں گی ۔

(۵)

نادرہ کی باتوں سے کسی حد تک زلیخا کے دل کا بوجھ اترا، وہ سوچنے لگی۔ اس کی وفاداری اور خدمت گزاری کے ابا جی بھی قائل ہیں۔ اس نے اگر اپنے طور پر سارا کچا چٹھا سنا دیا۔ تو وہ ضرور متاثر ہوں گے۔ کیونکہ اماں کے انتقال اور بھیا کے جانے کے بعد سے ان کی روش میں تو بہر حال تبدیلی آچکی ہے۔ بہت ممکن ہے وہ کوئی ایسا قدم اٹھائیں جو ہمیشہ کے لئے ان جھگڑوں کا خاتمہ کر دے۔ اور یہ سوچتے سوچتے اس کا ذہن نہ جانے کیوں ارشاد کی طرف منتقل ہو گیا۔ اور مسرت، انبساط اور سرور کی ایک کرن سی اس کے تاریک خانۂ قلب میں پھوٹنے لگی۔

ارشاد —

یہ اس کی بیوہ خالہ کا جو سعادت گنج میں رہتی تھیں۔ لڑکا تھا۔

ارشاد کے تصور نے ذرا دیر کے لئے اسے دوسری دنیا میں پہنچا دیا۔ یہ بڑا تیز، بڑا ہونہار، بڑا سعادت مند اور خوش اطوار لڑکا تھا مریم اسے بہت ہی زیادہ چاہتی تھی۔ اور زلیخا کو یاد آیا۔ کہ ایک مرتبہ جب اس کی کسی بات پر خوش ہو کر شاباش دے رہی تھی اور پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیر رہی تھی تو رابعہ نے کہا تھا۔

آپا اگر ارشاد کو سچ مچ اتنا چاہتی ہو۔ تو اسے باقاعدہ اپنا بیٹا کیوں نہیں بنا لیتیں؟ ارشاد تمہارا زلیخا ہماری، بولو یہ سودا منظور ہے۔

اور مریم بہن کے ہونٹ تبسّم سے ناآشنا ہی رہے تھے بے ساختہ مسکرا پڑی تھی اور محبت بھری نظروں سے ارشاد کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔

"ہاں منظور ہے"

اور پھر ارشاد سے کہنے لگی۔

"کیوں رہے! میرا لڑکا بن کر میرے پاس رہے گا؟"

اور ارشاد نے جواب دیا تھا۔

میرا تو آپ ہی کے پاس جی لگتا ہے۔ اماں کے پاس ذرا بھی نہیں لگتا ہے۔

اور پھر دونوں بہنیں کھلکھلا کر ہنس پڑی تھیں اور رابعہ نے کہا تھا

کیوں رے بے مروت؟ ہمیں چھوڑ دے گا۔

ارشاد نے جواب دیا "مجھے جو کچھ کہنا تھا۔ کہہ دیا۔ ویسے بزرگوں سے بحث کرنا میری عادت نہیں ہے"

دونوں بہنیں کھلکھلا پڑیں۔ مریم نے کہا۔

"دیکھا رابعہ میرے بچہ کو؟"

وہ بہ ظاہر چڑتی ہوئی بولی۔

مجھے کیا پڑی ہے تمہارے لڑکے کو دیکھنے کی۔ میں تو اپنی بچی زلیخا کو دیکھ رہی ہوں۔ کیسی ماشاءاللہ چاند سی شکل پائی ہے!"

مریم نے کہا۔ اب لگا دو نظر اسے — وہ تو خاصی بدصورت ہے اور زلیخا چڑ گئی تھی، کہنے لگی۔

"وہ کیوں ہوتی بدصورت"

اور پھر دوسرے دن موقعہ پاکر ارشاد نے زلیخا سے کہا تھا۔

کیوں جی اگر ہم خالہ جان کے پاس رہ جائیں تو برا تو لگے گا تمہیں

اور زلیخا نے جواب دیا تھا۔

مجھے کیوں برا لگنے لگا؟ میں خود خالہ کے ساتھ سعادت گنج جا رہی ہوں۔

اور ارشاد مچل گیا تھا۔ اس نے کہا تھا۔
" واہ تم کیسے جا سکتی ہو ؟"
" اور زلیخا نے پوچھا تھا" کیوں نہیں جا سکتی ؟"
اور پھر بے ساختہ اس کے منہ سے نکل گیا تھا۔
" پھر میں یہاں رہ کر کیا کروں گا ؟ — میرا یہاں اتنا جی جو لگتا ہے وہ تمہاری ہی وجہ سے تو ہے ؟"
" اور پھر وہ پوچھ بیٹھی تھی" کیوں میری وجہ سے کیوں ؟"
اور اس نے جواب دیا تھا" اماں سچ ہی تو کہہ رہی تھیں۔ ان کی بھانجی نے بالکل چاند کی سی شکل پائی ہے اور وہ باتیں بھی کیسی من موہنی کرتی ہے اس کی ہر بات اچھی لگتی ہے، بس یہی جی چاہتا ہے۔ اس کے پاس بیٹھے رہو اسے ہنستا دیکھتے رہو اُسے کام کرتا دیکھتے رہو۔
جب سو جاؤ تو خواب میں بھی اس کو دیکھتے رہو۔
اور اس خواب والی بات پر بے ساختہ وہ ہنس پڑی تھی، اور شرما کر بھاگ کھڑی ہوئی تھی۔ نہ جانے کیوں اس کے سامنے ٹھہرتے اور اس بات کرتے اور اب وہ جھجک سی محسوس کر رہی تھی !
اس کے واقعہ کے بعد کئی دن تک ارشاد اس گھر میں رہا۔ مگر وہ اس کے سامنے نہ پڑی۔ یعنی اس نے کوئی ایسا موقع نہ آنے دیا۔ کہ وہ بات چیت کر سکتا۔ لیکن ایک روز یہ موقع مل ہی گیا۔ وہ اعجاز کا کمرہ صاف کر رہی تھی اور اعجاز اسکول گیا ہوا تھا، اتنے میں کچھ آہٹ ہوئی۔ اس نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ دروازے پر ارشاد کھڑا تھا۔ وہ کام کرتے کرتے رک کر ویسے ہی کھڑے کھڑے اسے تکنے لگی۔ آج ارشاد کے چہرے پر شوخی اور شرارت اور زندہ دلی نہیں تھی وہ کچھ کھویا کھویا سا تھا، کچھ سنجیدہ سا، کچھ متفکر سا، اس نے کہا۔
" زلیخا ایک بات بتاؤ ؟" بس تمہارا جواب سنتے ہی چلا جاؤں گا !"
زلیخا کا دل دھڑکنے لگا، اس نے جواب دیا۔

وہ کونسی بات ہے جو آپ خاص طور پر یہاں پوچھنے آئے ہیں۔

" ہے زلیخا "

" اچھا تو پوچھئے!

کیا تم مجھ سے خفا ہو۔ کیا اس دن کی میری باتوں سے تم روٹھ گئیں۔ کیا میں نے تمہارے احساسات کو صدمہ پہنچایا ــــ

اگر یہ بات ہے تو کہہ دو۔ میں آج بلکہ ابھی سعادت گنج چلا جاؤں گا۔ میں کسی قیمت پر بھی تمہیں رنجیدہ اور اپنے سے خفا نہیں دیکھنا چاہتا ــــ

زلیخا نے نگاہ اوپر اٹھائی تو ارشاد پر کچھ عجیب سا عالم طاری تھا۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں، یہ حالت دیکھ کر خود اس کا دل بھی ڈوبنے لگا تھا اس نے چاہا کہ اس کے زخم پر پھاہا رکھ دے وہ۔ مسکرانے لگی، اس نے پوچھا ــ

" یہ بات آپ نے کیوں سوچی ؟"

" کیا غلط سوچی ؟"

" ہاں بالکل غلط "

" کیا تم خفا نہیں ہو "؟

بالکل نہیں ــــ اور ہو بھی کیسے سکتی ہوں اتنے اچھے تو آدمی ہیں۔

آپ، میرا خود ہر وقت دل چاہا کرتا ہے کہ آپ کی دلچسپ باتیں سنا کروں۔ اماں تک کو ہنسا دیتے ہیں آپ جو بیچاری ہنسنا اور مسکرانا بالکل بھول چکی ہیں۔ جب بھی آپ جائیں گے تو دل اداس: اداس سا رہے گا اور کئی دن تک طبیعت گھبرائے گی "

" کیا یہ سچ ہے زلیخا ؟"

" آخر آپ مجھے جھوٹا کیوں سمجھتے ہیں ؟"

ارشاد دو قدم آگے بڑھا، اس نے زلیخا کا ہاتھ مضبوطی سے اپنی گرفت میں لے لیا۔

❂

(۶)

لیکن زلیخا اپنا ہاتھ اس کی گرفت سے چھڑا نہ سکی، شاید اس نے چھڑانا بھی نہ چاہا؟"

اور پھر دفعتہً ارشاد نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ اور وہیں دروازے کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا۔

"زلیخا آج میں کتنا خوش ہوں۔ صرف میرا ہی دل جانتا ہے!"

وہ زیر لب تبسم کے ساتھ بولی۔

صرف آپ ہی؟ میں نہیں۔

ارشاد نے کچھ عجیب سی نظروں سے اسے دیکھا اور کہنے لگا۔

اب تم ہمارے گھر چل کر رہو گی، سعادت گنج میں — دیکھنا وہاں تمہاری کتنی خاطریں ہوتی ہیں۔ میں تمہاری دلجوئی کے لئے وقف رہوں گا۔ کسی بات کا جی چاہے، کوئی کام ہو، کوئی ضرورت ہو مجھے تم ہر وقت اور ہمیشہ مستعد پاؤ گی۔

وہ ہنستی ہوئی بولی۔

"پھر جھوٹ بولے آپ؟"

"وہ کہنے لگا، اس میں جھوٹ کیا ہے؟"

"یہ سفید جھوٹ ہے"

"وہ کس طرح — یہ بھی بتا دو؟"

"یہ ٹھیک ہے کہ میں سعادت گنج جاؤں گی اور یہ بھی درست ہے کہ وہاں میری خوب خاطرداری بھی ہوگی — لیکن آپ وہاں کہاں ہوں گے ؟"

"کیوں ؟ — میں کہاں چلا جاؤں گا ؟"

"آپ تو یہاں رہیں گے ہماری امی کے پاس ؟ کیا بھول گئے۔ ہم دونوں کا تبادلہ ہوچکا ہے۔ آپ امی کے پاس یہاں رہیں گے۔ میں خالہ کے پاس وہاں۔"

ارشاد کھلکھلا کر ہنس پڑا، کہنے لگا۔

"اجی جناب"، اس بھول میں بھی نہ رہیئے گا، یہ سب کچھ چالیں ہیں آپ کو لے جانے کی۔ ورنہ جہاں آپ، وہاں بندہ، چاہے وہ جنت ہو یا جہنم !

زلیخا کو بھی ہنسی آگئی، کہنے لگی۔

جہنم تک بھی آپ ساتھ دینے پر تیار ہیں۔

وہ ہنستے ہوئے بولا۔

اور کیا ؟ — یقین نہ ہو تو جا کر دیکھ لو۔"

وہ پھر ہنسی ضبط نہ کرسکی، کہنے لگی۔

"واہ میں کیوں جانے لگی جہنم میں۔

پھر جتنے دن ارشاد رہا، دونوں اسی طرح کی باتیں کرتے رہے باتیں شروع ہوجاتیں تو ختم ہونے میں نہ آتیں۔

اس زمانے میں امتیاز زیادہ تر دورے میں مصروف رہا، لہذا گھر میں بھی کوئی ایسی بات نہیں ہوئی۔ جو تکلیف دہ ہوتی ا بڑے مزے میں یہ دن گزر رہے تھے اور اسی روز دفعتہً سعادت گنج سے تار آیا کہ خالو جان کا، جنہیں خالہ اچھا بھلا چھوڑ کر آئی تھیں۔ انتقال ہوگیا۔ اس خبر نے سارے گھر میں کہرام مچادیا، مریم کا روتے روتے برا حال ہوگیا۔ رابعہ پر غشی کے دورے پڑنے لگے۔ ارشاد کی ساری زندہ دلی اور خوش طبعی اور جادو

بیاہی رخصت ہو گئی، اور پہلی ٹرین سے یہ غمزدہ قافلہ سعادت گنج روانہ ہو گیا، مریم نے کتنا چاہا کہ وہ بھی اپنی چھوٹی اور بیوہ بہن کے ساتھ چلی جائے، مگر وہ نہ جا سکی -

اس لئے وہ گھر سے باہر نہ جا سکی کہ اس لونڈی کا آقا گھر سے باہر تھا اور اس کی مرضی اور اجازت کے بغیر اگر وہ خود بھی مر جاتی، تو قبر میں داخل ہونے کے لئے گھر سے باہر نہیں جا سکتی تھی -

کلیجہ پہ پتھر کی سل رکھ کر اس نے بہن کو اور بھانجے کو بادیدہ گریاں اور با سینہ بریاں رخصت کیا -

اور پھر زمانہ کی چکی اس طرح چلی، کہ دونوں بہنیں ایک دوسرے کی صورت نہ دیکھ سکیں - کچھ عرصہ کے بعد مریم کا انتقال ہو گیا - گھر کے حالات اتنے ابتر تھے اور رابعہ خود اتنی شدید بیمار تھی کہ گھر سے باہر قدم نہ نکال سکی - نہ بیمار بہن کی عیادت کو آ سکی، نہ اس کے مر جانے کے بعد پرسے اور تعزیت کو -

زلیخا سوچنے لگی، اس کے بعد تو خالہ نے ہم لوگوں کو بالکل ہی فراموش کر دیا، کبھی خط تک نہ لکھا، بات نہ پوچھی، کیا یہ سارا چاؤ، پیار امی جان ہی کی زندگی تک تھا

"اور ارشاد؟"

کیا وہ — بھی بھول گیا — وہی وعدہ یعنی نباہ کا -

ہاں سب بھول گیا - اب اس دنیا میں خدا کے سوا کوئی اپنا نہیں ہے ہے، جب باپ اپنا نہ ہو سکا، اب ارشاد سے کیا توقع کی جائے -

وہ خوشی کی لہر جو ارشاد کے تصور سے اٹھی تھی ختم ہو گئی -

قلب کے خانہ تاریک میں امید، آرزو اور حسرت کی جو کرن پھوٹی تھی، وہ پھر غائب ہو گئی اور پھر تاریکی ہی تاریکی تھی — گھٹا ٹوپ اندھیرا -

اور جیسے ہی ارشاد کا دامن تصور اس کے ہاتھ سے چھوٹا، کلثوم کی بھیانک تصویر، سامنے آ کر کھڑی ہو گئی - اور کلثوم کے تصور کے ساتھ ہی نور سامنے آ کھڑا ہوا اس کے تن بدن میں آگ سی لگ گئی، اس نے نادرہ

سے کہا۔

تم ہی بچا سکتی ہو اس بربادی سے مجھے ۔ کیا واقعی تم موقع نکال کر ابا جی سے گفتگو کرو گی ؟"

نادرہ نے اطمینان دلاتے ہوئے جواب دیا۔

ہاں ضرور کروں گی۔ اور مجھے کامل یقین ہے کہ میری باتیں سن کر ان کی آنکھیں کھل جائیں گی، ان لوگوں کی حقیقت ان پر آشکار ہو جائے گی !"

(۷)

دن اسی طرح گزرتے رہے!
مگر حالات میں کوئی خاص تغیر نہیں ہوا۔ وہی شب و روز تھے، وہی ماحول وہی فضا۔

کلثوم کا برتاؤ اب اور زیادہ خراب ہو گیا تھا۔ نسیم کے برتاؤ میں پہلے سے کہیں زیادہ حقارت آ گئی تھی۔

ایک روز زلیخا اپنے کمرے میں بیٹھی کچھ سی رہی تھی، کہ نسیم آئی۔ نسیم کو اچانک اپنے پاس آتا دیکھ کر اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ وہ سوچنے لگی۔ یہ تشریف آوری خالی از علت نہیں ہو سکتی — ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں"۔

بہرحال اس نے مسکراتے ہوئے نسیم کا خیر مقدم کیا۔ سوئی اسی طرح ہاتھ میں لئے لئے اس سے مخاطب ہوئی اور کہنے لگی۔

"آج کدھر بھول پڑیں؟"

نسیم نے منہ بنا کر کہا۔ ہر وقت وہی طنز، مجھے ان باتوں سے سخت نفرت ہے؛

زلیخا نے سوئی کپڑے میں لگا کر اسے الگ رکھتے ہوئے کہا۔

"کیا لڑنے آئی ہو؟"

وہ چمک کر بولی "تم سے لڑ کر کچھ اپنی اوقات خراب کروں گی؟

"کچھ ہوش میں ہو؟"

یہ سن کر زلیخا کا خون کھولنے لگا، خاموش نہ رہ سکی، گویا ہوئی۔

"تو میں اتنی گئی گزری اور نیچ ہوں۔ کہ مجھ سے لڑنے میں بھی تمہاری توہین ہے۔"

وہ بولی "اور کیا نہیں بھی!" — دوستی اور لڑائی دونوں برابر والے سے ہوتی ہیں۔

"اور میں اس گھر کی خانہ زاد ہوں۔"

"ان حالوں میں کو پہنچ گئی۔ مگر زبان کی تیزی میں فرق نہیں آیا۔"

"کن حالوں کو پہنچ گئی۔"

ماں کو کھا گئیں۔ بھائی بھاگ کھڑا ہوا۔ ابا جان کبھی تھوکتے نہیں۔ نہ گھر میں جھانکیں۔ نہ اپنے پاس کھڑا ہونے دینے کے روادار، مگر مزاج ہے کہ چرخ چہارم کی سیر کر رہا ہے۔

"تو کیا یہی باتیں کرنے آئی تھی تم یہاں؟"

"میری آئی ہے پیزار میں کیوں آتی؟"

"تو جس سے باتیں کر رہی ہو، وہ کون ہے؟"

دیکھو بھائی تمہارا مزاج خراب ہے، زیادہ ٹپاپٹ مت بولو۔ ورنہ میرا ہاتھ چل جائے گا۔"

زلیخا اس وقت بالکل مقابلہ پر تلی ہوئی تھی، کہنے لگی۔

تو تم نے مجھے کوئی لنجا سمجھ لیا ہے؟ — دو ہاتھ تمہارے پاس ہیں دو ہی خدا نے مجھے دیئے ہیں۔

نسیم یہ سن کر برق جہندہ کی طرح چمکی، اور آ کر بالکل زلیخا کے سر پر کھڑی ہو گئی۔ خونخوار آنکھوں سے اسے دیکھا، اور کہنے لگی۔

"تو مجھے مارے گی؟ تیری یہ اوقات؟"

وہ بولی: "اوقات کا کیا سوال ہے؟ جو تم سو میں، ایک بھائی کی تم بیٹی ہو ایک کی میں۔ تم ایک مارو گی۔ ممکن ہے میں دو لگا دوں گی۔ آخر تم نے

مجھے سمجھا گیا ہے ؟"

"میں کیا سمجھوں گی۔ خدا ہی نے لعنت بھیج رکھی ہے تم پر۔"

چلو تم تو ہر طرح کے عذاب سے محفوظ ہو ؟

وہ چلائی، کوستی ہے، بد دعا دیتی ہے۔

اور یہ کہتے کہتے بالکل اس کے بدن سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ زلیخا نے محسوس کر لیا۔ اب یہ زور سے ایک چانٹا مارے گی۔ لیکن اس نے بھی فیصلہ کر لیا تھا۔ کہ ترکی بہ ترکی جواب ضرور دے گی۔ اینٹ کا جواب پتھر اور ساتھ ہی ساتھ دل میں کہہ رہی تھی کہ اس کا ساتھ دینے کے لئے گھر کا ذرہ ذرہ موجود ہے اور میں اپنے باپ پر بھی بھروسہ نہیں کر سکتی، یہ سوچ کر ذرا نرم پڑی اور ٹھنڈے لہجہ میں کہا۔ میرا کچھ دماغ تو خراب نہیں ہے کہ کوسنے بیٹھ جاؤں تمہیں، تم لاکھ کچھ نہ سمجھو، لیکن میں تو اس رشتہ کو قطع کر نہیں سکتی جو اٹوٹ ہے اور خدا کا بنایا ہوا ہے۔"

نسیم نے منہ بگاڑ کر کہا۔

چل ہٹ ـــ بڑی آئی اللہ والی۔

زلیخا نے چپ ہو جانا مناسب سمجھا۔ اس نے چاہا کہ بات ختم ہو جائے وہ بولی۔ اچھا میں بہت بُری ہی سہی، لیکن مجھے میرے حال پر چھوڑ کیوں نہیں دیتیں؟

نسیم نے جواب دیا:" ہم کیا چھوڑیں گے، خدا ہی نے چھوڑ رکھا ہے تمہیں؟"

یہ الفاظ تیر بن کر اس کو لگے۔ کیونکہ ان میں صداقت جھلکتی نظر آ رہی تھی۔ لیکن زلیخا خون کے گھونٹ کی طرح پی گئی، کوئی جواب نہیں دیا۔

(۸)

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ کلثوم بھی آگئیں اور آتے ہی نسیم پر برس پڑیں
بیٹی تم تو یہاں بیٹھ رہیں آکر اور مہمان آتے ہی ہوں گے زیادہ سے
زیادہ ایک گھنٹہ ہوگا، ٹرین کے آنے میں ''
وہ روہانسی آواز میں بولی۔
امی میں اسی لئے نہیں آرہی تھی؟
دفعتہً کلثوم کا رنگ بدل گیا۔ اس نے ایک مرتبہ کھا جانے والی
نظروں سے زلیخا کو گھورا، پھر نسیم سے پوچھا۔
" کیا ہوا میری بچی؟ — کیا اس (زلیخا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) کہا
نے کچھ کہا — داکھ لگا کے زبان کھینچ لوں گی۔ سمجھی کیا ہے۔ بتا تو ہی بیٹی
بات کیا ہوئی؟
وہ اور زیادہ روہانسی ہو کر بولی۔
مجھے کوسا، مجھے بد دعا دی مجھے مارنے کو کہا۔
یہ سنتے ہی کلثوم بیگم دہکتا ہوا انگارہ بن گئیں۔ بڑی تیزی سے اپنے
بھاری بھر کم جسم کو سنبھالتی اٹھیں اور زلیخا کے پاس پہنچ کر اس کے منہ پر
چانٹا زور سے رسید کیا۔ پھر پوچھا: "
تیری بھی یہ اوقات — کہیں بھنگ تو نہیں کھا گئی ہے۔ لو اور سنو
پاؤں کی جوتی یوں سر چڑھ کر بولنے لگی، خون چوس لوں گی، مجھے کچھ اور

نہ سمجھا۔

زلیخا نے بے بسی اور مظلومیت کے ساتھ گال پر ہاتھ رکھ لیا۔ آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے، پاؤں کانپنے لگے، جی چاہا، پھوٹ پھوٹ کر روئے لیکن ضبط کر گئی، اس نے سوچا۔ آنسو بڑے قیمتی ہوتے ہیں! انہیں دشمن کے سامنے رائیگاں نہیں کرنا چاہیئے۔

نادرہ بھی کلثوم کے ساتھ ساتھ آئی تھی۔ یہ کیفیت دیکھ کر اس کا دل چیخ اٹھا، لیکن اس کی بساط ہی کیا تھی، کچھ نہ کہہ سکی، زلیخا کو بچا تک نہ سکی۔ نہ اتنی سکت تھی، کہ اسے کلیجہ سے لگا لیتی۔ اس کے آنسو پونچھ دیتی۔

کلثوم ایسے زاویہ سے کھڑی تھی، کہ اندیشہ تھا، یہ طمانچہ صرف پہلا نہیں ہے، اس کے بعد بارش شروع ہو جائے گی۔ طمانچوں کی اُس مصیبت سے زلیخا کو بچانے کے لئے وہ بولی۔

آج صفدر بھیا آرہے ہیں، ان کے رہنے کا انتظام اس کمرے میں کیا گیا ہے جہاں اعجاز میاں رہا کرتے تھے، اس کمرہ کی ناپ کا قالین بیگم صاحبہ کے پاس نہیں ہے اور نسیم بیٹا چاہتی ہیں کہ وہی قالین بچھے جو بالکل وہاں فٹ آتا ہے۔ دے دوگی تو کیا ہو جائے گا۔ آخر صفدر بھی کوئی غیر نہیں اپنا ہی ہے اور مہمان کی خاطر تو کرنی ہی چاہیے۔

اتنی دیر میں زلیخا نے خود اعتمادی اور قوت ارادی سے کام لے کر اپنے آنسو خشک کر لئے تھے، اپنی کیفیت اور دل پر بھی قابو پا لیا تھا، کہنے لگی۔

مجھ سے تو انہوں نے قالین کے لئے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ ورنہ میرا کیا بگڑتا تھا، ایک دفعہ نہیں سو دفعہ لے جاؤ۔

نسیم کو اپنی پوزیشن کچھ کمزور سی محسوس ہوئی۔ اس نے گویا صفائی دیتے ہوئے کہا۔

کچھ بات کرنے کا موقعہ بھی دیا ہوتا۔ میں نے قدم رکھا اور طنز و تعریض کا سلسلہ شروع کر دیا۔ میں نے بات کی اور تم نے برابر کی چوٹ مرنے مارنے کو تیار ہو گئیں۔

یہ کہتے کہتے نسیم کی آواز بھرا گئی۔ کلثوم نے لپک کر اُسے گلے سے لگا لیا اور اس کے سر پر محبت اور شفقت سے ہاتھ پھیرتی ہوئی بولی۔

برابر کی چوٹ تجھ سے اس گھر میں کون لڑ سکتا ہے۔ کہاں راجہ بھوج کہاں گنگوا تیلی، یہ پاؤں کی جوتی اور اس قابل کہ تیرے منہ لگے؟ لوکا لگا دوں گی منہ میں بہت بڑھ بڑھ کے باتیں بنانے لگی ہے "!

صفدر کا سن کر ویسے ہی وہ دہل گئی تھی۔ اندیشہ تھا۔ کہیں منور بھی اس کے ساتھ نہ ہو۔ یا بعد میں نہ آجائے نہ بولنے کا فیصلہ کر چکنے کے باوجود بول پڑی" کہنے لگی۔

پچی اماں —

پچی اماں نے بات کاٹ دی۔

اے چل لعین — خبردار جو مجھے پچی اماں کہا ہو گا۔ نہ تو میری کچھ ہے نہ میں تیری کوئی ہوں —

پھر نسیم سے کہا لعنت بھیجو قالین پر —

لیکن نسیم مچل گئی۔ بچوں کی طرح ٹھنکتی اور زمین پر پاؤں پٹختی ہوئی کہنے لگی۔

نہیں اماں — وہی قالین اس کمرے کے لئے خوب سجتا ہے۔

نادرہ کو پھر موقعہ مل گیا، کہنے لگی۔

بیٹی دے دو۔ بٹیا ضد یا گئی ہے اس کی ضد پوری کردو۔

زلیخا نے کمرہ کے ایک گوشہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

وہ رکھا تو ہے، بھونڈو سے کہو لے جائے آکر۔ نہ میں نے منع کیا تھا، نہ منع کرتی ہوں۔

کلثوم بھی اُسے دہراتی ہوئی بولیں۔

نہ میں نے منع کیا تھا، نہ میں منع کرتی ہوں۔ کیا کہنا ہے سرکار کا — ذرا منع کر کے دیکھو تو سہی۔ جیسے اس کے منع کرنے سے ہم مان بھی جائیں گے۔ میں کہتی ہوں۔ تو اپنی اوقات کیوں بھول جایا کرتی ہے بار بار اور

جلد از جلد ۔ سن لے کان کھول کر یہ گھر ہمارا ہے۔ یہاں کی ہر چیز ہماری ہے۔ ہم تیرے ساتھ بھی جو چاہیں کریں۔ کوئی ہمارا ہاتھ پکڑنے والا نہیں ہے"

نسیم ہنس پڑی کہنے لگی۔

"امی یہ نہ کہئے، ممکن ہے آپ کی یہ بات منور کو بری لگے"

انتہائی برہم ہونے کے باوجود کلثوم بھی اپنی مسکراہٹ ضبط نہ کر سکی محبت اور پیار کے ساتھ نسیم کا ہاتھ پکڑا اور باہر نکلتے ہوئے کہنے لگی۔

اچھا چل ۔

نسیم مسکراتی ہوئی اور زلیخا کی طرف مسکراتی ہوئی نظروں سے دیکھتی ہوئی ماں کے ساتھ چلی گئی۔ اس کا یہ تبسم بجلی کی طرح اس کے خرمن ہوش و حواس پر گرا۔ ادھر نسیم گئی، ادھر زلیخا نے کانپتی ہوئی آواز سے کہا۔

نادرہ مجھے سنبھالو۔ سر گھوم رہا ہے میرا ۔

(۹)

لیکن وہ گرنے نہیں پائی ۔ نادرہ نے اسے سنبھال لیا۔ سہارا دے کر جلدی سے بستر پر لٹا دیا۔ اور پنکھا جھلنے لگی۔ تھوڑی دیر تک وہ آنکھ بند کئے لیٹی رہی۔ پھر اس نے آنکھیں کھولیں اور بڑی حسرت کے ساتھ بولی۔

نادرہ —

اور پھر کچھ نہ کہہ سکی، اس کے ہونٹ لرزنے لگے اور آنکھیں بہنے لگیں۔

نادرہ نے اسے گلے سے لگا لیا۔ اور تسلی دیتے ہوئے کہا۔

پھر وہی — میں کہتی ہوں، رو رو کر اپنے تئیں ہلکان اور پریشان نہ کرو۔ میاں کو دورے سے آلینے دو، خدا کی قسم پہلا کام یہی کروں گی کہ ان لوگوں کا پول کھول دوں گی، پھر دیکھ لینا کیا ہوتا ہے۔

زلیخا نے خشک ہونٹوں پر خشک زبان پھیرتے کہا۔

"پانی —"

نادرہ نے صراحی سے لے کر ٹھنڈا پانی پلایا۔ تو ذرا تازگی سی آگئی نادرہ نے کہا۔

اچھا اب میں جاتی ہوں۔ ورنہ میری شامت آجائے گی۔

زلیخا اسی طرح لیٹی رہی۔ گردن کے اشارے سے جانے کی اجازت

دے دی۔ اتنے میں بھوندو قالین لینے آگیا۔ کہنے لگا۔

"کیا کر رہی ہو یہاں اتنی دیر سے ؟"

بے چاری نادرہ سٹ پٹا سی گئی، کہنے لگی۔

تیرا سر — اب تو نے بھی پر پرزے نکالے !"

وہ ہنسنے لگا۔ پھر زلیخا کی طرف دیکھ کر یکسر سنجیدہ ہو گیا۔

کہنے لگا —

" ارے بیٹا کیسی طبیعت ہے ؟"

بھوندو بھی گھر کے ان چند لوگوں میں تھا۔ جن کا سر مریم کی عظمت کے آگے جھکا ہوا تھا۔ اس لئے قدرتاً" اعجاز اور زلیخا سے بے انتہا ہمدردی تھی۔ اگرچہ عملاً وہ کوئی مدد ان کی نہیں کر سکتا تھا۔

زلیخا نے اسی طرح لیٹے لیٹے کہا۔

اچھی ہوں — ذرا چکر آگیا تھا۔

بھوندو نے قالین اٹھا کر سر پہ رکھا اور نادرہ سے کہا۔

" میرا منہ کیا تک رہی ہو — سر کیوں نہیں دبائیں ویسے بڑا چاؤ رکھتی ہو بیٹا کا"

نادرہ نے پیچھے سے ایک دوہتڑ جمایا، اس کی پیٹھ پر۔ وہ ہائے دیا رے ڈوب (بیہوش) آٹے گئ !" کہتا ہوا چلا گیا۔

زلیخا بھی مسکرا دی۔ کہنے لگی۔

بہت چھیڑتا رہتا ہے تمہیں۔

پھر نادرہ بھی چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد زلیخا بڑی دیر تک بستر پر لیٹی کروٹیں بدلتی رہی۔ یہیں لیٹے لیٹے گھر کی گہما گہمی شور و غل اور

ہنگا آرائی سے اس نے اندازہ کر لیا۔ کہ صفدر آگیا۔ اور اس کے خیر مقدم میں کتنے زیادہ جوش و خروش کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ بار بار اس کے کانوں میں کلثوم اور نسیم کی آوازیں آرہی تھیں اور مختلف قسم کی ہدایتیں دی

جا رہی تھیں۔ غریب بھوندو کو۔

شام کو وہ اُٹھی، اور باورچی خانے میں جا کر کھانے پکانے لگی امتیاز کی موجودگی میں تو اہتمام کرنا پڑتا تھا۔ لیکن جب وہ تنہا ہوتی تو صرف دال روٹی یا سبزی، ترکاری پر اکتفا کرتی تھی۔ یہ اس کا ہمیشہ سے معمول تھا کہ کچھ بھی پکاتی، بھوندو اور کلثوم کو بھی ضرور اس میں سے دیتی تھی، آج وہ میتھی آلو پکا رہی تھی۔ بھوندو ادھر سے گزرا کہنے لگا۔

بیٹا اس دن تم نے جو میتھی آلو پکائے تھے، بڑے مزے کے تھے۔

وہ مسکراتی ہوئی بولی۔ اچھا اچھا رکھ لوں گی تیرے لئے وہ ہنستا ہوا خوش خوش چلا گیا۔

کام سے فارغ ہو کر وہ باورچی خانے سے نکلی تو صفدر اس کمرہ سے اتر رہا تھا۔ جو کبھی اعجاز کمرہ کا مسکن تھا۔ دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں، زلیخا کی آنکھیں جھک گئیں۔ لیکن صفدر کی نگاہیں۔ اس کا جائزہ لینے لگیں۔ ان آنکھوں میں لگاوٹ، شرارت، خیانت، نہ جانے کیا کیا تھا۔

اتنے میں نسیم آ گئی۔ اسے دیکھتے ہی صفدر سنبھل گیا۔ لیکن نسیم کوئی بچہ تو تھی نہیں، اندازہ کر لیا کہ یہ اسے تک رہا تھا کہنے لگی۔

وہاں چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے، اور آپ یہاں کھڑے ہیں۔

وہ نسیم کے کمرے کی طرف جاتا ہوا بولا۔

وہیں تو جا رہا تھا۔ چلو

، وہ بولی آپ چلئے میں ابھی آئی!"

صفدر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد نسیم نے بڑے جلے بھنے لہجہ میں کہا۔

یہ صاحب جو ابھی امی کی طرف چائے پینے تشریف لے گئے ہیں، ان کا نام صفدر ہے۔ منوّر نہیں۔ ڈورے اس پر ڈالنا، آیا سمجھ میں؟

اور قبل اس کے کہ وہ کوئی جواب دے خود بھی اسی طرف چلی گئی جدھر صفدر گیا تھا۔

زلیخا کی حالت یہ الفاظ سن کر یہ ہوئی کہ کاٹو تو لہو نہیں بدن میں۔ جی چاہتا تھا زمین پھٹے اور اس میں سما جائے وہ اپنے کمرے میں آ گئی لیکن اس کے کان میں بار بار نسیم کے الفاظ گونج رہے تھے۔

(۱۰)

دوسرے دن صفدر احراز کے ساتھ شکار کھیلنے چلا گیا۔ پروگرام یہ تھا کہ صبح منہ اندھیرے چلے جائیں گے اور شام ہوتے ہوتے واپس آجائیں گے۔

آج گھر سونا سونا سا تھا۔ وہ رونق اور چہل پہل جو صفدر کے آنے سے پیدا ہوگئی تھی، اس کی عدم موجودگی کے سبب نظر نہیں آرہی تھی۔ زلیخا نے آج نہا دھو کر کپڑے بدلے تھے اور صحن میں بیٹھی نادرہ سے کنگھی کرا رہی تھی ماں۔ بیٹی یعنی کلثوم اور نسیم شاید موقعہ کی منتظر تھیں پہلے نسیم برآمد ہوئی اور مسکراتی ہوئی نادرہ سے کہنے لگی۔

یہ سولہ سنگار کس کے لئے کئے جا رہے ہیں؟"

نادرہ بیچاری، اندرونی حالات و تاثرات سے ناواقف، زلیخا نے بھی اسے کچھ نہیں بتایا تھا، مسکراتی ہوئی بولی۔

میری زلیخا کو سولہ سنگار کرنے کی ضرورت کیا ہے؟ ویسے ہی وہ چندے آفتاب اور چندے ماہتاب ہے۔

نسیم زہر خندہ کرتے ہوئے کہا۔

۔ ہاں کیوں نہیں — اور اس چاند کی چاندنی اور سورج کی دھوپ اسی لیئے تو دور دور جانے لگی ہے۔

نادرہ نے کنگھی کرتے ہوئے۔

میں سمجھی نہیں، کیا مطلب ہے تمہارا؟

وہ بولی مطلب ہے تمہارا

وہ بولی مطلب کیا ہوتا، پوچھ لو، اپنی چندے آفتاب، چندے ماہتاب سے — آخر دوسروں سے آنکھیں کیوں لڑائی جاتی ہیں۔

نادرہ کا ہاتھ رک گیا، کنگھی اسی طرح ہاتھ میں لئے لئے بولی۔

" آنکھیں کون لڑاتا ہے — کس سے؟"

وہ طنز کرتی ہوئی بولی " اب اتنی بھولی نہ بنو — تمہاری بی ماہتاب بیگم — میں نے خود اپنی آنکھ سے کل دیکھ لیا۔

کیا دیکھ لیا بیٹا۔

آنکھیں لڑائی جا رہی تھیں۔ وہ تو کباب میں ہڈی بن کر میں آگئی تو بیچارے صفدر کی جان چھوٹی۔

زلیخا کا چہرہ زرد پڑ گیا، تلے کی سانس تلے، اوپر کی اوپر ابھی صورت احوال کو نادرہ سمجھ بھی نہیں پائی تھی، کہ کلثوم بیگم خراماں خراماں تشریف لائیں۔ پہلے تو انہوں نے نسیم کو ڈانٹا۔

تو یہاں کھڑی کیا کر رہی ہے — ہزار مرتبہ کہہ دیا ادھر نہ آیا کرو

" نسیم نے تیوری چڑھا کر کہا " واہ آپی کیا کہا اپنا گھر چھوڑ دوں؟ خواہ مخواہ ڈانٹ دیا مجھے، آخر کیا کیا ہے میں نے؟

وہ بولیں " تجھے تو اس (زلیخا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) کے سایہ سے بچنا چاہیئے۔ ورنہ تیرا دیدہ بھی ہوائی ہو جائے گا۔

وہ چپ رہی، کلثوم بیگم نے اسی طرح کھڑے کھڑے زلیخا سے کہا —

سنتی ہو بی — رہنا ہے تو آدمی بن کر رہو، ورنہ بھائی صاحب سے کہہ دو، وہ کسی کو بلوا کر دو بول پڑھوائیں اور تمہیں رخصت کر دیں۔ غضب خدا کا، میں کہتی ہوں، واقعی قیامت قریب آ گئی ہے، صورت دیکھو تو کتنی بھولی اور معصوم اور لچھن دیکھو تو طوطوں سے دو ہاتھ آگے اسی

نادرہ سنا تو نے کچھ؟"

وہ لرزتی ہوئی آواز میں طوفان کا اندازہ کرتی ہوئی بولی۔

"بی بی میں کیا جانوں؟"

بی بی نے بتایا چند دن کے لئے بے چارہ مہمان بن کر آیا ہے صفدر میرے کا سی بھائی کا لڑکا ہے، خدا چاہے گا تو بہت جلدی اس کی اور نسیم کی شادی بھی ہو جائے گی، انہوں (احرار) نے بھی منظوری دے دی ہے۔

ہاں اللہ جوڑی سلامت رکھے دونوں کی۔

اونہہ — کہہ کر نسیم زیر لب متبسم کے ساتھ سین سے ہٹ گئی۔ کلثوم نے کہا۔

وہ تو سلامت رہے گی، لیکن کل جب وہ اپنے کمرے سے اتر کر میری طرف چائے پینے آرہا تھا۔ تو صاحب زادی زلیخا خانم یہیں اسی جگہ کھڑی ہوئی اس سے آنکھیں لڑانے کی مشق کر رہی تھیں، انہیں لڑکی ہو کر شرم نہ آئی، اور وہ مرد ہو کر شرما گیا۔

نادرہ نے بے ساختہ ہو کر کہا۔

جھوٹ بی بی جھوٹ، میں زلیخا کو بہت اچھی طرح جانتی ہوں، وہ ایسی لڑکی نہیں ہے۔ وہ کسی بادشاہ کی طرف بھی نظر اٹھا کر نہ دیکھے۔

کلثوم نے ڈانٹا۔ تو کیوں ٹر ٹر کئے جا رہی ہے۔ خود نسیم نے اپنی آنکھ سے دیکھا۔ خود صفدر نے اپنی زبان سے اقرار کیا۔ دونوں جھوٹے ہیں۔

نادرہ لاجواب ہو گئی، کلثوم نے تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا۔

صفدر جب چائے پینے آیا، تو نسیم نے اسے چھیڑا، وہاں کیا ہو رہا تھا صحن میں ابھی؟ بے چارہ سٹ پٹا گیا۔ کہنے لگا۔

جب اس نے آنکھ لڑائی تو میں بھی یہ دیکھنے کے لئے کہ کس کی پلک پہلے جھپکتی ہے ٹکٹکی لگا کر دیکھنے لگا۔ لیکن میں ہار گیا۔ دو دفعہ میری پلک جھپک گئی۔ مگر زلیخا کی پلک میں جنبش تک نہ ہوئی۔

نادرہ غرق حیرت کلثوم کی طرف دیکھ رہی تھی، اور وہ کہہ رہی تھی۔

پھر کہنے لگا، میں تو خیر گھر کا آدمی ہوں اور مجھے ضرورت بھی کیا تھی اس پھندے میں آنے کی لیکن اگر یہی کرتوت ہیں ان کے تو ایک دن آپ لوگ منہ ڈھانپ ڈھانپ کر رو بیٹھے گا، صاحبزادی نہ جانے کیا گل کھلا کر رہیں گی؟"

نادرہ اسی طرح کلثوم کو تکے جارہی تھی، وہ کہنے لگی۔

یہ زمانہ آن لگا ہے — میں تو بھیا چاہے کچھ ہو جائے۔ اب تو بھائی صاحب کے آتے ہی اس معاملہ کو یک سو کر کے رہوں گی اور منور کے ہاتھ میں ہاتھ پکڑا دوں گی۔ وہی سنبھال سکتا ہے۔ اس فیل بے زنجیر کو، بھائی صاحب کا کیا ہے، انہیں تو کچھ خبر ہی نہیں ہے کسی بات کی۔"

یہ نوید دے کر کلثوم بیگم بھی تشریف لے گئیں۔

زلیخا پھٹی پھٹی آنکھوں سے نادرہ کو دیکھ رہی تھی، نادرہ نے کہا۔

دیکھ لیا تم نے۔ یہ ہیں ان لوگوں کے ارادے۔ لیکن خدا نے چاہا تو ساری تدبیریں الٹی پڑیں گی۔ مجھے اپنے میاں پر پورا بھروسہ ہے۔

زلیخا نے اٹکتے اٹکتے اور رکتے رکتے کہا۔

لیکن نادرہ ایسی ذلیل باتیں سن سن کر میرا کلیجہ پھٹا جارہا ہے اگر تم نے زہر لا کر نہ دیا تو میں بھی خون تھوکنے لگوں گی۔

نادرہ نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور بولی۔

خون تھوکیں تمہارے دشمن۔ تمہیں کیا پڑی ہے خون تھوکنے کی لیکن ہوا کیا تھا۔

زلیخا نے سارا واقعہ بتا دیا، نادرہ توجہ سے سنتی رہی۔ پھر بولی ضرور ایسا ہوگا، کیونکہ میں نے خود دیکھا ہے آتے جاتے وہ تمہارے کمرے کے دروازے کو تکتا جاتا ہے۔ شاید اس امید میں کہ جھلک نظر آجائے، بڑا بدمعاش ہے۔ خوب جانتی ہوں سارے گھر کو —

(۱۱)

اعجاز کے دل میں نفرت کا طوفان باپ کے لئے شروع ہوا اور چچا، چچی، نسیم سب تک وسیع ہو گیا۔ اور اب یہی طوفان زلیخا کے دل میں ہل چل مچائے ہوئے تھا۔

زلیخا کو باپ سے نفرت تو کبھی نہیں ہوئی، ہاں دل ہی دل میں اس کی شاکی ضرور تھی، ماں کی بے وقت اور حسرت نصیب موت کا اس کے دل پر داغ تھا۔ اور اس کا ذمہ دار وہ بھی اعجاز کی طرح باپ کو سمجھتی تھی۔ اسی اس کا برتاؤ اعجاز اور اس کے ساتھ، اس نے بھی اس کے دل میں گھاؤ ڈال دیا تھا۔ پھر بھی وہ اس سے نفرت نہیں کرتی تھی۔ اور اب تو نفرت کرنے کی کوئی وجہ بھی نہیں تھی اکم از کم زلیخا کی حد تک اس کا طرز عمل بہت کچھ بدل گیا تھا۔ لیکن کلثوم اور نسیم کے خلاف اس کے دل میں بھی نفرت اور غم و غصہ کا لاوا کھول رہا تھا لیکن بے بس تھی، کچھ کر نہیں سکتی تھی۔

صفدر کی آمد کے وقت اور اس کے آنے کے بعد کلثوم اور نسیم نے جو حرکتیں کیں، انہوں نے اور زیادہ اسے ان دونوں سے متنفر کر دیا۔ وہ فتنہ، فساد اور ہنگامہ آرائی کو طبعاً سخت ناپسند کرتی تھی۔ اس لئے اکثر باتیں ٹال جاتی تھی اور باپ سے تو کبھی اس نے ان لوگوں کی شکایت محض اس لئے نہیں کی بات بڑھنے نہ پائے الیکن اب

وہ تلی بیٹھی تھی۔ کہ موقع ملے تو سارا کچا چٹھا اس کے سامنے کھول دے
لیکن حالت یہ تھی کہ اس کی آمد و رفت کو باپ کے پاس باہر پردے کی وجہ سے محدود تھی۔ نادرہ جو ہر وقت جا سکتی تھی کئی مرتبہ یہ ارادہ کر کے گئی کہ آج ساری داستان بیان کر دوں گی۔ لیکن موقعہ نہ ملا۔ مایوس و ناکام واپس آ گئی۔

ادھر ان دونوں کی بے بسی کا یہ حال تھا۔ ادھر ماں بیٹی — کلثوم اور نسیم گویا گھل کھیلی تھیں، شاید ہی کوئی دن ناغہ جاتا ہو گا کہ کوئی نہ کوئی نیا طعنہ یا نیا الزام ہیں نہ آتا ہو۔ حالانکہ اس دن کے بعد سے اس نے اپنے کمرہ سے قدم باہر نکالنا یک لخت بند کر دیا تھا۔ گرمی ہو یا حبس، ہر حالت میں وہ یہیں بیٹھی رہتی، اس کی کوشش یہ تھی کہ اب صفدر اس کی جھلک بھی نہ دیکھ سکے۔

لیکن صفدر کا معاملہ یہ تھا کہ ایک بار دیکھا ہے، دوبارہ دیکھنے کی ہوس باقی ہے وہ بہانے تراش تراش کر ایسی صورتیں پیدا کرتا تھا کہ اس بتدریج سے بات چیت اور رسم و راہ کی کوئی صورت نکلے
ایک روز دوپہر کے وقت زلیخا اپنے کمرے میں لیٹے لیٹے حبس اور گھٹن سے گھبرا کر باہر نکلی اور کمرہ کے سامنے جو برآمدہ تھا۔ وہاں آ کر ٹہلنے لگی، بلا سے دھوپ کی تپش ہی، لیکن کچھ ہوا تو ہو گی، یہاں تو پسینہ میں نہائی جا رہی تھی۔

مشکل سے دس منٹ گزرے ہوں گے کہ صفدر ہنستا اور مسکراتا ہوا باہر سے آیا۔ چاہیے یہ تھا کہ سیدھا اپنے کمرے میں اوپر چلا جاتا یا اس حصۂ مکان کی طرف چلا جاتا جہاں نسیم اور کلثوم رہتی تھیں۔ لیکن زلیخا کو دیکھ کر وہ ٹھٹکا، رکا اور پھر سامنے آ کر کھڑا ہو گیا، کہنے لگا۔

"کیا نسیم بھی یہاں آئی ہوئی ہے آپ کے پاس؟"
اس نے بے رخی کے ساتھ جواب دیا "جی نہیں۔

تو شاید وہ اپنے کمرے میں ہو گی۔

"ظاہر ہے وہیں ہونا چاہیے اسے۔"

مگر آپ یہاں، اس لُو اور تپش میں کیوں کھڑی ہیں؟"

"کمرہ میں یہاں سے زیادہ گرمی ہے۔"

شاید آپ کے اور نسیم کے تعلقات کچھ کشیدہ ہیں۔

کیا آپ سے نسیم کہہ رہی تھی!

"نہیں میرا اندازہ ہے۔ لیکن کیوں کشیدہ ہیں کوئی وجہ بھی تو ہو گی؟"

"اس کا جواب بھی نسیم ہی دے سکتی ہے۔"

"شاید اسے غلط فہمی ہو گئی ہے کچھ۔"

"ہو گئی ہو گی — لیکن آپ یہاں کیوں کھڑے ہیں۔ آپ کو مجھ سے باتیں کرنے کی کیا ضرورت ہے، میرا آپ کا نہ کوئی رشتہ ہے نہ تعلق۔

اور پھر وہ اپنے بھٹی کی طرح گرم گرم اور دہکتے ہوئے کمرے میں چلی گئی

صفدر ذرا دیر وہیں کھڑا رہا۔ پھر کندھے اچکائے اور اپنے کمرے میں گنگناتا چلا گیا — ہم کو کبھی پوچھتے رہو، تو کیا گناہ ہو —!"

(۱۲)

شام کو اپنے کمرے میں بیٹھی وہ چائے پی رہی تھی، کہ نادرہ آگئی زلیخا نے ایک پیالی بنا کر نادرہ کو بھی دے دی اور کہنے لگی۔
نادرہ آخر اس مصیبت سے چھٹکارے کی بھی کوئی صورت ہے؟
نادرہ نے گھونٹ حلق سے اتارتے ہوئے پوچھا، کیا کوئی بات ہو گئی۔
نازلیخا نے سارا واقعہ بیان کر دیا اور کہنے لگی۔
دل ہی دل میں خدا سے دعا کر رہی تھی کہ کہیں چچی اماں یا نسیم نہ آ جائیں ادھر ـــــ
"ہاں پھر تو وہ بات کا بتنگڑ بنتا کہ اللہ دے اور بندہ لے، خیریت ہی گذری!
"اور کیا ـ لیکن سوال یہ ہے کہ آخر یہ سلسلہ کب تک جاری رہے گا؟"
جب تک وہ چلا نہ جائے یہاں سے!"
"جائے گا کب؟"
"منگنی کی رسم ادا کرنے کے بعد؟"
"اور وہ رسم کب ادا ہو گی؟"

شائد دس پندرہ دن لگیں گے۔

"کیوں، اتنی دیر اس کارِ خیر میں؟"

ہونے والے دولھا میاں کے ابا بھی آرہے ہیں!

"(گھبرا کر) نادرہ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ جب تک منگنی نہیں ہو جاتی میں کہیں اور رہوں؟"

"یہ کیوں؟ — کہیں اور رہنے کی کیا ضرورت ہے؟"

میرا دل لرز رہا ہے، ماں باپ کی آمد کے تصور سے۔

"واہ بیٹا، یہ کیوں بھلا؟ — ان سے کیوں گھبرا رہی ہو۔ خواہ مخواہ؟

دیکھ لینا نادرہ، ان لوگوں کے بعد، پھر طوفان اٹھے گا۔

"میرے خلاف۔"

"نہیں — اتنی بدگمانی بھی اچھی نہیں!"

"تم ان لوگوں کا مزاج نہیں جانتیں، میں جانتی ہوں۔"

میں بھی جانتی ہوں اور تم سے زیادہ جانتی ہوں، اب ایسا اندھیر بھی نہیں ہے!"

"خدا کرے تمہارا خیال صحیح ہو!"

اور وہ لوگ کچھ زیادہ دن کے لئے تو نہیں آرہے ہیں۔ منگنی کی رسم انجام دے کے چلے جائیں گے اور یہ چند دن رسموں کی بجا آوری میں مہمانوں کے آنے جانے میں اور دوسری ہنگامہ آرائیوں میں اس طرح بسر ہو جائیں گے کہ کسی کو تمہاری طرف توجہ کرنے کی فرصت ہی نہیں مل سکے گی۔"

"کاش ایسا ہی نادرہ۔"

ضرور ایسا ہی ہوگا، تم تو بات بے بات میں پریشان ہو جاتی ہو۔"

"کیا تمہارا خیال ہے، صفدر نباہ لے گا نیم؟"

"(کچھ سوچتے ہوئے) مشکل ہے کیونکہ بہت بدنظر ہے اور ایسا آدمی کبھی بھی بیوی پر قانع نہیں ہو سکتا۔ یہ میرا مشاہدہ ہے۔"

لیکن محبت کے تو بڑے دعوے ہیں دونوں طرف سے !"

" ہوا کریں — بچے کے پاؤں پالنے میں نظر آجاتے ہیں "

اتنے میں کلثوم بیگم اندناتی ہوئی کمرے میں تشریف لے آئیں۔ انہیں دیکھ کر زلیخا کے ہاتھ سے پیالی چھوٹ کر پختہ فرش پر چھن سے گری نادرہ بھی اس بے وقت اور بے موقع آمد سے گھبرا گئی۔ کلثوم نے نادرہ کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔

تجھے یہاں چائے پینے کی پڑی ہے اور وہاں میرا بچہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے چائے کے انتظار میں بیٹھا ہے۔

" بی بی وہ تو باہر گئے ہوئے تھے !"

" تو کیا خدانخواستہ ہمیشہ کے لئے گیا تھا ؟" — آگیا کب ہوگا !"

" اچھا میں ابھی لائی بس ایک منٹ میں "

جاتے جاتے کلثوم بیگم نے ٹوٹی ہوئی پیالی کو ایک ایک ٹھوکر لگائی اور فرمایا۔

" کتنی ہمدردی ہے باپ کی کمائی سے — خدا دشمن کو بھی ایسی اولاد نہ دے !"

زلیخا چپ رہی، اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کلثوم بیگم چلی گئیں ان کے جانے کے بعد نادرہ کہنے لگی۔

واقعی نہ جانے کیا ہو گیا ہے بیگم صاحبہ کو "

تمہی دیکھ لو نادرہ — میں نہ کہتی تھی۔ ان لوگوں کے آنے کے بعد ضرور مجھے ذلیل اور رسوا کرنے کی کوئی تدبیر نکال لی جائے گی۔

" اب تو مجھے بھی اندیشہ ہو چلا ہے "

" آخر تم ابا جی سے بات کیوں نہیں کرتیں ؟ — ان کے کان میں ان حالات کی بھنک پڑھ جائے گی تو وہ کچھ چونکتے تو رہیں گے۔

" کیا تم سمجھتی ہو مجھے خیال نہیں ہے ! — دس مرتبہ یہی سوچ کر رہ گئی

کہ آج ضرور سارا ماجرا بیان کر کے آؤں گی۔ لیکن قسم سے تو جو موقعہ ملا ہے
"تو آخر موقعہ کب ملے گا؟" — "پیدا کرو موقعہ!"
"لیکن کیونکر؟" — "وہ تو جب باہر جاؤ، مصروف ملتے ہیں۔ کچھ لوگ ضرور بیٹھے ہوتے ہیں، بس انہی سے باتیں ہوتی رہتی ہیں، دیکھو تو تم کتنے دن سے نہیں بلایا ہے؟"

"ہاں کئی دن ہو گئے، میرے خیال میں مہینہ سے زیادہ ہو گیا!
لیکن ایک بات سمجھ میں نہیں آئی!" "وہ کونسی بات ہے؟"
"آج کل میاں کچھ پریشان سے دکھائی دیتے ہیں؟" "یہ تم نے کیسا جانا۔
صورت سے — ہر وقت اداس اور غمگین نظر آتے ہیں، جیسے کوئی بڑی فکر ہو۔ جیسے کوئی بے حد اہم معاملہ ہو"

"دفتر کی بات ہو گی۔؟"
اللہ جانے — پہلے تو یہ حال تھا۔ ہر وقت شطرنج بچھی ہوئی ہے تاش کھیلا جا رہا ہے، ادھر اُدھر کی سرگشت ہو رہی ہے۔ "اور اب؟"
اب بس مردانے میں بیٹھے رہتے ہیں، نہ ہنسیں، نہ بولیں، بس دوسروں کی باتیں سنتے رہتے ہیں — وہ بھی بے دلی سے!

✪

(۱۳)

نادرہ کے جانے کے بعد زلیخا اٹھی اور دبے پاؤں مردانے کی طرف بڑھی اور دروازے سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔

امتیاز باہر بیٹھا تھا اور اس وقت بالکل تنہا تھا۔ اس نے چاپ سن لی تھی۔ لیکن جب کوئی سامنے آیا۔ تو زور سے کہا۔

"کون ہے؟"

زلیخا آ کر کھڑی ہو گئی۔

"ابا جی! میں ہوں۔"

اس نے شفقت و محبت سے بھرپور لہجہ میں کہا۔

اوہو ہماری زلیخا ہے آ۔ بیٹی آ!"

وہ اندر چلی آئی۔ امتیاز ایک مونڈھے پر بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ سامنے دوسرا مونڈھا تھا۔ اس پر وہ بیٹھ گئی۔ امتیاز نے اسے غور سے دیکھا پھر کہا۔

"ارے کیا بات ہے؟"

"اس نے کہا۔" کچھ نہیں ابا جی؟"

"تیرا چہرہ اترا ہوا کیوں ہے؟ تو تو بہت پریشان اور افسردہ نظر آ رہی ہے؟ کسی سے لڑائی ہو گئی کیا؟ لیکن تو لڑنا کیا جانے، بیمار تو نہیں ہے کچھ؟"

محبت سے بھرے ہوئے ان چند الفاظ نے اُسے رونے کا موقعہ مہیا کر دیا، منہ سے کچھ نہ بولی، موتی کی طرح بڑے بڑے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔

امتیاز کچھ عجیب قسم کی طبیعت رکھتا!

وہ قسم کھا کر کہہ سکتا تھا۔ اور اس کا یہ کہنا بالکل سچ ہوتا کہ اس نے آج تک کسی کو پیار نہیں کیا۔ کبھی جذبات کے دھارے میں نہیں بہا کبھی احساسات اور تاثرات کی دنیا میں قدم رکھا۔ ہنسنے میں اس نے سب کا ساتھ دیا۔ لیکن روتے میں وہ کسی کا ساتھ نہ دے۔ سکا۔ وہ آہنی اعصاب کا مالک تھا۔ لیکن اس کے سامنے اگر قیامت آجاتی۔ اور "آنا فانا" ساری دنیا ختم ہو جاتی اور وہ تنہا بچ جاتا تو بھی، نہ اس کی آنکھ سے آنسو ٹپکتا۔ نہ اس کے منہ سے آہ نکلتی۔ نہ اس کے ہاتھ ماتم کے لئے سینہ تک جاتے پوری شدت کے ساتھ اپنے معمولات پر عمل کرتا رہتا بلکہ تنہا اس اکیلی دنیا میں زندگی بسر کئے جاتا، اور جب مرنے کا وقت آتا تو مر جاتا۔

اس حقیقت کو زلیخا اچھی طرح سمجھتی تھی۔ لیکن آج یہ لوہا مخمل کی طرح ملائم نظر آرہا تھا۔ آج اس فولاد کے سینہ میں دل دھڑکتا نظر آرہا تھا۔ یہی انوکھی اور نئی چیز تھی، جس نے پہلے تو اسے متحیر کر دیا اور پھر وہ محسوس کرنے لگی جیسے میں اتنی دور سمجھتی تھی وہ کتنا قریب نکلا۔ اس نے محسوس کیا میں اس دنیا میں تنہا نہیں ہوں، میرا باپ ہے اور میرے ساتھ ہے۔ یہی خوشی تھی۔ جو آنسو بن کر اس کی آنکھوں سے ٹپک رہی تھی اور اس خوشی کے ساتھ ساتھ ایک غم بھی تھا۔

نادرہ نے واقعی سچ کہا تھا۔ یہ کسی غم اور فکر کو پاس نہ پھٹکنے دینے والا شخص آج کتنا اداس، کتنا دلگیر، کتنا پریشان اور مضطر نظر آرہا تھا

امتیاز نے بار بار اپنا سوال دھرایا، تو زلیخا نے کہا۔

'مجھے ڈالئے بھاڑ میں پہلے یہ بتایئے آپ اتنے بے حال اور دلگیر کیوں نظر آرہے ہیں؟"

ایک کھوکھلا سا قہقہہ لگایا امتیاز نے اور کہنے لگا ۔
تو بے وقوف ہے ۔ نہ میں بے حال ہوں، نہ دلگیر، اچھا خاصا ہوں
شاید تو اپنا حال مجھ سے چھپانا چاہتی ہے ۔ لیکن میں پوچھ کر رہوں گا ۔"
اس ہمدردانہ اور مشفقانہ انداز تخاطب کے بعد بھی زلیخا میں عرض
حال کی ہمت نہ ہوئی، پہلے تو وہ خاموش رہی، پھر کہنے لگی ۔
" آپ نادرہ کو بھی تو موقع نہیں دیتے، وہ بہت کچھ کہنا چاہتی ہے
آپ سے ۔"
امتیاز نے حقہ کا ایک کش لگایا اور کچھ سوچتا ہوا بولا ۔
شاید تو اپنی بات نہیں کہنا چاہتی، نادرہ کو ترجمان بنا کر اس کی زبان
سے کہلانا چاہتی ہے ۔
بھوندو ۔
بھوندو فوراً حاضر ہوا ۔ امتیاز نے کہا ۔
" نادرہ کو جا کر بھیج دو "
اور نادرہ جب آئی تو زلیخا اپنے کمرے میں واپس آگئی ۔

(۱۴)

امتیاز نے نادرہ سے مسکراتے ہوئے کہا۔
کیوں رہی، تو نے زلیخا سے کیا کہہ دیا ہے میرے بارے میں وہ بولی ”میاں میں نے تو کچھ نہیں کہا۔“
امتیاز نے کہا ”تو نے اسے میری پریشانی اور دلگیری کا جھوٹا افسانہ سنا کر کیوں پریشان کر دیا ہے۔“
وہ بولی میری زبان جھوٹ بول سکتی ہے، لیکن آنکھیں جھوٹ نہیں بول سکتیں۔“
”آنکھوں نے کیا چغلی کھائی تجھ سے؟“
میں کتنے دنوں سے آپ کی خدمت کر رہی ہوں، آپ کے دن رات میری نظر کے سامنے ہیں، میں نے کبھی اور کسی موقع پر آپ کو پریشان اور دلگیر نہیں پایا۔ کبھی نہیں۔
اب آپ کو کبھی خوش نہیں دیکھتی۔ نہ وہ قہقہے ہیں نہ چہچہے، نہ دوست احباب کی مجلس ہے، پہلے آپ کے قدم گھر میں کب ٹکتے تھے شام کی چائے پی کر نکلے، کبھی دو بجے رات کو آئے، کبھی تین بجے، کبھی نہ بھی آئے۔ مگر اب گھر سے دفتر، دفتر سے گھر، یا سرکاری کام سے دورے پر چلے گئے، جو لوگ خود سے ملنے آتے ہیں ان سے بھی کھل کر بات نہیں کرتے، انہوں نے کچھ کہا تو جواب دیا، وہ بھی مختصر

سا اور اس کے بعد حقہ پینے لگے۔ کچھ سوچنے لگے۔ وہی تو میں پوچھتی ہوں۔ کیا ہو گیا ہے آپ کو؟ کیا سوچا کرتے ہیں، آپ؟

"کیا کرے گی تو پوچھ کر؟"

"بتا دیجئے! میاں۔"

سوچتا ہوں، اب میرے مرنے کے دن قریب آ رہے ہیں۔

میاں خدا کے لئے ایسی باتیں نہ کریئے، اللہ آپ کا سایہ سر پر سلامت رکھے، آپ کو اپنے لئے نہیں، اپنی بیٹی کے لئے جینا چاہیے۔"

اور بیٹے کے لئے مر نہ جانا چاہیئے؟"

"میاں ــــ

اچھا خیر ان باتوں کو چھوڑ، یہ بتا زلیخا اتنی پریشان کیوں ہے۔ آج میں نے کافی دنوں کے بعد دیکھا اور یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ وہ تو کافی دبلی ہو گئی ہے، اس کا چہرہ اتر گیا ہے، معلوم ہوتا ہے، بدن میں خون ہی نہیں ہے۔ کیا بیمار ہے کچھ۔

"نہیں بیمار ہیں، تو ہو جائیں گی؟"

"کیوں؟ کس لئے صاف صاف کیوں نہیں کہتی

میاں یہ اسی بچی کا دم ہے کہ ایسے ایسے غم سہتی اور جھٹکے برداشت کرتی ہے پھر بھی اس کے منہ سے اف نہیں نکلتی اور گذارے چلی جا رہی ہے ــ

لیکن کیسا غم، جھٹکے کیسے۔

غم تو ظاہر ہے اسے اپنی جان ہار ماں یاد آتی ہے، بھائی یاد آتا ہے جس پر وہ جان چھڑکتی تھی، ماں کو تو خیر صبر کر لیا، بھائی، کے لئے تو آس باندھے ہوئے ہے کہ کسی نہ کسی دن واپس آئے گا۔

ہاں نادرہ وہ آئے گا، لیکن جب اس کے راستے کا کانٹا صاف ہو چکا ہوگا؟

کانٹا کیسا میاں؟

وہ کانٹا میں ہوں، جب تک میں نہیں مر جاتا، وہ اس گھر میں قدم نہیں رکھ سکتا، وہ مجھ سے نفرت کرتا ہے ۔ اور شاید اس کی نفرت جائز ہے! ۔ نادرہ کیا زلیخا مجھ سے نفرت نہیں کرتی؟"

توبہ کیجئے، میاں وہ تو ایسی لڑکی ہے نہ سانپ اور بچھو سے بھی نفرت نہیں کر سکتی ۔

ہاں میں جانتا ہوں وہ بالکل اپنی ماں پر گئی ہے، مریم کی طبیعت ہی ایسی تھی، حالانکہ یہ ہے کہ مجھ تک سے نفرت نہ کر سکی ۔ جب کبھی اسے خواب میں دیکھتا ہوں اپنے پاؤں دباتے پاتا ہوں ۔

یہ کہتے کہتے امتیاز کی آواز بھرا گئی اور آنکھیں ڈبڈبا آئیں ۔ لیکن بہت جلد اپنی کیفیت پر قابو حاصل کر لیا اور نادرہ سے سوال کیا ۔

مگر بات کیا ہے؟ ۔ نادرہ، آخر کیوں زلیخا اتنی بجھی بجھی سی رہنے لگی ہے ۔

ہمت کر کے اور حواس بجا کر کے بولی ۔

میاں ابھی میں نے کہا تھا ۔ وہ ایسی لڑکی ہے کہ سانپ بچھو تک سے نفرت نہیں کر سکتی، لیکن اب اس نے نفرت کرنا سیکھ لیا ہے؛

" (متعجب ہو کر) کس سے نفرت کرتی ہے وہ؟ ۔ میرے سوا اس سارے گھر میں اور کون اس قابل ہے کہ اس سے نفرت کی جائے"

پھر وہی میاں ۔ بھلا وہ آپ سے نفرت کر سکتی ہے جب کہ

آپ اسے چاہنے بھی لگے ہیں ۔ اگر آپ کی محبت کا سہارا مل گیا ہوتا تو وہ کب دق میں مبتلا ہو کر مر گئی ہوتی؟"

امتیاز نے حقہ الگ ہٹاتے ہوئے پوچھا ۔

" وہ دق میں مبتلا ہو کر مر گئی ہوتی؟"

" جی میاں ۔ قسم لے لیجئے جو ذرا جھوٹ ہو اس میں!"

" لیکن کوئی سبب بھی تو ہوگا اس کا ۔"

" اور کیا بے سبب ؟ ۔ آج مجھ سے کہہ رہی تھی نادرہ کیا مجھے دوسرے گھر میں پناہ نہیں مل سکتی ؟"

" پناہ ؟ ۔ کیا میری لڑکی کو، میری زندگی میں پناہ کی ضرورت کیا کوئی اسے پریشان کرتا ہے ؟"

" سارا گھر ؟ "

" گھر کے درودیوار یا لوگ ۔؟"

" درودیوار کیوں ؟ لوگ

(ڈپٹ کر) وہ کون لوگ ہیں، نام تو بتاؤ مجھے ان کے ؟"

لیکن بتانا آسان نہ تھا وہ جواب نہ دے سکی، خاموش ہو گئی۔ امتیاز نے اور زیادہ برہم ہو کر کہا ۔ نام بتاؤ ـــــ

نادرہ نے اپنی ہمت کے بکھرے ہوئے شیرازے کو مجتمع کیا اور بولی وہ ہیں اس کی چچی کلثوم بیگم، وہ ہے اس کی چچا زاد بہن نسیم ـــ اور وہ ہیں احراز میاں جنہیں سب کچھ معلوم ہے، لیکن کسی کو نہیں روکتے، کسی کو نہیں سمجھاتے کہ ایک بن ماں کی بے سہارا لڑکی کو نہ ستاؤ کہ خدا کا غضب ٹوٹ پڑے ۔ اور امتیاز کے کسی مزید سوال کئے بغیر نادرہ نے سارے واقعات از اول تا آخر فر فر آموختہ کی طرح سنا دیئے اور پھر پوچھا ۔ کیا ان لوگوں سے ان کی نفرت حق بجانب نہیں ہے ؟

(۱۵)

نادرہ کی باتیں سننے کے بعد امتیاز پر اضطراب و اضطرار کی کیفیت طاری ہوگئی، اس نے پہلو بدلتے ہوئے کہا ۔

واقعی میں نے اپنے بچوں پر بہت ظلم کیا ہے۔ واقعی میں نے مریم کے ساتھ زیادتی کی ۔

" وہ بولی " وہ تو جو کچھ ہونا تھا ہوچکا۔ سوال یہ ہے کہ اب کیا کیا جائے آخر کب تک زلیخا تلوار کی دھار پر زندگی بسر کرتی رہے گی ؟"

سچ کہتی ہو۔ میں اس کا بندوبست کروں گا ؟"

لیکن کب بندوبست کریں گے آپ ؟ - کیا جب وہ نصیب دشمناں بستر سے لگ جائے گی ؟"

بار بار یہ نہ کہو وہ کیوں بستر لگنے لگی ، اس نے ابھی دنیا کا دیکھا کیا ہے ؟

" یہی تو میں بھی کہتی ہوں "

" بستر پر لگنے کا میرا زمانہ ہے ؟"

میاں سب کچھ کہئے ، مگر خدا کے لئے اس طرح کی باتیں نہ کہیئے نادرہ — جیسے میرے کان میں کوئی کہتا رہتا ہے ۔ اب کوچ کا وقت آگیا ، پہلے کوئی ہولے ہولے دھیرے دھیرے مجھے پکارتا رہتا ہے کہ آؤ جیسے —

(روتے ہوئے) میاں ——

ہاں نادرہ، مجھے مریم بلاتی رہتی ہے میں اس کی آواز پہچانتا ہوں اس کی صورت پہچانتا ہوں، میں نے کبھی اس کی کوئی بات نہیں مانی لیکن اس بات کو رد نہیں کر سکتا مجھے اس کے پاس جانا پڑے گا۔ میں نے اس کی قدر نہ کی؛ میں نے اسے کبھی منہ نہ لگایا۔ میں اسے ہمیشہ اسے ذلیل کرتا رہا، میں نے اپنا سارا وقت گھوڑوں میں، عیاشیوں میں صرف کیا، میں نے کبھی اس کی پرواہ نہ کی لیکن نادرہ وہ ہمیشہ مجھ سے محبت کرتی رہی وہ میرے ہر روپ میں مجھ سے محبت کرتی رہی، وہ میری تمام خطائیں معاف کرتی رہی، دیکھ تو۔ اسے وہاں بھی چین نہیں ہے۔ وہ اب بھی جنت کی راحتیں اور لذتیں چھوڑ کر ہر روز میرے پاس آتی ہے۔ میرے پاؤں دباتی ہے میرے سامنے دستر خوان بچھاتی ہے میں کھانا شروع کرتا ہوں تو وہ پنکھا جھلنے لگتی ہے میں کھانا شروع کرتا ہوں تو لپک کر ٹھنڈے پانی سے بھرا ہوا۔ گلاس سامنے لا کر رکھ دیتی ہے، نادرہ وہ اب بھی مجھے چاہتی ہے اب بھی میرا خیال رکھتی ہے، اب بھی جنت سے گھبرا گھبرا کر میرے پاس چلی آتی ہے تم سمجھتی ہو میں انسان نہیں ہوں؛ میرے سینہ میں دل نہیں ہے۔ پتھر پر پانی پڑتا رہتا ہے تو اس کو گھس ڈالتا ہے، میرے پتھر جیسے دل پر اس کی محبت کی لگاتار بارش ہو رہی ہے، وہ کہاں تک موم نہ ہو گا، لیکن نادرہ یہ باتیں زلیخا کو نہ بتانا اور اعجاز کو تو ہر گز نہیں میرے مرنے کے بعد بھی نہیں، وہ خود سر ہے، باغی ہے، سرکش ہے مجھ سے نفرت کرتا ہے، مجھے حقیر سمجھتا ہے، اگر اسے کبھی یہ معلوم ہوا کہ مریم سے محبت کرنے لگا تھا، میں اس سے محبت کرتا کرتا اس دنیا سے رخصت ہوا تو وہ اسے میری کمزوری پر محمول کرے گا۔ وہ سمجھے گا، اس کی اکڑ نے مجھے جھکا دیا

اور میں —— اور میں۔ نادرہ تو جواب دے کیا میں جھک سکتا ہوں؟ کیا میں دب سکتا ہوں، کیا مجھ سے کوئی بات منوائی جا سکتی ہے (بلند آواز سے) کیا۔ تو یہ سمجھتی ہے، میں اعجاز سے ڈر جاؤں گا؟

"نہیں — ہرگز نہیں،"

اور یہ کہہ کر امتیاز نے اس طرح خم کھایا، جیسے اس کے سامنے اعجاز بیٹھا ہے وہ اس کے منہ پر طمانچہ مارنے والا ہے۔

نادرہ سہم کر پیچھے ہٹ گئی، کہنے لگی۔

"میاں کی بات — بھلا ایسا بھی ہو سکتا ہے کبھی!"

امتیاز پھر سنبھل کر بیٹھ گیا، اس کی طبیعت کسی حد تک مائل بہ سکون ہو گئی، وہ کہنے لگا۔

"لیکن میں اسے اس کے حق سے محروم نہیں کروں گا اور مرنے سے پہلے زلیخا کا بھی کوئی بندوبست کر جاؤں گا، مجھے تو اس کے وجود میں مریم کا جلوہ نظر آتا ہے، کیوں نادرہ، وہ بالکل مریم ہے یا نہیں؟"

بالکل میاں — ہوبہو۔ نوجوانی میں وہ بھی بالکل ایسی ہی ہوں گی۔

تو زلیخا کا دل رکھ، اسے تسلی دے، جو کچھ میں نے کہا ہے، اسے اپنے ہی تک رکھیو، یہ لوگ جو کچھ کر رہے ہیں کرنے دے، لیکن زلیخا کو ہراساں نہ ہونے دے — وقت کا انتظار کر۔

۞

آدمی

(۱)

بہت جلد اعجاز نے گورنمنٹ کالج میں نمایاں حیثیت اختیار کرلی ذہانت، ذکاوت اور عادات کے اعتبار سے وہ سکول میں بھی نمایاں اور ممتاز حیثیت رکھتا تھا، یہاں آکر اس کے جوہر اور چمک گئے۔

کالج میں ڈبیٹنگ سوسائٹی کا رواں تھا۔ بڑی شستہ اور رواں تقریر کرتا تھا، کئی مرتبہ اس نے انعامات بھی حاصل کئے۔ کالج کے میگزین میں اس کے مضامین شائع ہوتے تھے اور بہت پسند کئے جاتے تھے تھوڑے ہی دنوں کے بعد پرنسپل صاحب نے اسے ایڈیٹری تفویض کردی کرکٹ سے بھی اسے غیر معمولی دلچسپی تھی گو وہ میچوں میں کم حصہ لیتا، لیکن جب بھی شریک ہوتا۔ تماشائیوں اور فن کاروں سے داد حاصل کرتا، ویسے بھی بڑا حاضر جواب، بذلہ سنج اور شگفتہ طبع تھا اور اب اس نئے ماحول میں تو وہ ماضی کی تلخیوں کو فراموش کرکے یکسر انبساط و مسرت کی زندگی بسر کررہا تھا۔ البتہ ایک کھٹک تھی دل میں ماں کے پیار، باپ کے ظلم، اہل خاندان سے وہ ترک تعلق کرہی چکا تھا۔ اور ماں کا غم تو بیشک جان کے ساتھ ساتھ تھا، ہر نماز کے بعد وہ اس کے لئے دعائے مغفرت کرتا تھا ہر روز تلاوت قرآن کریم کے بعد جب دعا مانگتا، تو مریم اسے ضرور یاد آتی اور وہ پڑھا ہوا سب کچھ اسے بخش دیتا۔ اس کے اخلاق و اطوار

اور گفتار و کردار سے اساتذہ بھی متاثر تھے اور طلبا بھی، وہ استادوں میں بھی مقبول تھا، وہ کسی دل نہیں دکھاتا تھا، سب کے کام آتا تھا، کسی کی بدخواہی نہیں کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی، کہ سب اس پر جان و دل سے فریفتہ تھے۔

فیض آباد میں شروع شروع کے چند دن بڑے سخت گزرے وہ آدمیوں سے بھڑکتا تھا، گھر سے صرف نفرت کا توشہ لے کر آیا تھا۔ بس یہی پونجی تھی، جو اس کے ساتھ تھی، وہ ہر شخص کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھتا تھا، کسی شخص کے بارے میں بھی ٹھیک رائے نہیں رکھتا تھا، ہر آدمی کے انداز و اطوار اور صورت و سیرت میں اسے یا امتیاز کا جلوہ نظر آتا تھا، یا اعزاز کا لئیق نے اسے راہ پر لانے کی بہت کوشش کی۔ مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ اس کی مردم بیزاری اور خلوت نشینی کو چھڑا نہ سکا بہت جلد اسٹیشن ماسٹر صاحب مسٹر خلیق نے اس کی ذہنی کیفیت بھانپ لی، کرید اور جستجو سے احتراز کیا۔ کبھی نہیں پوچھا تم اتنے مردم بیزار کیوں ہو، خلوت نشینی میں کیا لذت ملتی ہے؟ ہر شخص کو شک و شبہ کی نظر سے کیوں دیکھتے ہو، لیکن اپنے طور طریقوں سے اس کی اصلاح شروع کر دی اور رفتہ رفتہ اسے اچھا آدمی بنا دیا۔ وہ یہ تو نہ کر سکے کہ اس کے دل سے باپ اور خاندان کی نفرت کھرچ سکتے اور شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اصل حالات سے لاعلم تھے، لیکن اس کی وہ بھڑک نکال دی جس نے اسے مردم بیزار بنا دیا تھا۔

اور یہ خلیق صاحب ظاہر میں صرف اسٹیشن ماسٹر تھے انہیں دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا۔ کہ وہ درحقیقت اتنے بلند پایہ انسان ہو سکتے ہیں ان کی آمدنی کا بڑا حصہ دوسرے لوگوں کی امداد و اعانت میں صرف ہو جاتا تھا۔ ہر روز لوگوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ یہ آیا وہ گیا اور اعجاز تو مستقل طور

پر ان کا مہمان تھا، اس کی ضروریات کا وہ اتنا ہی خیال رکھتے تھے، جتنا لئیق کا اور اس کی ضروریات کا اس نے بار بار چاہا کہ کہیں اٹھ جائے یا کھانے پینے کا کسی اور جگہ بندوبست کرے یا بورڈنگ میں منتقل ہو جائے

کیونکہ اس کی غیرت گوارا نہیں کرتی تھی کہ مفت میں روٹیاں توڑتا رہے لیکن خلیق صاحب کی باتوں میں جادو کا اثر تھا انہوں نے اس طرح کی اس کی ہر تجویز ٹھکرا دی اور وہ نہ کوئی احتجاج کر سکا۔ نہ نافرمانی کی جرأت کر سکا۔ ضرور تھا۔ کہ اپنے طور پر اپنی خوشی سے بلکہ اصرار سے ان کے چھوٹے بچوں کو پڑھا دیا کرتا تھا۔ لیکن اس محنت کو اس احسان کا معاوضہ یا بدلہ سمجھنے پر وہ ہرگز تیار نہ تھا، جس کی بارش متواتر اور مسلسل اس کے اوپر ہو رہی تھی۔

خلیق صاحب نصیحت کا دفتر کھول کر نہیں بیٹھتے تھے، کسی غلطی پر برا بھلا کہنا تو بڑی چیز ہے اس کو کچھ کہتے بھی نہیں تھے، لیکن اپنے عمل سے مثال ایسی پیش کرتے تھے، کہ آدمی ایک طرف تو ان کی بلندی کردار کا قائل ہو جاتا تھا۔ دوسری طرف خود اپنے دل کو ٹٹولنے پر مجبور ہو جایا کرتا تھا۔

زبان سے کچھ کہے بغیر، تلقین و نصیحت کے بغیر رفتہ رفتہ انہوں نے اس کی بہت سی خامیاں دور کر دیں اور سب سے بڑی یہ خامی دور کر دی کہ اب وہ اپنے دوستوں، ساتھیوں اور رفیقوں میں اجنبی اور نامانوس نہیں تھا۔ اب وہ ان سے بھڑکتا نہیں تھا۔ اب وہ انہیں شک و شبہ اور نفرت و بیزاری کی نگاہ سے نہیں دیکھتا تھا۔ اب اس میں خود اعتمادی پیدا ہو گئی تھی۔ عفو و درگذر کا جوہر آشکارا ہونے لگا تھا۔

اب وہ لوگوں کی غلطیوں سے درگزر کرنا بھی سیکھتا جا رہا تھا اور اس کیفیت نے اسے ایک نئی قسم کی مسرت عطا کی تھی۔ دل پر ہر وقت جو ایک بوجھ سا رہتا تھا۔ وہ اتر گیا تھا۔ ہر وقت جلن اور کڑھن کی جو کیفیت طاری رہتی وہ جاتی رہی، تو اب وہ دوسروں کے متعلق بہت کم سوچتا تھا۔ زیادہ تر اپنے بارے میں سوچتا رہتا تھا۔

❂

(۲)

اور یہ خلیق صاحب؟

یہ خلیق صاحب واقعی عجیب و غریب شخص تھے، ان کے ظاہری طور طریقے، وضع قطع، آداب و شمائل دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ شخص بڑا پہنچا ہوا ہے۔ یہ دلی ہے اس کا شمار اہل اللہ میں ہونا چاہیے۔ وہ دنیا میں رہتے تھے، اور دنیا داروں کی سی زندگی بسر کرتے تھے، لیکن ان کا دل واقعی ایک خدا رسیدہ شخص کا دل تھا، ایک پاک نہاد، پاک سرشت اور پاک ضمیر شخص کا دل۔

یہ خلیق صاحب، کسی کے بدخواہ نہیں تھے، کسی کی برائی میں شریک نہیں تھے، کسی کا نقصان نہیں چاہتے تھے، یہ دشمنوں کے دوست تھے اور دوستوں کے فدائی، اعجاز ان کی زندگی میں یہ مناظر دیکھتا اور غیر محسوس طور پر متاثر ہوا کرتا تھا۔ جب کبھی تنہائی میں اسے سوچنے کا موقع ملتا وہ خلیق صاحب کے بارے میں یہ سوچ سوچ کر محو حیرت ہو جاتا تھا کہ یہ شخص کس مٹی کا بنا ہے، اس کا دل ہمالیہ پہاڑ سے اونچا، سمندر سے زیادہ گہرا اور عالم کائنات سے زیادہ وسیع ہے؟ اس کے مشرب میں کسی کو برا سمجھنا کفر ہے۔ اس کا مذہب یہ ہے کہ سب کی بھلائی چاہو، ان کی بھلائی کے بھی جو یا رہو، جو تمہیں اذیت دیں، دکھ پہنچائیں، درپے آزار ہوں۔

اور ایک روز ایسا واقعہ پیش آیا۔ جس نے اعجاز کی کائنات دل میں ایک تہلکہ اور زلزلہ برپا کر دیا۔ اس کا سر جو صرف اکڑنا جانتا تھا۔ جھکنا نہ جانتا تھا۔ ان کی بارگاہ میں جھک گیا۔ اس کا جی چاہا اس شخص کے قدموں پر سر رکھ دے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس کا بندہ بے دام بن جائے۔

جس طرح خلیق صاحب کا حلقۂ احباب وسیع تھا۔ اسی طرح ان کے خدا واسطے کے دشمنوں کی بھی کمی نہ تھی، یہ وہ لوگ تھے جو ان سے ناجائز فائدے اٹھانا چاہتے تھے مگر انہیں مایوس ہونا پڑتا تھا خلیق صاحب دوستوں اور واقف کاروں کے لئے کسی ذاتی ایثار سے دریغ نہیں کرتے تھے، لیکن انصاف اور دیانت کے تقاضوں کے خلاف وہ اپنے لئے بھی اپنی اولاد کے لئے بھی کچھ کرنے کو تیار نہیں تھے، ان کی یہ خوبی جن لوگوں کو برائی نظر آتی تھی وہ دشمنی پر کمر باندھ لیتے تھے اور درپے آزار ہو جاتے تھے۔

انہی لوگوں میں ایک صاحب مسٹر اکرام بھی تھے انہیں خلیق صاحب سے کئی شکائیتیں تھیں اور سب بڑی شکایت یہ تھی کہ انہوں نے اسمبلی کے انتخاب میں اس امیدوار کو ووٹ نہیں دیا جس کے اکرام صاحب مددگار بنے ہوئے تھے یہ ایک سرمایہ دار شخص تھا۔ اور ووٹ خرید کر ممبر بننے کا عادی تھا۔ اس کی طرف سے اکرام نے خلیق صاحب کا ووٹ بھی خریدنا چاہا۔ لیکن انہوں نے صاف انکار کر دیا۔

میں ایسے شخص کو کس طرح ووٹ دے سکتا ہوں جسے قوم سے زیادہ اپنی فکر ہے جو اپنی سربلندی کے لئے پارٹیاں بدلنے کا عادی ہے جو اپنے مفاد کی خاطر ملک اور قومی مفاد کو ہمیشہ ٹھکراتا رہا ہے، جو مزدوروں کا خون چوستا ہے اور عوام کی جیب پر ڈاکہ ڈالتا ہے نہیں اکرام صاحب مجھے معاف کیجئے۔ میں ایسے شخص کو ووٹ دینا معصیت کبیرہ سمجھتا ہوں میں اسے ہرگز ووٹ نہیں دے سکتا!"

اکرام نے ہر طرح خلیق صاحب کو راہ راست پر لانے کی کوشش کی لالچ دیا۔۔۔ عہدے میں ترقی ہو جائے گی۔۔۔ اس کی مخالفت کرو گے تو برخاست کروا دیئے جاؤ گے۔ نشیب و فراز سمجھائے۔۔۔ اپنا خیال نہیں کرتے تو اپنی اولاد کا خیال کرو۔۔۔ لیکن زمین جنبد نہ جنبد گل محمد، خلیق کی نہیں۔ چٹان کی طرح اپنی جگہ قائم رہی۔

وہ سرمایہ دار منتخب ہو گیا اور خلیق صاحب کی واقعی شامت آگئی۔ حکام بالا کو ان کے خلاف درخواستیں پہنچنے لگیں، ہینڈ بل اور پوسٹر شائع کئے گئے۔ گمنام خطوط) وہ بھی نہایت گندے قسم کے ڈاک میں ڈالے جانے لگے، سب جانتے تھے۔ یہ حرکت اکرام کی ہے۔ سب کا مشورہ تھا کہ اس کے خلاف ضروری کارروائی کی جائے۔ لیکن وہ ہنس کر ٹال جاتے تھے۔

لیکن زمانہ بدلتے دیر نہیں لگتی، اکرام صاحب سے ان کے آقائے ولی نعمت کسی بات پر خفا ہو گئے۔ بات معمولی تھی "وہی" گاہے بہ سلامے برنجند و گاہے بہ دشنامے خلعت دہند" والی بات لیکن اکرام صاحب کا روزگار چھن گیا۔ جو آمدنی تھی وہ بند ہو گئی۔ جمع جتھا کچھ تھا نہیں فاقے کی حد تک نوبت پہنچ گئی۔ دوستوں نے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ عزیزوں نے بات نہ پوچھی، جن مجلسوں میں ہر وقت جلوہ فرما رہتے تھے۔ اب وہاں کوئی ایک منٹ بٹھانے کا روادار نہ تھا۔ مصیبت جب آتی ہے تو تنہا نہیں آتی ایک یہ بے روزگاری کیا کم سوہان روح تھی۔ دوسری طرف

بیمار پڑے اور ایسے کہ اب مرے اور اب مرے، دوا علاج تک کے لئے ایک پیسہ کے محتاج ہو گئے۔

یہ اطلاع خلیق صاحب کو بھی مل گئی وہ فوراً عیادت کے لئے گئے اور اس طرح باتیں کرتے رہے، گویا کسی قسم کی کوئی تلخی تھی ہی نہیں، گویا آپس میں کوئی اختلاف پیدا ہوا ہی نہیں تھا۔

خلیق صاحب بیٹھے تھے کہ اکرام صاحب کا لڑکا آیا اور اس نے کہا۔

پاپولر میڈیکل ہال نے دوا دینے سے انکار کر دیا ہے، وہ کہتے ہیں پچھلے سوا دو سو روپے پہلے لے آؤ، پھر نیا حساب چلے گا؟"

یہ سن کر اکرام کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ بے بسی کے ساتھ انہوں نے آسمان کی طرف دیکھا۔ پھر آہستہ سے کہا۔

تو بیٹا نسخہ پھاڑ کر پھینک دو ——

اور یہ کہتے کہتے آنسو کے دو بڑے بڑے قطرے آنکھوں سے ڈھلک کر گال پر آگرے۔

خلیق صاحب اس منظر کی تاب نہ لا سکے، انہوں نے لڑکے کا ہاتھ پکڑا اور کہا۔

"میرے پاپولر والوں سے تعلقات ہیں، چلو میں دلوا دیتا ہوں!"

خلیق صاحب کے پاپولر والوں سے کوئی تعلقات نہیں تھے، وہ اکرام کے لڑکے کو لے کر اپنے گھر آئے اور پانچسو روپے اس کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے بولے۔

"بیٹے یہ روپے لے جاؤ پاپولر والوں کا بل ادا کر دو، باقی رقم گھر کے کام میں لاؤ۔ اکرام سے کہہ دینا، میں ان کا صرف دوست ہی نہیں بھائی بھی ہوں۔"

لڑکے نے ممنون نظروں سے خلیق کو دیکھا اور چلا گیا۔

جب تک اکرام صاحب زندہ رہے خلیق صاحب ہر مہینہ معقول رقم سے ان کی خدمت کرتے رہے اور جب مر گئے تو پچاس روپے مہینہ مستقل طور پر ان کی بیوی کو ہر مہینہ کی پہلی تاریخ کو ادا کرنے لگے۔

اس واقعہ کا علم کسی کو نہیں تھا۔ گھر والوں کو بھی نہیں، اتفاق کی بات اکرام کے لڑکے سے ایک مرتبہ کہیں اعجاز کی ملاقات کسی میچ میں ہو گئی باتوں باتوں میں اس نے اعجاز سے پوچھا۔

"آپ کا قیام کہاں ہے؟ — کیا بورڈنگ میں؟"

اعجاز نے بتایا "میں خلیق صاحب کے ہاں رہتا ہوں۔"

وہ کہنے لگا " خلیق صاحب ؟ — یعنی اسٹیشن ماسٹر صاحب ؟"

اعجاز نے اثبات میں جواب دیا۔ پھر جو اس نے خلیق صاحب کی تعریفوں کے پل باندھے ہیں تو لطف آگیا اعجاز کو، اس نے کہا۔

" آپ تو ان کی شان میں شاعری کر رہے ہیں !"

اعجاز صاحب میں کہتا ہوں خلیق صاحب انسان نہیں فرشتہ ہیں۔ ان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو ہماری مصیبت پر خوش ہوتا، ہنستا لیکن انہوں نے ہمارے ساتھ وہ سلوک کیا جو ہمارے عزیزوں نے بھی نہیں کیا۔"

اور پھر اس نے ساری کہانی سنا دی۔

(۴)

اعجاز کو کرکٹ سے بہت دلچسپی تھی۔ بس یہی ایک چیز تھی جس میں وہ پوری دلچسپی سے حصہ لیتا تھا۔ یہ اس کی تفریح بھی تھی اور ورزش بھی۔

ایک مرتبہ گورنمنٹ کالج کی ٹیم کا ایک دوسرے کالج کی ٹیم سے مقابلہ تھا۔ اعجاز نے بھی اس میچ میں حصہ لیا اور خوب خوب رن بنائے۔

لیکن کھیل ختم ہونے سے ذرا پہلے حریف مقابل کا پھینکا ہوا۔ گیند پوری قوت اور شدت کے ساتھ اس کے ماتھے پر آکر لگا، خون جاری ہو گیا آدمی جی دار اور باہمت تھا۔ ضبط کرتا رہا اور پٹی باندھ کر ساتھیوں اور کپتان کے منع کرنے کے باوجود پھر کھیل میں شریک ہو گیا۔

گورنمنٹ کالج کی ٹیم نے مخالف ٹیم کو شکست فاش دی، اس کارنامہ میں اعجاز کا حصہ سب سے زیادہ تھا، مبارکباد اور تحسین و تعریف کا غلغلہ برپا ہو گیا۔

گھر پہنچا تو ماتھے پر پٹی بندھی دیکھ کر خلیق صاحب نے پوچھا۔

"بیٹے یہ کیا ــ؟"

خلیق نے ٹالتے ہوئے کہا، جی کچھ نہیں، آج میچ میں کھیلتے وقت ذرا چوٹ آگئی تھی۔

خلیق صاحب نے پٹی کھول کر دیکھی تو اچھا خاصا زخم تھا، اور اس سے اب تک خون رس رہا تھا۔ نبض پر ہاتھ رکھا، تو تیز بخار موجود

اسی وقت ڈاکٹر بلایا گیا۔ اس نے مرہم پٹی کی، انجکشن لگایا۔ نسخہ لکھا گیا اور چلا گیا۔ خلیق صاحب نے پوچھا۔

"تشویش کی تو کوئی بات نہیں ہے؟"

ڈاکٹر نے اطمینان دلایا۔ "نہیں تشویش کی کیا بات ہوتی صبح تک ٹھیک ہو جائیں گے!"

لیکن جب صبح ہوئی تو معلوم ہوا بخار ۱۰۵ سے زیادہ ہے اور اعجاز پر ہذیانی کیفیت طاری ہے۔

خلیق صاحب نے فوراً اسے ہسپتال پہنچایا، یہاں کئی ڈاکٹر ایسے تھے جو ان سے واقف تھے اور ان کی عزت کرتے تھے، سب نے بڑی توجہ سے اس کا معائنہ کیا۔ ڈاکٹر ظفر الحسن نے کہا۔

خون کافی نکل گیا ہے اور کچھ سمیت بھی پیدا ہو گئی ہے آپ نے یہاں لانے میں دیر کی جیسے ہی مریض زخمی ہوا تھا۔ فوراً لانا چاہیے تھا۔ مریض کو نئے خون کی ضرورت ہے۔ دیکھئے ہم ٹسٹ کرتے ہیں؟"

ٹسٹ کا نتیجہ یہ نکلا کہ جو خون درکار تھا۔ وہ موجود نہیں تھا۔

باپ کا اشارہ پا کر لئیق نے اپنے آپ کو پیش کیا۔ لیکن اس کا خون مریض کے لئے بیکار تھا، اور مریض کی حالت دم بدم نازک ہوتی جا رہی تھی۔ آخر خلیق صاحب نے اپنا بازو آگے کر دیا۔

"ذرا دیکھئے تو سہی!"

خلیق صاحب کا خون لیا گیا اور وہ وہی تھا۔ جس کی ضرورت تھی لیکن ڈاکٹر ظفر الحسن نے کہا۔

آپ ویسے ہی بوڑھے اور کمزور ہیں۔ آپ کا خون لینا مناسب نہیں خلیق صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

ڈاکٹر صاحب آپ بھی کیا باتیں کرتے ہیں، بوڑھے زندہ رہیں اور جوان مر جائیں۔ کوئی تک ہے یہ؟۔ اور آپ مجھے بوڑھا کیوں سمجھتے ہیں؟ میں تو اپنے آپ کو جوانوں سے زیادہ چونچال اور توانا محسوس کرتا ہوں۔ دیر نہ کیجئے

جتنا خون درکار ہو فوراً لے لیجئے۔

خلیق صاحب کا خون لیا گیا اور انجکشن کے ذریعہ مریض کے جسم میں داخل کر دیا گیا۔ اس کا حیرت انگیز اثر ہوا۔ اس کی توانائی فوراً عود کر آئی اور ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے یہ کہا۔

"اب کوئی خطرہ نہیں مریض تندرست ہو جائے گا۔"

اعجاز تو واقعی چند روز ہسپتال میں لوٹ پوٹ کر خیریت کے ساتھ واپس آگیا، لیکن خلیق صاحب کافی خون نکلوا دینے کے باعث امراض گوناگوں میں مبتلا ہو گئے، اور کئی ہفتے صاحب فراش رہے۔

اعجاز کو جب یہ واقعہ معلوم ہوا۔ تو اس نے زبان سے تو کچھ نہ کہا، لیکن ایک مرتبہ پھر وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا۔

یہ شخص آدمی ہے یا فرشتہ۔

(۵)

اب وہ صحت یاب ہو گیا تھا۔ لیکن کمزوری ابھی باقی تھی۔ ایک روز خلیق نے اس سے اصرار کیا۔

جاؤ ڈاکٹر ظفر الحسن سے ایک مرتبہ پھر معائنہ کرالو، کافی کمزوری معلوم ہوتی ہے وہ کوئی ٹانک لکھ دیں گے،

حکومت اور کالج کی طرف سے جو وظیفہ ملتا تھا، وہ سب کا سب بچ جاتا۔ یہ خلیق صاحب اسے اپنے پاس سے کچھ بھی تو خرچ نہیں کرنے دیتے تھے، حد یہ ہے، کہ دوا علاج اور ملبوسات تک کے تمام مصارف وہی برداشت کرتے تھے، اعجاز، غیور اور خود دار قسم کا نوجوان تھا اس کی طبع حساس ان عنایتوں پر کڑھتی تھی لیکن خلیق صاحب کے اصرار میں اور ارشاد میں کچھ ایسی قوت پنہاں تھی کہ خاموش ہو جاتا تھا۔ کہ کم از کم دوا علاج کے مصارف خود برداشت کرے، لیکن خلیق صاحب کے سامنے اس کی کیا چل سکتی تھی۔ ایک بے بس معمول کی طرح ڈاکٹر صاحب کے مطب میں پہنچ گیا۔

اتفاق سے اس وقت ڈاکٹر صاحب کچھ فارغ تھے۔ مریضوں کا ہجوم چھٹ چکا تھا۔ اعجاز کو دیکھتے ہی بڑے اخلاق اور تپاک سے گویا ہوئے:۔

آؤ میاں اعجاز — کہو کیا حال ہے۔"

وہ ڈاکٹر صاحب کے قریب بیٹھ گیا اور کہنے لگا۔

میں تو اچھا ہوں، لیکن بابا — گھر کے سب لوگ خلیق کو بابا کہتے تھے۔ کا خیال ہے، کمزور ہوں، انہوں نے کہا ہے کہ آپ کوئی ٹانک لکھا لاؤں۔

ڈاکٹر صاحب زور سے ہنسے۔ پھر فرمایا۔

خیر ٹانک لکھے دیتا ہوں، ویسے اب تم اچھے ہو لیکن میاں شکر کرو کہ بچ گئے، غضب خدا کا، اتنا بڑا زخم، اتنی زیادہ مقدار میں جریان خون اور آپ اس کے بعد بھی پٹی باندھ کر کھیلنے لگے، اور ساری رات یوں ہی گزار دی، اگر خون نہ مل جاتا، تو گئے تھے۔

ڈاکٹر صاحب کی صداقت کا اعجاز کو یقین تھا، کہنے لگا۔

بجا ارشاد ہوا — اور یہ خون بھی بابا ہی نے دیا۔

ڈاکٹر صاحب اس وقت موڈ میں تھے۔

" فرمایا۔"

بھئی یہ مرد جسے تم بابا کہتے ہو عجیب شخص ہے۔ دوسروں کے لئے اپنی جان قربان کرنے کو ہمہ وقت تیار رہتا ہے۔ اس عمر میں اتنا کافی خون ہنستے ہنستے اور مسکراتے مسکراتے نکلوا دینا اسی کا کام تھا۔

: جی بے شک — ان کا یہ اتنا بڑا احسان ہے کہ میں ساری زندگی —

ہاں تو ساری زندگی نہیں بھولو گے، لیکن میاں صاحب زادے خلیق کے ممنون احسان تم ہی نہیں ہو، نہ جانے کس کس پر اس نے

احسان کیا ہے، خاموشی سے چپ چپاتے، اس طرح کہ شاید خود اپنے کو بھی خبر نہیں ہونے دی۔

اور یہ سلوک دوستوں اور عزیزوں ہی کے ساتھ نہیں ہے سب

کے ساتھ ہے، اس میں نہ دوست کا سوال ہے، نہ دشمن کا نہ اپنے
کا، نہ غیر کا۔
اور پھر جیسے یاد آگیا، کہنے لگے۔
تمہیں ایک واقعہ سناؤں! سنو گے! یقین کرو گے۔

(۶)

اعجاز اپنے جذبہ اشتیاق کو دبا نہ سکا، کہنے لگا۔
ضرور فرمایئے، اور یقین کیوں نہ کروں گا، بھلا آپ غلط بیانی کر سکتے ہیں۔
ڈاکٹر صاحب پان کے بہت شوقین تھے، ایک خوبصورت سی ڈبیہ میں لکھنؤی قسم کے بیڑے ہر وقت کافی تعداد میں موجود رہتے ایک اٹھا کر منہ میں رکھا۔ پھر فرمایا۔
بہت دنوں کی بات ہے، آج سے ۳۰، ۳۵ برس پہلے کی بات ــ
یہ قصہ ہے جب کا کہ آتش جواں تھا۔
جی چاہا بمبئی کی سیر کریں۔ جسے بجا طور پر عروس البلاد کہا جا سکتا ہے گئے اور ایک اوسط درجہ کے ہوٹل میں ٹھہر گئے۔ صبح ناشتہ کر کے نکلے اور رات کو گھوم گھام کر کبھی گیارہ بجے آئے کبھی بارہ بجے کبھی اس کے بعد بھی۔
خوب اچھی طرح سارے شہر کی سیر کر ڈالی، کوئی گوشہ اور کونہ ایسا نہیں تھا۔ جو ہماری نظر سے رہ گیا ہو گا، تاج محل ہوٹل دیکھا بینڈ اسٹینڈ دیکھا، جو پارٹی کی سیر، اپالو بندر کا نظارہ کیا جامع مسجد دیکھی، یونیورسٹی اور کالج دیکھے، ہائی کورٹ کی شاندار عمارت دیکھی، کالا گھوڑ دیکھا، عجائب خانہ کے نوادرات دیکھے، مالا بار ہل کا دیدار کیا۔ ماہم میں حضرت مخدوم صاحب کی

درگاہ کی زیارت کی، لوگوں سے ملے، ان کے طور طریقے دیکھے، ہمیں اپنے رنگ میں فرد، خوبے اپنا جواب آپ، بوہروں کی انفرادیت ہر چیز سے عیاں مرہٹوں کا کیا کہنا، سب سے الگ اور سب سے ممتاز۔ گجراتیوں کا سبھاؤ اور انداز ایک مخصوص شان دلفریبی کا حامل اور پارسی۔ ساغر کو میرے ہاتھ سے لینا کہ چلا ہیں۔

ڈاکٹر صاحب اس وقت ترنگ میں تھے، جیسے ان کی روٹھی ہوئی جوانی واپس آگئی تھی، جیسے ماضی حال بن گیا تھا۔ اور وہ آج سے ۳۵ برس پہلے کی دنیا میں پہنچ گئے، کچھ دیر خاموش رہے، پھر کہنے لگے۔

اب بمبئی سے واپسی کا پروگرام بنا جس روز ہم جانے والے تھے اس سے ایک دن پہلے ایک دوست نے کہا۔

یار سب کچھ دیکھ لیا تم لوگوں نے مگر جوہو نہیں دیکھا۔

ہم دونوں بالکل نہیں جانتے تھے جوہو کیا بلا ہے اس نے کہا۔ بہت کچھ دیکھ، اب کچھ نہیں دیکھنا ہے!"

ان دوست کا اصرار قائم رہا کہنے لگے۔

"اگر جوہو نہ دیکھا، تو کیا دیکھا؟ تف ہے تمہارے شوق سیاحت پر!"

"۔ جوہو دیکھیں گے اور ضرور دیکھیں گے؟"

بے چارہ دوست آدمی ٹھہرا، مان گیا، کہنے لگا۔

"اچھا صاحب دیکھیں گے اور ضرور دیکھیں گے۔ لیکن یہاں سے بہر حال روانہ ہو جانا ہے؟"

پھر تو ہم لوگوں نے ایک ٹیکسی پکڑی اور جوہو روانہ ہو گئے۔

"اعجاز میاں تمہیں کیا بتاؤں، جوہو کیا چیز ہے؟"

حد نگاہ تک چلتا، سر ٹکراتا اور شور مچاتا سمندر لہریں لیتا نظر آتا ہے

...ر کے کنارے ایک بہت بڑا ریت کا میدان ہے جہاں لوگ سیر و تفریح کرتے رہتے ہیں۔ میدان کے پاس بہت بڑے بڑے کھجور اور ناریل کے درخت۔ اور جھنڈ ہیں، یہاں الگ الگ لیکن تمام ضروریات سے بھرپور

"کاٹیج" بنی ہوئی ہیں۔ اگر کوئی شخص یا پارٹی رات گزارنا چاہے، چاندنی رات میں سمندر کا نظارہ کرنا چاہے۔ تو اس وادیٔ خاموش کے چھوٹے بڑے حسب ضرورت جیسے چاہے کاٹیج کرایہ پر لے اور اطمینان سے جتنی دیر یا جتنے دن چاہے رہے۔

اس مقام کی سحر طرازی نے ہم لوگوں پر جادو کر دیا، جب پہنچے تھے تو سورج چمک رہا تھا۔ لیکن سورج غروب بھی ہو گیا، لیکن پتہ تک نہیں چلا۔

ہم لوگ ریت کے فرش پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے اور سمندر کا نظارہ کر رہے تھے، تھوڑے سے فاصلہ پر دوسری ٹکڑیاں بھی بیٹھی تھیں اور گپ شپ میں مصروف تھیں بعض منچلے مرد اور عورت ایسے تھے کہ سمندر میں تیرنے کی مشق کر رہے تھے۔

ہم لوگ بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ دفعتہً ایک دلدوز چیخ کانوں میں آئی۔

"ہائے میرا بچہ"

اور پھر وہ چیخ گریہ وزاری میں تبدیل ہو گئی۔

آس پاس کے لوگ دوڑ دوڑ کر موقعہ واردات پر پہنچے۔ ہم بھی لپکتے ہوئے اسی طرف گئے اور یہ دیکھ کر دل ہل گیا۔ کہ ایک ۹-۱۰ برس کا بچہ ڈبکیاں کھا رہا ہے اور سمندر کی تیز و تند موجیں اپنے ساتھ کھینچے لیے جا رہی ہیں۔

حاضرین میں ہندو مسلم عیسائی، پارسی جوان، بوڑھے، مرد عورت سب ہی موجود تھے، لیکن کسی کی ہمت نہیں پڑی کہ سمندر میں چھلانگ لگا دے۔

وہ سوٹ بوٹ سے آراستہ ایک فیشن ایبل نوجوان تھا، وہ بھی اس منظر کو دیکھ رہا تھا۔

" اور دفعتہً وہ بجلی کی طرح ہمارے غول سے نکلا اور ایک مرتبہ چھپاک سے سمندر میں حاضرین نے جوش تحسین سے بے تابو ہو کر تالیاں

پہنچیں۔ کچھ لوگوں نے نعرے لگائے، بعض نے افسوس کیا کہ یہ نوجوان بھی ڈوبا۔ بچہ کو لہریں کافی دور تک بہا لے گئی تھیں، اس کے پہنچتے پہنچتے وہ سمندر میں ہوگا، اور پھر کوٹ، پتلون اور جوتا پہن کر جو شخص سمندر میں کود ے گا، خود اس کی جان کے لالے پڑھ جائیں گے، کسی اور کو کیا بچا سکے گا۔"

امید و بیم، اضطراب و اضطرار، حسرت و افسوس اور حیرت و استعجاب کی ملی جلی کیفیات کے ساتھ ہم لوگ انجام دیکھنے کے منتظر کھڑے تھے لیکن وہ خدا بندہ مچھلی کی طرح تیرتا ہوا چشم زدن میں ڈوبتے ہوئے بچہ کے پاس پہنچ گیا اور اسے ایک ہاتھ پر اونچا اٹھا لیا اور پھر تیرتا ہوا واپس ساحل پر آگیا، اگر اسے ایک منٹ اور تیرنا پڑتا تو ضرور غرق آب ہو جاتا، اس کا سانس اکھڑ چکا تھا، پانی میں بھیگ کر سوٹ اتنا وزنی ہوگیا تھا کہ اس کا سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔ جب وہ ساحل پر ہانپتا کانپتا۔ لڑکھڑاتا پہنچا، تو ماں دوڑی اور اس نے اپنے بچہ کو لے لیا۔ اور دوسرے لوگوں نے لپک کر خلیق کو ہاتھوں ہاتھ خشکی پر پہنچایا۔

ہر طرف سے تحسین و آفرین کے ڈونگرے برس رہے تھے اور لڑکے کی ماں کا تو یہ حال تھا۔ کہ صدقے قربان ہوئی جا رہی تھی، مگر آپ یعنی ہمارے

یعنی خلیق صاحب اس طرح شرمارہے تھے۔ جیسے انھوں نے کوئی کارنامہ نہیں انجام دیا ہے کوئی جرم سرزد ہوگیا ہے۔ ان ذات شریف سے!"

خیر جوں توں کر کے ہم لوگ جو ہو سے اپنے ہوٹل واپس پہنچے ٹیکسی جب ہوٹل کے دروازے پر پہنچی تو خلیق صاحب خود نہیں اترے اتارے گئے کیونکہ بیہوش ہو چکے تھے اور وہ بھیگا ہوا سوٹ اب تک زیب جسم تھا۔

اسی حالت میں ہم لوگ انہیں لے کر جے جے ہسپتال پہنچے، وہاں علاج معالجہ شروع ہوا ہسپتال جب پہنچے ہیں، تو ڈبل نمونیہ ہو چکا تھا۔ لیکن وہ تو کہیے، ڈاکٹر انچارج شریف اور ہمدرد شخص تھا، اس نے پوری توجہ اور یکسوئی کے ساتھ علاج کیا اور کوئی دو ہفتہ کے بعد حضرت اس

قابل ہوئے کہ سفر کر سکیں۔

"اچھے ہو کر جب ہوٹل واپس آئے تو میں نے پوچھا۔

"یہ کیا حماقت تھی؟"

"مسکرانے لگے اور فرمایا" حماقت تو تھی لیکن اس حماقت نے مجھے مرنے سے بچالیا۔"

میں نے سراپا حیرت بن کر دریافت کیا۔

"تم مرتے مرتے بچے، یا مرنے سے بچ گئے؟"

کہنے لگے، اگر وہ لڑکا میری آنکھوں کے سامنے ڈوب جاتا تو زندگی بھر اپنے خدا اور اپنے ضمیر سے شرمندہ رہتا، اور یہ شرمندگی، موت سے بدتر ہوتی۔

میں نے جل کر پوچھا، اگر تم اسے بچاتے ہوئے خود ڈوب جاتے، تو کیا ہوتا۔ تمہاری بیوی کیا کرتی، تمہارے بچے کیا کرتے پھر تم اپنے ضمیر اور اپنے خدا کو کیا جواب دیتے؟"

"یہ تو خودکشی تھی جو تم کر رہے تھے۔"

کمزور سی ہنسی ہنستے ہوئے فرمایا۔

"تم غلط کہتے ہو، کسی کی جان بچاتے ہوئے مر جانا خودکشی نہیں، حیات جاوید ہے، میں ڈوب کر حیات جاوید پالیتا۔ رہی میری بیوی، رہے میرے بچے۔"

میں جوش و خروش کے ساتھ پوچھا۔

"ہاں بتاؤ، ان کا حشر کیا ہوتا؟"

نہایت اطمینان اور سادگی کے ساتھ جواب دیا۔

"اگر اس وقت مر جاؤں تو یہ لوگ کیا کریں گے؟"

"میں نے کہا کچھ پاگل ہوئے ہو، اس وقت کیوں مرنے لگے؟"

بڑے عارفانہ انداز میں فرمایا۔ موت ہی تو ایسی چیز ہے جو ہر وقت آسکتی ہے، کیا تم سے باتیں کرتے کرتے میرا ہارٹ نہیں فیل ہو سکتا، یا

اس کمرہ کی چھت نہیں گر سکتی، جس ٹیکسی میں ہم جائیں گے، وہ کسی چیز سے ٹکرا نہیں سکتی، جس ریل میں ہم سفر کریں گے، وہ کسی حادثہ کا شکار نہیں ہو سکتی، موت سے کہیں چھٹکارا ہو سکتا ہے وہ تو ہر وقت ہمارے ساتھ ہے، اس سے کون بھاگ سکتا ہے؟ کون پناہ پا سکتا ہے؟"

یہ باتیں سن کر میں تو دنگ رہ گیا، میں نے کہا۔

لایئے پیر و مرشد ہاتھ بڑھایئے تاکہ ذرہ بے مقدار بیعت کرے میں نے یہ بات بظاہر مذاق میں کہی تھی، لیکن درحقیقت یہ میرے دل کی آواز تھی۔

خلیق کی باتوں نے میری آنکھیں کھول دیں، دوستی کی عمر بچپن سے شروع ہوتی ہے۔ لیکن اس واقعہ کے بعد میں اس کا صرف دوست ہی نہیں رہ گیا اور بات کہوں۔

اعجاز جو محویت سے ڈاکٹر صاحب کی باتیں سن رہا تھا۔ کہنے لگا۔ ضرور فرمایئے یہ باتیں تو مجلس وعظ سے زیادہ سبق آموز ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے فرمایا، اس دن سے خود میری زندگی کا رخ بدل گیا

" اعجاز نے سوال کیا" آپ کی زندگی کا رخ کیا بدلا"

وہ کہنے لگے، میں بڑا شقی النسان تھا کسی مریض کے ساتھ خواہ وہ کتنا ہی مستحق ہمدردی کیوں نہ ہو، ذرا رعایت نہیں کرتا۔

لیکن اس واقعہ کے بعد میں نے سمجھ لیا کہ انسان کی زندگی کتنی قیمتی ہوتی ہے اور اس قیمتی اور گراں مایہ چیز کی حفاظت کے لئے اپنی جان کو بھی خطرہ میں ڈال دینا کتنی بڑی سعادت ہے۔

اور پھر دفعتہ ڈاکٹر صاحب نے قلم اٹھایا اور ایک مختصر سا نسخہ لکھ کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

اللہ شفا دے گا، جاؤ!"۔

(۷)

ڈاکٹر صاحب نے جو نسخہ لکھا تھا، یہ صرف کمزوری بدن کا مداوا تھا، کے روگ کا اس سے کوئی تعلق نہیں تھا، لیکن اعجاز جب یہاں سے اُٹھا تو اس کی بیماری کافور ہو چکی تھی، کمزوری بدن کے دور ہونے میں کئی دن لگے، ڈاکٹر صاحب کی زندگی کا رخ خلیق کے ایک کارنامہ نے بدل دیا تھا اور اعجاز کی زندگی کا رخ ڈاکٹر صاحب کی باتوں نے بدل کر رکھ دیا۔

وہ گھر پہنچا، تو خلیق صاحب اس کے منتظر تھے۔

"کیوں بٹیا نسخہ لکھا لائے۔؟"

اعجاز نے نسخہ سامنے رکھ دیا۔ انہوں نے اپنی جیب میں رکھ لیا کہ شام کو ڈیوٹی سے فارغ ہو کر جب تشریف لائیں گے تو لیتے آئیں گے۔

پھر پوچھا۔

"لیکن بہت دیر لگ گئی تمہیں؟"

"وہ گویا ہوا" کچھ انہوں نے پرانے قصّے چھیڑ دیئے تھے۔"

"پرانے قصّے؟"

"جی ہاں، بمبئی کی سیر جوہو کی تفریح، وہاں ایک لڑکے کو سمندر کی لہروں کا بہلا لے جانا، اس کی صدائے دل فگار اور آپ کا سوٹ اور جوتوں سمیت سمندر میں چھلانگ لگا دینا، خود ڈوبتے ڈوبتے بچنا، لیکن بچہ کو بچا لینا، پھر نمونیہ میں مبتلا ہو جانا، پھر ہسپتال میں داخلہ دو ہفتہ کے بعد ـــ

خلیق صاحب نے ایک قہقہہ لگایا، پھر کہنے لگا۔
"بھئی یہ ڈاکٹر بڑا باتونی ہے؟"
اعجاز نے ڈرتے ڈرتے کہا۔
"لیکن ان کی باتیں کتنی سچی اور کتنی اچھی ہوتی ہیں ان باتوں سے میں نے بڑا سبق لیا ہے —
خلیق صاحب نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔
"لیکن سبق تو ڈاکٹر صاحب سے لینا چاہیے!"
اعجاز چونک پڑا "میں نہیں سمجھا آپ کا مطلب؟"
"خلیق صاحب نے فرمایا" میری بیماری کے زمانہ میں جس طرح تیمارداری کا حق ادا کیا، جس طرح رات بھر جاگا، اور اپنی ملازمت کو خطرے میں ڈال کر میری پٹی سے چمٹا رہا۔ کیا ایثار اور خدمت کی انتہا نہیں ہے؟"
اعجاز سمجھ گیا، خلیق صاحب، اپنے کارنامے کو ماند کرنے کے لئے ڈاکٹر صاحب کا کارنامہ اچھال رہے ہیں۔ اس نے کہا۔
بجا ارشاد فرمایا لیکن —
خلیق صاحب اٹھ کھڑے ہوئے اور جاتے جاتے فرمایا۔
لیکن ویکن کچھ نہیں، تم نہیں جانتے، ڈاکٹر بہت بڑا آدمی ہے سراپا ایثار، سراپا خلوص، میں نے تو جو کچھ کیا، جذبے کی حالت میں کیا، ماں کی چیخ اور بچہ کی حالت، دیکھ کر ضبط نہ کر سکا۔ میری جگہ دشمن ہوتا، یہی کرتا —
"لیکن ڈاکٹر صاحب تو آپ کے ساتھ ہی تھے۔"
خلیق صاحب نے پھر ایک قہقہہ لگایا اور فرمایا۔
اب تم مجھ سے بحث کرنے لگے — بیٹے تم نہیں جانتے اس کی

بڑائی۔ مجھ سے پوچھو، میرے دل سے پوچھو
یہ کہتے ہوئے خلیق صاحب باہر نکلے۔ اور چلے گئے اور ان کے جانے کے بعد اعجاز بڑی دیر تک گم سم بیٹھا رہا۔ پھر اس نے سوچا۔ اچھے اور

بڑے کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ خود پیچھے رہتا ہے اور دوسروں کو آگے بڑھاتا ہے اور اپنے کام کا اجر تعریف و توصیف کی صورت میں بندوں سے نہیں لینا چاہتا، خدا سے لینا چاہتا ہے۔

اتنے لائوتی آ گیا۔ اس نے کہا۔

" مراقبہ میں بیٹھے ہو، کیا کالج نہیں جانا ہے آج ؟"

دردِ دلاَ دوا

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے

(۱)

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ آنے والے حادثے کا مبہم سا احساس ہو جاتا ہے زلیخا نے صفدر کے اہل خاندان کے آنے کی خبر سُن کر محسوس کر لیا تھا۔ کہ اب اس کی شامت اور زیادہ آئے گی، اب اسے زیادہ ذلتوں اور مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ نادرہ نے لاکھ لاکھ یقین دلایا کہ ایسا نہیں ہوگا۔ لیکن اس کے دل پر جو دہشت چھا گئی تھی، وہ بدستور قائم رہی اور یہ دہشت اس دن اور بڑھ گئی جب امتیاز کا تبادلہ دفعتہً بیگم کوٹ کا ہو گیا، اس نے افسران بالا سے التجا کی، اور اصرار میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا۔ اپنی خانگی دشواریاں اور مصیبتیں بیان کیں۔ مگر سب کا جواب ایک ہی تھا۔

"حکم کی تعمیل کرو، مہینہ دو مہینہ کے بعد تمہیں پھر یہاں واپس بھیج دیا جائے گا"

جاتے وقت امتیاز نے زلیخا کو بلایا اور کہا۔

بیٹی میرا تبادلہ بیگم کوٹ ہو گیا ہے اور میں آج ہی جانے پر مجبور ہوں، افسران بالا نے وعدہ کیا ہے کہ مہینہ دو مہینہ میں مجھے پھر یہاں بھیج دیں گے اور اگر انہوں نے اپنا وعدہ پورا نہ کیا، تو میں نوکری سے استعفیٰ دے کر چلا آؤں گا ـــــ

زلیخا نے کوئی جواب دیا، ہاں اس کی آنکھیں ضرور ڈبڈبا آئیں
" امتیاز نے اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔
شاید تو کلثوم اور نسیم وغیرہ سے خائف ہے۔ میرے پیچھے یہ لوگ تجھے پریشان نہیں کریں گے، میں کلثوم کو بھی سمجھائے دیتا ہوں اور کوئی بات تیری طبیعت پر گراں گزرے تو ایک خط ڈال دینا، میں دو مہینے کا انتظار نہیں کروں گا۔ اور واپس چلا آؤں گا۔؟"
یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ کلثوم خود کسی کام سے ادھر آ گئی۔ امتیاز نے اس موقعہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا۔
" کلثوم میں آج بیگم کرٹے جا رہا ہوں۔"
" وہ بولی "، ہاں بھائی صاحب یہی سن کر تو میں آئی تھی، آخر آپ کا تبادلہ وہاں کیوں کر دیا گیا؟ ۔ نہ جایئے اتنی تو رونق رہتی آپ کی وجہ سے گھر میں؟"
دونوں باتیں جھوٹ، نہ وہ یہ چاہتی ہے کہ امتیاز نہ جائے۔ نہ اس کے وجود سے وہ کوئی رونق محسوس کرتی ہے۔ زلیخا نے دل ہی دل میں کہا۔
امتیاز کو اس وقت بہت جلدی تھی، پہلی ٹرین سے روانہ ہونا تھا لہٰذا وہ رسمی باتوں کے لئے تیار نہ تھا۔ اس نے کہا۔
" بہر حال میں جا رہا ہوں۔ زلیخا یہیں رہے گی۔"
کلثوم نے کہا وہ یہاں نہیں رہے گی۔ تو کہاں جائے گا۔
یوں تو میں نے بھی اس کا کبھی خیال نہیں رکھا، لیکن میری موجودگی سے بہر حال اسے ڈھارس تو تھی۔ مجھے امید ہے تم اس کا خیال رکھو گی۔
بھائی صاحب آپ کیسی باتیں کرتے ہیں، یہی باتیں دل میں گھاؤ ڈال دیتی ہیں۔
" ارے یہ کیوں؟"
آپ کہیں گے تو میں اس کا خیال رکھوں گی؟ کم از کم میری نظر میں تو

زلیخا اور نسیم میں کوئی فرق نہیں ۔ البتہ آپ کی نظر میں ہو گی ۔ اور اسے میں اپنی بدقسمتی ہی کہہ سکتی ہوں ۔

یہ کہتے کہتے کلثوم کا گلا رندھ گیا ۔ آنسو نکلے یا نہیں ، بہرحال اس نے دوپٹے کے دامن سے آنکھیں ضرور پونچھیں ۔

کلثوم کی یہ باتیں سن کر اور یہ انداز دیکھ کر امتیاز چکرا گیا ۔ وہ دل ہی دل میں سوچنے لگا ۔ کہیں نادرہ اور زلیخا کو غلط فہمی تو نہیں ہوئی ہے کہیں یہ زلیخا کی حد سے زیادہ نزاکت احساس کا کرشمہ تو نہیں ہے کہ اس نے کلثوم اور نسیم کو اپنا دشمن سمجھ لیا ہے ، گھر میں جب لوگ رہتے ہیں تو سب کی طرح کی باتیں ہوتی ہیں ، خوش گوار بھی اور ناخوش گوار بھی ۔ لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں ہوتا کہ کسی ناخوش گوار بات کی آڑ لے کر بات کا بتنگڑ اور رائی کا پہاڑ بنا لیا جائے گا ۔

کلثوم کے خلاف امتیاز کے دل میں جو غبار تھا ۔ بڑی حد تک اس کے مصنوعی آنسوؤں سے دھل گیا ۔

اس نے کہا ۔

" میرا یہ مطلب کب تھا ؟ "

وہ اس طرح رہا نسے انداز سے بولی ۔

بھائی صاحب ۔ اور کیا مطلب تھا آپ کا ۔ میں ہمیشہ سے زلیخا کو چاہتی ہوں اور جب سے بھابی رمریم) کا انتقال ہوا ہے اس وقت سے تو وہ مجھے نسیم سے بھی زیادہ عزیز ہے ؟ "

ایک تاثر کے عالم میں امتیاز نے کہا ۔

ضرور ہو گی ، ضرور ہو گی ۔ بس تو اب میں مطمئن ہوں ۔

" سپردم بہ تو مایۂ خویش را "

پھر جب کلثوم چلی گئی تو امتیاز نے زلیخا سے کہا ۔

" بیٹی بہرحال ، انہی لوگوں کے ساتھ مل جل کر رہنا ہے ۔ کوئی بات کسی وقت ناگوار گزرے تو طرح دے جایا کرے کرو ! "

لیکن نظر اٹھا کر دیکھا تو زلیخا کی آنکھیں پرنم تھیں اور وہ سارے

بدن سے کانپ رہی تھی۔ امتیاز نے کچھ پوچھنا چاہا۔ لیکن زبان نے یاری نہ دی۔

زلیخا نے پہلی مرتبہ باپ سے کہا۔

"اباجی یہ ساری باتیں مکرو فریب، اور جھوٹ کا پلندا ہیں، وہ آپ سے ڈرتی ہیں۔ اس لئے یہ باتیں کر گئیں۔ ورنہ دن بھر میرے دل پر جو آرے چلتے رہتے ہیں میں ہی جانتی ہوں۔"

اس کے بعد وہ کچھ نہ کہہ سکی اور رونے لگی۔ امتیاز کو ایک مرتبہ پھر اپنے فیصلہ اور رائے پر نظر ثانی کرنا پڑی اس نے سوچا، بے بات کی بات پر زلیخا جیسی خاموش، بے زبان اور صابر لڑکی اس طرح پھوٹ پھوٹ کر نہیں رو سکتی۔ نہ ایسے الفاظ استعمال کر سکتی ہے، یقیناً کلثوم کا ظاہر کچھ ہے، باطن کچھ، میرے سامنے جو روپ ہے وہ دوسرا ہے اور زلیخا کو جس رویے سے سابقہ پڑتا ہے، وہ دوسرا ہے۔ انہوں نے کہا۔

"بیٹی میں نے یونہی ایک بات کہہ دی تھی اور اس کا تم نے اتنا اثر لیا؟"

وہ روتی ہوئی بولی، اباجی وہ چاہتی ہیں۔ کہ آپ مجھے ان کے سپرد کر جائیں تاکہ جو ظلم باقی رہ گئے ہیں وہ بھی توڑ لیں۔

امتیاز نے بڑھ کر اس کا سر اپنے سینہ سے لگایا اور کہا۔

اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ تو کلثوم کی دست نگر ہو جائے اپنا گھر تو اس طرح چلائے گی، جس طرح اب تک چلاتی رہی ہے۔ اطمینان رکھ میں انشاء اللہ بہت جلد واپس آجاؤں گا اور دوبارہ جب واپس آؤں گا۔ تو تیرے دکھ کا مداوا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کروں گا!"

زلیخا نے ابھی کوئی جواب نہیں دیا۔ تھا کہ کسی نے آواز دی امتیاز صاحب۔

زلیخا اندر واپس آگئی۔

(۲)

امتیاز بیگم کوٹ روانہ ہوگیا۔

"زلیخا کے دل میں رہ رہ کر جو بات کھٹک پیدا کر رہی تھی۔
وہ یہ تھی کہ اس مرتبہ جب واپس لوٹوں گا۔ تو تیرے دکھ کا مداوا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کر دوں گا!"

آخر اس کا کیا مطلب ہے۔ کیا شادی؟ کیا ابا جی نے میری شادی کا فیصلہ کر لیا ہے۔؟

یہ سوچتے سوچتے خود بخود اس کا چہرہ سرخ ہوگیا یہ شرم کی سرخی تھی اور پھر دفعتہً اس کی آنکھوں کے سامنے ایک شوخ، طرار لیکن، سنجیدہ اور جذبات سے بھرپور چہرہ ابھرا یہ ارشاد تھا۔

"کچھ خبر نہیں، وہ سعادت گنج میں کیا کر رہا ہے میں اسے یاد آتی ہوں۔ یا فراموش کر چکا ہے۔ مجھے؟"

وہ مجھے بھول فراموش کر دیا!

خالہ نے بھی مجھے فراموش کر دیا۔

یہ ساری چاہت، یہ سارا پیار، اماں کے دم تک تھا۔ وہ اس دنیا سے کیا رخصت ہوئیں۔ یہ باتیں بھی افسانہ پارینہ بن گئیں۔

وہ سہانے سپنے جو ہم نے دیکھے تھے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بے تعبیر رہ گئے۔ اب ان کی یاد سے کیا حاصل!

بیگم کوٹ سے واپس آنے کے بعد اس کے ہاتھ میں جی چاہے گا وہ میرا ہاتھ پکڑا دیں گے اور میں خاموشی سے سر جھکائے، چلی جاؤں گی۔
لڑکی بیچاری اس سماج میں حیثیت ہی کیا رکھتی ہے! نہ اس کی کوئی آواز، نہ اس کی کوئی حیثیت۔
بار بار جی چاہتا تھا اس گتھی کو نادرہ سے سلجھانے کی کوشش کرے لیکن نادرہ گو ہمدرد اور مخلص تھی، اس کے غم کو اپنا غم اور اس کی تکلیف کو اپنی تکلیف سمجھتی تھی۔ لیکن کچھ عمر کا تفاوت، کچھ مرتبہ کا فرق کچھ پاس حیا۔ یہ رکاوٹیں ایسی تھیں کہ اس سے نہ وہ گفتگو کر سکتی تھی۔ نہ صلاح لے سکتی تھی۔ اور پھر وہ خود ہی عالم خیال میں بیٹھی یہ باتیں سوچا کرتی۔ ایک ایک لفظ کو کئی کئی معنی پہناتی۔ لیکن کسی لفظ کے معنی بھی وہ نہ نکلتے جو وہ چاہتی تھی۔ ارشاد جسے ہمیشہ یاد رکھا جسے وہ کبھی نہیں بھول سکے گی، اس طرح دامن جھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ کہ اب اس کے بارے میں سوچنا اور سر پھوڑنا ایک ہے۔
ایک روز وہ انہی خیالات میں غرق بیٹھی تھی۔ کہ نادرہ دبے پاؤں آئی اور سرگوشی کے لہجہ میں کہنے لگی۔
"آج آرہے ہیں وہ لوگ۔"
زلیخا سمجھ تو گئی، کون لوگ آرہے ہیں، لیکن تجاہل عارفانہ کے طور پر سوال کیا۔
کون لوگ آرہے ہیں، میں کیا جانوں؟"
وہ بولی، وہی صفدر کے گھر والے اور کون۔ سب لوگ اسٹیشن گئے ہیں اور مجھے حیرت اس پر ہے کہ نسیم بھی گئی ہے، کیا زمانہ آگیا ہے میں کہتی ہوں احرار کی عزت کیا ہوئی ہے؟

زلیخا نے کہا۔ اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟ آنے والے نسیم کے لئے غیر تو نہیں۔ اس کے ماموں ہیں، ممانی ہیں، ماموں اور ممانی کے استقبال کو اسٹیشن پر جانا بری بات ہے؟"

"ہاں بہت بری بات ہے؟"

کیوں بھئی بری بات کیوں ہے؟

"ایک طرف یہ لوگ منگنی کرنے آرہے ہیں۔ دوسری طرف دلہن خود ہونے والے ساس سسر کی پیشوائی کے لئے اسٹیشن پہنچ رہی ہے میں کہتی ہوں، شرم بھی کوئی چیز ہے۔"

زلیخا نے کوئی جواب نہیں دیا، وہ سوچنے لگی، اگر خالہ رابعہ میری منگنی کے لئے سعادت گنج سے، آتیں تو کیا میں اسٹیشن نہ جاتی۔

(۳)

اور جس وقت کا دھڑکا تھا، وہ وقت آگیا۔ آخر۔

کلثوم اور نسیم اور احرار اسٹیشن گئے اور بڑے جاہ و جلال کے ساتھ بیگم شاہینہ اور امجد علی کو لے کر گھر واپس آئے، رقیہ صفدر کی ماں تھی، شاہینہ بہن، امجد باپ۔

یہ لوگ اس گھر میں، اس طرح آئے جیسے کوئی بادشاہ اور شہر یار آتا ہے۔

زلیخا نے بہت ضبط کیا لیکن ضبط نہ کر سکی، جب نادرہ نے اطلاع دی کہ وہ لوگ سواری سے اتر چکے اور اب گھر میں داخل ہو رہے ہیں تو بے ارادہ دروازے کی اوٹ میں کھڑی ہو کر آنے والوں کا نظارہ کرنے لگی۔

رقیہ بیگم کا سن پچاس سے تجاوز کر چکا تھا، رنگ گورا تھا، بال سفید ہو چکے ہیں۔ قامت گداز، امجد علی ساٹھ کے پیٹے میں تھے، بالکل دبلے پتلے، گال دھنسے ہوئے تھے، چھوٹی چھوٹی آنکھیں، رنگ سیاہ جیسے توے کا سیاہی، منہ میں پان کا بیڑا، ہاتھ میں سلگتا ہوا سگار، شاہینہ کی عمر ۱۸ - ۱۹ سال سے زیادہ نہ ہوگی۔ خوبصورت لڑکی تھی، تیکھے نقش نگار، رنگ ماں کی طرح گورا، بڑی بڑی نرگسی آنکھیں، پتلے پتلے ہونٹ، موتی کے سے سفید دانت، ہونٹوں پر تبسم، چال میں غضب کا

سحر، ہرے رنگ کا غرارہ پہنے سب سے آگے آگے آرہی تھی۔

یہ لوگ اس کے کمرہ کے پاس گزرتے ہوئے چلے گئے ان کے گزرنے کے بعد وہ پھر آکر اپنی جگہ بیٹھ گئی اور سوچنے لگی، دیکھے اب کس طرح گزرتی ہے۔

سارا دن خیریت کے ساتھ گزر گیا، کوئی خاص واقعہ نہیں پیش آیا زلیخا نے دل ہی دل میں سجدۂ شکر ادا کیا۔ کہ آج کا دن تو خیریت کے ساتھ گزر گیا۔

لیکن آج کا دن خیریت کے ساتھ کہاں گزرا، ابھی ساری رات باقی تھی۔

اور رات نے جب دن کو اپنے سیاہ لبادے میں ڈھانپا تو خیریت شامت سے بدل گئی۔

کمرے سے نکل کر وہ باورچی خانے کی طرف جا رہی تھی، صحن میں کرسیاں پڑی تھیں، کلثوم، نسیم شاہینہ بیٹھی ہوئی تھیں، باہر مردانے میں احراز اور امجد سرگرم گفتگو تھے۔

زلیخا کو دیکھکر رقیہ نے کلثوم سے پوچھا۔

"اے بہن یہ کون لڑکی ہے؟"

کلثوم نے بے پروائی کے ساتھ جواب دیا، بھائی صاحب کی مریم اس کی ماں تھی، جس کا پچھلے سال انتقال ہوا ہے۔

رقیہ بیگم خاموش ہو گئیں، لیکن شاہینہ نے کہا۔

"کتنی اچھی ہے ممی؟"

پھر کلثوم سے مخاطب ہو کر بچوں کی طرح ضد کرتی ہوئی کہنے لگی اچھی پھوپھی اس کو بلایئے ذرا باتیں کریں گے اس سے با"

یہ فرمائش کلثوم کو ذرا پسند نہیں آئی، لیکن ہونے والے داماد کی بہن اور بھائی کی لڑکی نے کی تھی لہٰذا رد بھی نہیں کی جا سکتی، انہوں نے وہیں بیٹھے بیٹھے آواز دی۔

"زلیخا ذرا ادھر آنا!"

زلیخا جاتے جاتے ٹھٹک کر پہلے تو کھڑی ہو گئی۔ پھر سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔

"کیا آپ نے مجھے بلایا ہے۔؟"

کلثوم کو جھاڑ ڈالنے کا اس سے اچھا موقع اور کون سا مل سکتا تھا کہنے لگی۔

واہ بیٹی واہ، واقعی بڑی شہزادی ہو جس گھر میں جاؤ گی، ہاتھوں ہاتھ لی جاؤ گی اور اپنے کنبے کا نام بھی خوب روشن کرو گی، نہ سلام نہ دعا نہ مہمانوں کی مزاج پرسی، بجلی کے کھمبے کی طرح سامنے آ کر کھڑی ہو گئیں کیا آپ نے مجھے بلایا ہے۔ اے تمہیں نہیں بلایا تو کیا تمہارے فرشتوں کو بلایا ہے! لیکن بھر پایا معاف کرو، سدھارو، تشریف لے جاؤ۔"

زلیخا کے لئے نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن کا معاملہ ہو گیا نہ جا سکتی تھی۔ نہ کھڑی رہ سکتی تھی، اس ڈانٹ نے اُسے اور زیادہ حواس باختہ کر دیا تھا، پھر بھی حواس بجا کر کے کہنے لگی۔

"پچی اماں میں نے تو آتے ہی سلام کیا تھا۔"

پچی اماں بولی، ہاں ضرور کیا تھا، میری تو عادت ہے تہمت لگانے کی۔ میں نے تمہارا سلام سنا اور کانوں میں انگلیاں دے لیں۔ تمہیں سلام کرتے دیکھا اور آنکھیں بند کر لیں (رقیہ سے مخاطب ہو کر) بھابی۔ خدا لگتی کہنا، اس نے سلام کیا تھا؟"

رقیہ بیگم چہ کنم میں پڑ گئیں سچ کہیں تو کلثوم کے خفا ہو جانے کا ڈر اور کہتی ہیں نہیں کیا تھا تو بالکل جھوٹ، بات بناتے ہوئے کہنے لگیں جب کہہ رہی ہے تو کیا ہو گا!"

"نسیم نے لقمہ دیا، نہیں مہمانی بالکل نہیں کیا تھا۔ میں بھی تو یہیں بیٹھی ہوں، اگر کیا ہوتا تو کیا میں نہ دیکھتی؟"

اب رقیہ نے خاموش ہی ہو جانے میں عافیت سمجھی، لیکن شاہینہ

چپ نہ رہ سکی۔ اس نے کہا۔
"کیا تھا! میں نے خود دیکھا اپنی آنکھوں سے؟"
اور پھر دفعتہً" کلثوم سے پوچھا۔
"ممانی کیا آپ ان (زلیخا) سے خفا ہیں کچھ؟"
زلیخا دیسے ہی مجرم کی طرح کھڑی تھی۔
"کلثوم نے جواب دیا۔" کیوں، میرے جوتی کو کیا پڑی ہے کسی سے خفا ہونے کی؟ ہاں یہ ضرور کہوں گی بے ادب بے نصیب، با ادب با نصیب۔"
شاہینہ ہنسنے لگی، اس نے کہا۔
"لیکن یہ بے ادب کہاں ہے اُس نے تو آتے ہی ممی کو سلام کیا تھا۔ - کیوں ممی کیا تھا نا؟"
لاڈلی اور چہیتی لڑکی سے برملا، اختلاف رائے کی ہمت رقیہ میں نہ تھی، جواب دیا۔
"کیا ہو گا۔"
شاہینہ مچل گئی، کہنے لگی۔
"ہو گا کیوں؟ - آپ ہی کو تو کیا تھا۔ کیا آپ نے نہیں دیکھا؟"

وہ بے بسی کے ساتھ کلثوم کی طرف دیکھتی ہوئی بولیں۔
"ہاتھ ہلتے تو میں نے بھی دیکھا تھا۔"
وہ کہنے لگی"سلام ہاتھ ہی سے تو کرتے ہیں؟"
کلثوم کو پھر موقعہ مل گیا، فرمایا۔
"یہ تو آج کل فیشن ہے منہ سے سلام کرتے کیا شرم آتی ہے!"
شاہینہ نے گویا زلیخا کی طرف سے جواب دیتے ہوئے کہا۔
"میں نے بھی آپ کو ہاتھ اٹھا کر سلام کیا تھا؟"
کلثوم کو الجھن ہونے لگی، ان باتوں سے۔
"ہو گا بیٹی۔ میرا سر نہ کھاؤ، ویسے درد ہو رہا ہے بڑی دیر سے سر میں!"

پھر زلیخا سے مخاطب ہوئیں -
بیٹھنا ہے تو بیٹھو۔ جانا ہے تو جاؤ۔ تم تو اس طرح سر پہ کھڑی ہو جیسے موقعہ پاتے ہی حملہ کر دوگی !"
نسیم کو ہنسی آگئی۔ وہ زور سے ہنس پڑی۔ رقیہ بھی مسکرا دیں -
زلیخا کو رونے کا یارا بھی نہیں تھا۔ جس طرح آئی تھی، اسی طرح الٹے قدم اپنے کمرے کی طرف واپس جانے کے لئے مڑی، لیکن شاہینہ نے روک لیا اور ہاتھ پکڑ کر کرسی پر بیٹھا دیا کہنے لگی -
ہمیں تو بڑی اچھی لگی تھیں۔ ہمارے سامنے تو ممانی نے بلایا تھا تمہیں۔ بیٹھو ذرا دیر پھر چلی جانا۔
وہ انکار نہ کر سکی، سوچا اگر انکار کرتی ہوں تو پھر صلواتوں کا سلسلہ شروع ہو جائیگا۔ چپ چاپ ایک خالی کرسی پر جو شاہینہ کے قریب تھی بیٹھ گئی۔
اتنے میں اپنے تمام لوازمات کے ساتھ چائے آگئی اور یہ سب اس پر ٹوٹ پڑے، شاہینہ نے اپنے ہاتھ سے ایک پیالی اٹھا کر زلیخا کو پیش کی پھر کچھ کھانے کی چیزیں سامنے رکھ دیں اور اصرار کر کے اسے کھلانے لگی -

(۴)

شاہینہ نے دیکھا زلیخا تکلف کر رہی ہے۔ وہ بار بار کوئی نہ کوئی چیز اٹھا کر اس کی پلیٹ میں رکھ دیتی اور اصرار کرتی! یہ تو کھاؤ۔"

لیکن اس نے صرف چائے پر اکتفا کیا۔ کوئی چیز نہیں کھائی۔ چیزیں ایسی تھیں جو اسے مرغوب تھیں۔ اور اس کا جی چاہا کہ ان سے لذت کام و دہن حاصل کرے، لیکن کلثوم بیگم کے طنز و تعریض سے ڈر گئی۔ چائے پی کر جب اس نے پیالی رکھی تو شاہینہ نے شکایت آمیز لہجہ میں اس سے کہا۔

تم نے تو کچھ کھایا۔

" پھر کلثوم سے مخاطب ہوئی" ممانی جان زلیخا کو دیکھا آپ نے؟ کتنا تکلف کر رہی ہیں؟"

کلثوم سے مخاطب ہوئی" ممانی جان زلیخا بیگم کا بڑا کرم اور احسان ہے ہم پر کہ چائے پی لی، وہ ٹھہریں ایک نازک طبع اور نازک دماغ بھلا یہ خراب سی چیزیں کیا کھاتیں۔ ان کے لئے تو موہن بھوگ تیار ہوتا ہے ہر روز اب یہاں سے جا کر وہی نوش جان کریں گی۔"

شاہینہ نے پوچھا" موہن بھوگ کیا چیز ہے ممانی جان؟

ممانی جان نے جواب دیا، یہ شہزادیوں کی غذا ہے۔

شاہینہ نے دریافت کیا۔

"تو کیا زلیخا شہزادی ہیں کہیں کی؟"
نسیم ہنستی ہوئی بول پڑی۔
"ہاں کنگال نگر کی شہزادی ہیں!"
اور پھر وہ اس طرح ہنس پڑی جیسے اس گفتگو میں اس نے کوئی حصہ ہی نہیں لیا تھا۔
شاہینہ بھی ہنسنے لگی اور پوچھا۔
کیا کنگال نگر میں بھی شہزادیاں ہوتی ہیں!
وہ بولی یہ بیٹھی ہیں تمہارے سامنے۔
اثنائے گفتگو میں رقیہ، نسیم اور کلثوم مجلس سے رخصت ہو چکی تھیں۔ صرف زلیخا اور شاہینہ بیٹھی تھیں۔ یکایک صفدر آگیا، شاہینہ سے مخاطب ہو کر گویا ہوا۔
"بڑے زور کی مجلس جمی ہوئی ہے؟"
"شاہینہ نے چٹکی لی" بس ایک ہی کی کسر تھی!"
اس نے دزدیدہ نظر سے ادھر ادھر دیکھا، پھر ایک خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اسے بیٹھتا دیکھ کر زلیخا اٹھی۔ شاہینہ نے پھر ہاتھ پکڑ کر بٹھا لیا۔ وہ کہنے لگی۔
"اب جاؤں گی، کچھ کام ہے مجھے!"
شاہینہ نے بے تکلفانہ لہجہ میں کہا۔
"کام تو زندگی بھر کا ہے اکر لینا۔ مہمانوں کی خاطر داری بھی تو کرنی چاہیے کچھ۔"
وہ بے بسی کے ساتھ بیٹھ گئی۔ لیکن بالکل خاموش صورت تصویر
صفدر نے شاہینہ سے زلیخا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"کیا انہیں بولنا آتا ہے؟"
"مسکراتی ہوئی بولی، میں بھی اتنی دیر سے یہی سوچ رہی ہوں۔ کہ یہ اتنی کم گو کیوں ہیں؟"

زلیخا کسمسا کر اور پہلو بدل کر رہ گئی۔ وہ زبان سے کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن زبان نے ساتھ نہ دیا۔

اب صفدر براہ راست زلیخا سے مخاطب ہوا۔

"شاید میرے بارے میں آپ کو غلط فہمی ہے کچھ؟"

آخر اسے بولنا پڑا، کہنے لگی۔

"جی نہیں کوئی غلط فہمی نہیں ہے۔ لیکن حسن ظن بھی نہیں ہے اور ہونا بھی نہیں چاہیئے۔"

صفدر کو یہ ادائیں اور یہ باتیں بہت اچھی لگیں، ان میں بے پناہ قسم کی کوشش اور جاذبیت نظر آئی، کہنے لگا۔

"آپ کے اس اکھڑے اکھڑے انداز گفتگو سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے آپ بے حد ناراض ہیں مجھ سے لیکن میری خطا، میرا قصور؟"

وہ گویا ہوئی، اگر آپ ایک بات فرض کر لیں اور اسی بنیاد پر نتائج نکالنے لگیں تو اس کی ذمہ داری میرے اوپر تو کسی طرح عائد نہیں ہوتی۔

سوال یہ ہے کہ مجھے آپ سے ناراض ہونے کا حق بھی ہے؟"

"کیوں نہیں ہے!"

میں تو اس چیز کو بھی اپنے لئے باعث فخر سمجھوں گا کہ خوش نہ سہی ناراض تو ہیں آپ مجھ سے، اس کے معنی یہ ہیں۔ کہ میں بھی کچھ ہوں میری بھی کچھ حیثیت ہے۔

میں خوش ہوا کہ ہوں تو کسی نگاہ میں!"

یہ باتیں زلیخا کے لئے قطعاً ناقابل برداشت تھیں۔ شاہینہ نے انہیں صرف صفدر کی زندہ دلی، شوخ گفتاری اور شوق مجلس آرائی پر محمول کیا۔ وہ صرف مسکراتی رہی اور زلیخا کا یہ حال تھا کہ ایک رنگ آرہا تھا ایک جا رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ ان باتوں کا جواب کیا دے؟ ان باتوں کا مقصد کیا ہے، اتنے میں نسیم کی جھلک نظر آئی جو اپنے کمرے کی کھڑکی سے اس طرف ٹکٹکی لگائے دیکھ رہی تھی، لیکن نظر

ملتے ہی کھڑکی بند کر کے سامنے سے ہٹ گئی اسے دیکھ کر زلیخا کا خون
خشک ہوگیا۔ جی چاہا۔ سر پہ پاؤں رکھ کر بھاگے مگر —

(۵)

مگر وہ اٹھنے کے لئے پر تول ہی رہی تھی کہ ایک طوفان پوری دہشت آفرینی کے ساتھ نمودار ہوا۔

دفعتہً آنکھوں کے سامنے بجلی سی کوندی، نظر کی خیرگی دور ہوئی تو معلوم ہوا کلثوم بیگم شعلہ جوالہ بنی کمر پہ ہاتھ رکھے سامنے کھڑی ہیں۔

یہ کیوں آئیں اور ان کا رنگ رخ بدلا ہوا کیوں ہے؟ یہ بات تو اس نے اسی وقت سمجھ لی تھی۔ جب نسیم کو کھڑکی بند کر کے سامنے سے ہٹتے دیکھا تھا۔ زلیخا پر جو گزری وہ تو گزر ہی گئی خود صفدر ہکا بکا ہو کر رہ گیا، زندگی میں شاید ہی وہ کبھی اتنا سٹ پٹایا ہو۔ جتنا اس وقت نظر آ رہا تھا۔

چند منٹ تک مجلس پر سناٹا چھایا رہا۔

کسی میں بھی یارائے گفتگو نہ تھا۔

شاہینہ نے کچھ نہ جانتے ہوئے بھی اتنا جان لیا تھا۔ کہ کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے۔ شاید بہت بڑا۔

سب سے پہلے تو کلثوم بیگم نے صفدر کو رخصت کیا۔

بیٹے تم یہاں لڑکیوں میں بیٹھے کیا کر رہے ہو۔ میری جان! جا کر اپنے کمرے میں بیٹھو!

صفدر ایک مجرم کی طرح سر جھکائے اور چور کی طرح دبے پاؤں سین سے ہٹ گیا، اسے اپنے لئے کوئی خطرہ نہ تھا۔ نہ یہ اندیشہ تھا کہ کلثوم بیگم

اس سے بدگمان ہو جائیں گی۔ البتہ اس بات پر افسوس ضرور تھا کہ بات کا تبنگڑ اس کی وجہ سے بن رہا ہے۔

صفدر چلا گیا۔

جب بالکل نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ تو کلثوم نے زلیخا سے سوال کیا۔

"تو یہاں کیا کر رہی تھی۔؟"

"وہ بولی، کچھ بھی نہیں — شاہینہ نے آپ کے سامنے ہی تو بلایا تھا!"

"وہ بولیں" ہاں بلایا تھا، چائے پینے کے لئے، نہ کہ ہڑ دنگے مچانے کے لئے۔ میں پوچھتی ہوں۔ تو یہاں چائے پینے اور شاہینہ سے باتیں کرنے آئی تھی یا آنکھیں لڑانے ؟"

شاہینہ سے ضبط نہ ہو سکا، مداخلت کرتی ہوئی بولی۔

" ایسا نہ کہیئے ممانی جان — زلیخا ایسی لڑکی نہیں ہے نہ بھیا ایسے ہیں ؛"

کلثوم نے جواب دیا" بیٹی بڑوں کے بیچ میں نہیں بولتے، اور ہاں تم نے جو کہا کہ زلیخا ایسی لڑکی نہیں ہے، تو تم کیا جانتی ہو جمعہ جمعہ ابھی آٹھ دن دن بھی تو نہیں ہوئے تمہیں آئے۔ تم کیا جانو اسے اور اس کے لچھنوں کو، یہ حرنوں کی بنی ہوئی ہے اس کا کاٹا پانی بھی نہ مانگے، بس آفت کی پڑیا ہے۔ یہ باقی صفدر کے متعلق ٹھیک کہا تم نے، وہ بیشک بھولا بھالا لڑکا ہے۔

دفعتہً زلیخا کی حمیت بیدار ہوئی، وہ جواب تک ہر طرح کے ظلم سہتی اور زیادتیاں برداشت کرتی چلی آتی تھی۔ کہنے لگی۔

چچی جان۔

اتنی بڑی گالی چچی جان برداشت نہ کر سکیں، کہنے لگیں میں کیوں۔ ہوئی تیری چچی جان —

وہ بھی اس وقت دوسرے ہی عالم میں تھی کہنے لگی۔

واقعی میں نے غلطی کی، آپ کو چچی کہنا اس مقدس لفظ کی توہین کرنا ہے آپ میری کوئی نہیں ہیں۔ میں آپ کی کوئی نہیں ہوں۔ بہر حال آپ جو کچھ

بھی ہیں کان کھول کر سن لیجئے، یہ باتیں میرے لئے قطعاً ناقابل برداشت ہیں۔

چچی جان پر سکتہ سا طاری ہو گیا، اس بے زبان سے اس تیز گفتاری کی انہیں ذرا بھی امید نہ تھی۔

زلیخا نے اپنی گفتگو کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا۔

صفدر صاحب کو میں نے نہیں بلایا تھا۔ وہ خود آئے تھے خود بیٹھے تھے، خود باتیں شروع کر دیں۔ انہوں نے۔

" اچھا مان لیا، وہ خود آیا تھا۔ مگر وہ ٹھہرا مرد ذات تو ٹھہری لڑکی تو کیوں نہ اُٹھ گئی؟"

" کیوں اٹھ جاتی؟" کیا میں کسی غیر کے گھر میں ہوں؟ یہ گھر میرا ہے میرے باپ کا ہے، میرا جہاں جی چاہے گا بیٹھوں گی۔ اگر آپ کی طرف کا کوئی آدمی آتا ہے، تو اس کے سر پہ جوتیاں برسائیے، مجھ سے کچھ کہنے سننے کا آپ کو ذرا بھی حق نہیں۔"

" میں کہتی ہوں، کچھ ہوش میں ہے جانتی ہے۔ کس سے باتیں کر رہی ہے؟"

(۶)

کلثوم کا خیال تھا۔ یہ الفاظ سن کر زلیخا گھبرا جائے گی۔ اسے اپنی بے حقیقتی کا احساس ہو جائے گا۔ ان کی بڑائی اور عظمت کے سامنے سرنگوں ہو جائے گی۔

لیکن ایسا نہیں، ان الفاظ سے وہ ذرا بھی متاثر نہیں ہوئی۔ اسی تیور اسی انداز اور اسی لب و لہجہ میں کہا۔

بالکل اپنے ہوش میں ہوں، مجھے معلوم ہے میرے سامنے کون کھڑا ہے، وہ کوئی بھی ہو۔ میری زبان نہیں بند کر سکتا۔ میری توہین نہیں کر سکتا۔ مجھے ذلیل نہیں کر سکتا!

کلثوم جواب میں کچھ نہ کہہ سکی اور زلیخا کمرے سے چلی جارہی تھی۔

بہت دن میں نے ظلم سہے، زیادتیاں برداشت کیں، سلواتیں سنیں ذلتوں کا سلوک سہا۔ لیکن اب پانی سر سے اونچا ہو چکا ہے۔ اب جام چھلک چکا ہے بس ابھی نادرہ کو لے کر بیگم کوٹ جاتی ہوں اور ابا جی سے کہتی ہوں کہ جس طرح ایک میان میں دو تلواریں نہیں رہ سکتیں، اسی طرح اس گھر میں میرا اور نسیم کی والدہ کا گزر نہیں ہو سکتا۔ انہیں میرے ساتھ چھٹی لے کر ورنہ استعفیٰ دے کر آنا پڑے گا اور جھگڑے کا فیصلہ کرنا ہی پڑے گا۔

امتیاز کے پاس تن تنہا جائے گی۔ ان سے ساری داستان بیان

کرے گی، ایک کی دس دس لگائے گی اور ان سے، کہے گی کہ اب اس گھر میں ایک بیان کی طرح دو تلواریں نہیں رہ سکتیں۔"

یہ سوچ کہ کلثوم تن بدن سے کانپ گئی، وہ سمجھ گئی اگر ایسا ہوا۔ تو قیامت آجائے گی، امتیاز کا غصہ خدا کی پناہ، وہ اس گھر میں آگ لگا دے گا، وہ اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دے گا۔ دونوں بھائی اب تک چاؤ پیار سے رہتے چلے آ رہے ہیں، اب دونوں میں لڑائی ہو گی۔ اور کون جانے اس لڑائی کا نتیجہ کیا ہو گا؟ وہ (احراز) بے شک میرے ہم خیال ہیں، مجھے چھوٹ دے رکھی ہے۔ انہوں نے، لیکن اگر بھائی کی طرف پلٹ گئے تو چٹیا پکڑ کر نکال بھی دیں گے مجھے۔

پھر خیال آیا۔ کیا بھائی صاحب (امتیاز) اس زلیخا کی باتوں کا یقین کر لیں گے؟ دل نے جواب دیا۔ ضرور کر لیں گے۔ کیا تو ایک عرصہ سے دیکھ نہیں رہی ہے کہ ان کا رویہ ایک عرصہ سے بدلا ہوا ہے۔

کچھ لاجواب سی ہو کر کہنے لگیں۔

"کیا تو بھائیوں میں فساد ڈلوائے گی۔"

وہ بے پروائی سے بولی، مجھے کوئی بھی پرواہ نہیں ہے فساد کی۔ اب میں صبر نہیں کر سکتی، اب میرے لئے یہ باتیں سہنا کسی طرح بھی ممکن نہیں!"

دفعتہً کا لب و لہجہ بدل گیا،

کہنے لگیں۔

کیا چھوٹوں کا برتاؤ بڑوں کے ساتھ یہی ہوتا ہے کہ ایک کی دس سنائیں اور اگر یہ ہوتا ہے۔ تو سنا لیں تم نے۔ آخر میں تمہارے چچا کی بیوی ہوں۔ تمہاری بڑی ہوں۔ کیا مجھے یہ حق نہیں کہ اگر تم سے کوئی غلط کام سرزد ہوتے دیکھوں، تو ٹوک سکوں۔"

نہ بولی بزرگ گالیاں نہیں دیتے، طعنوں سے سینہ نہیں چھیلا کرتے دوسروں کے سامنے چھوٹوں کو ذلیل نہیں کرتے، گفتنی اور ناگفتنی باتیں

نہیں کہتے، غلط، رکیک اور شرمناک الزام نہیں لگاتے۔ آپ نے یہ سب کچھ کیا ہے، کس طرح آپ کو بزرگ مان لوں ۔

بڑی حسرت کے ساتھ کلثوم نے پوچھا۔

" اچھا تو اب میں تیری بزرگ بھی نہیں رہی، کیا تو خدا کے فیصلہ کو بھی بدل دے گی، کیا میں تیری ماں کے درجہ میں نہیں، کیا تو ایسی باتیں بھابی (مریم) سے بھی کہہ سکتی تھی، کیا ان کے سامنے تو مجھ سے یہ طرز گفتگو اختیار کر سکتی تھی"!

(۷)

اس دردناک اپیل پر زلیخا کا دل پسیجا!

لیکن اسی اثنا میں ایک واقعہ رونما ہو گیا۔ نسیم جو شاید آڑ سے باتیں سن رہی تھی کھل کر سامنے آ گئی۔ اس نے آتے ہی ماں کے پہلو میں کھڑے ہو کر زلیخا سے کہا۔

"بہت زبان چل گئی ہے تمہاری۔"

وہ حقارت کی ایک نظر اس پر ڈالتی ہوئی بولی۔

"میں تم سے بات کرنا نہیں چاہتی!"

نسیم نے اسے بھڑکاتے ہوئے کہا۔

"آہا تو یہاں کون مرا جا رہا ہے، تم سے بات کرنے کو؟"

"بے غیرت، بے شرم، غیر مردوں سے باتیں کرتے لجاتی بھی نہیں۔ آخر وہ تیرے کون ہوتے تھے، جو ان سے یوں گھل مل کر باتیں ہو رہی تھیں؟"

"وہ بھپر کر بولی۔" ایک اوباش اور بدمعاش شخص سے میرا کیا تعلق ہو سکتا ہے؟ میری پیزار بات کرتی ہے اس سے!"

نسیم کو بات بڑھانے کا موقعہ مل گیا۔

"تو نے بدمعاش اور اوباش کسے کہا۔

وہ بے پروائی سے گویا ہوئی۔

وہی جس کا نام لیتے شرماتی ہو۔ جو تمہیں بے وقوف بنا رہا ہے اور

اپنی افتاد طبیعت سے باز نہیں آتا۔ جو بد نظر بھی ہے۔ بد چلن بھی اور جھوٹا بھی ــ

کلثوم نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ سوال کیا۔

" یہ صفدر کو کہہ رہی ہو تم ؟"

" وہ بولی" جی ہاں ان کا یہی نام ہے "

کلثوم کے آنے کے ذرا دیر رقیہ بیگم بھی آ گئی تھیں اور موقعہ واردات پر موجود تھیں۔ اپنے فرزند دلبند کے متعلق یہ الفاظ سن کر ان کا خون کھول گیا، کہنے لگیں۔

" میری لڑکی اگر ایسی ہوتی تو اس کا گلا گھونٹ دیتی !"

وہ زہر خندہ کرتی ہوئی۔ لڑکے کی خبر تو لیجئے، ہو سکے تو اس کا گلا گھونٹ آیئے جا کر !"

وہ لڑنے بلکہ مارنے مرنے کے لئے بالکل تیار تھیں کہنے لگیں۔

" تیرا نہ گھونٹ دوں گلا ابھی ؟"

وہ بولی اگر ہمت ہو تو شوق بھی پورا کرنے کی کوشش کر لیجئے آپ کو خود ہی معلوم ہو جائے گا، کون کس کا گلا گھونٹ سکتا ہے۔

دفعتہً مڑیں اور کلثوم سے مخاطب ہوئیں۔

اے بہن سن رہی ہو تم اس لڑکی کی باتیں ؟ واقعی یہ تمہارا ہی دل گردہ ہے کہ اس گھر میں رہتی ہو اور اس کے ساتھ گزارا کر لیتی ہو۔ میں تو ــ

شاہینہ نے قفل سکوت توڑا اور کہنے لگی۔

لیکن امی جان، ایمان کی بات یہ ہے کہ زلیخا کی کوئی خطا نہیں ہے "پھر کر پوچھا۔" پھر کس کی ہے ؟ کیا صفدر کی، تیرے بھائی کی۔

یہ درد ناک اپیل کارگر نہ ہوئی، اس نے کہا۔

یہ تو بڑی شرمیلی، نیک اور شریف معلوم ہوتی ہیں، بھیا خود سے یہاں آئے اور بیٹھ گئے اور ان سے باتیں شروع کر دیں۔ لیکن انہوں نے منہ لگایا نہ کسی بات کا سیدھے منہ جواب دیا۔"

رقیہ نے خونخوار آنکھوں سے شاہینہ کو گھورا اور کہا۔

واقعی قیامت قریب ہے بہن بھائی کے خلاف گواہی دے رہی ہے نہ زمین پھٹتی ہے نہ آسمان ٹوٹتا ہے نہ جانے کیا ہونے والا ہے میرے اللہ — جاؤ دے دو زہر اسے، کر دو اس کا کام تمام۔"

شاہینہ کے پاس ان باتوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ خاموش ہو گئی زلیخا نے مزید گفتگو بیکار سمجھ کر اپنے کمرے کا رُخ کیا۔

کمرے میں پہنچی تو نادرہ موجود تھی، اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، چٹ اس کی بلائیں لیں، پھر مسکراتی ہوئی کہنے،

خدا نظر بد سے محفوظ رکھے۔ آج تو بیٹا کمال کر دیا تم نے! میں تو اتنی خوش ہوں کہ بیان نہیں کر سکتی،

لیکن زلیخا نے کوئی جواب دیا، چپ چاپ بستر پر دراز ہو گئی وہ بظاہر خاموش تھی، لیکن دل میں طوفان انگڑائیاں لے رہا تھا۔

(۸)

زلیخا چادر اوڑھے بستر پر دراز تھی اور حال اور مستقبل کا جائزہ لے رہی تھی۔ اتنے میں کسی کی آہٹ محسوس ہوئی، اس نے منہ سے چادر ہٹا کر دیکھا۔ تو شاہینہ تھی۔

وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی بڑے تپاک اور گرمجوشی کے ساتھ اسے بلایا اور بٹھایا وہ نہیں نہیں کرتی رہ گئی۔ لیکن یہ جلدی سے چائے بنا لائی پھر کہنے لگی۔

تمہارے آنے سے میرا دل بہت خوش ہے، تم میں انسانیت اور شرافت کا جوہر ہے اور کون ہے جو اس کی قدر نہ کرے گا۔ آج تم نے سچی بات کہہ کر وہ بھی اپنے بھائی کے معاملہ میں اپنی پھپھی کے سامنے اور اپنی ماں کی موجودگی میں اپنے آپ کو بہت اونچا کر لیا ہے۔

"وہ مسکرانے لگی" خوب بنا لو جی بھر کے۔ کچھ اور کہنا ہے، وہ بھی کہہ ڈالو!"

زلیخا نے سنجیدگی کے ساتھ کہا۔

شاہینہ میں جھوٹ نہیں بولتی۔ کس طرح اپنا دل چیر کر دکھا دوں؟"

وہ ہنستی ہوئی کہنے لگی۔

میری نگاہیں دل کو اور جو کچھ دل کے اندر ہے دیکھ لیتی ہیں، آج واقعی تمہارے ساتھ بہت زیادتی ہوئی اور تم نے بھی کوئی کسر نہیں

"اٹھا رکھی، اچھا کیا!"

"وہ بولی !" کیا کروں شاہینہ اس گھر میں رہنا مجھے دو بھر ہو گیا ہے۔ حالانکہ جتنا یہ نسیم کا ہے، اتنا ہی میرا بھی ہے۔"

تائید کرتے ہوئے اس نے کہا۔

"کیوں نہیں" بے شک ہے؟"

بڑی دیر تک دونوں میں اس طرح خلوص اور بیباک کی باتیں ہوتی رہیں پھر یک بیک شاہینہ نے سنجیدہ لب و لہجہ میں کہا۔

آج جو کچھ ہوا اس کی سب سے زیادہ ذمہ داری میرے اوپر ہے نہ میں تمہیں بلاتی، نہ یہ فتنہ اٹھتا، بہت شرمندہ ہوں کہ میری وجہ سے۔ قطع کلام کرتے ہوئے اس نے کہا۔

"تمہاری کوئی خطا نہیں تھی۔ تمہارا کوئی منصوبہ مجھے ذلیل اور رسوا کرنے کا نہیں تھا۔ وہ تو نسیم اور چچی جان موقع کی تاک میں تھیں وہ مل گیا اور دل کی بھڑاس نکال لی اچھی طرح!"

"اچھا تو کیا واقعی تم مجھے قصوروار نہیں سمجھتیں؟"

"بالکل نہیں!"

"نہیں میرے۔ خلوص کا یقین ہے۔"

"ہاں ۔ سچے دل سے!"

"تو ایک بات میری ماننی پڑے گی تمہیں؟"

"ضرور مانوں گی، تم کوئی بات ایسی کہہ ہی نہیں سکتی جو ماننے والی نہ ہو۔" آج جو کچھ ہوا اسے بس یہیں ختم کر دو۔

"کیا چاہتی ہو تم؟ میں سمجھ نہیں سکی"

میں چاہتی ہوں کہ آج جو کچھ ہوا، اس کی خبر تمہارے والد کو نہیں ہونی چاہیے، کسی طرح بھی نہیں۔"

"اس میں کیا مصلحت ہے"

مصلحت تو کوئی بھی نہیں، میرا ضمیر مطمئن ہو جائے گا، میں سمجھوں

گی۔ میری حماقت سے جو فساد برپا ہوا تھا۔ وہ آگ بن کر اس گھر کو جلا نہ سکا۔ اگر تم نے اپنے والد سے کہا یا خود ان کے پاس گئیں تو اس کا نتیجہ واقعی دونوں بھائیوں کے درمیان تلخی اور بدمزگی کی صورت میں برآمد ہوگا۔ میں نہیں چاہتی کہ میری وجہ سے ایسا ہو؟"

تمہاری وجہ سے کیوں۔ کیا یہ کوئی نئی بات تھی، کیا اس طرح کے فتنے نہیں اٹھتے، فساد نہیں ہوتے؟"

اٹھتے ہوں گے، ہوتے ہوں گے۔ آج کے بعد جب کبھی ایسا ہو تو بے شک تمہیں اختیار ہے جو چاہے کرنا۔ لیکن آج کے واقعہ کو بھول جاؤ۔ اس طرح میرے دل کا بوجھ اتر جائے گا۔ کیا تم میری اتنی سی بات نہیں مان سکتیں؟ یہ مجھ پر بہت بڑا احسان ہوگا ... زندگی بھر ممنون رہوں گی تمہاری۔"

میری سمجھ میں نہیں آتا۔ آخر تمہیں اس کا اتنا احساس کیوں ہے۔ ویسے بھی تھا۔ اور اب اس لئے زیادہ ہے کہ پھپھی کا خیال ہے کہ اگر میں تمہیں چائے کے لئے نہ بلاتی تو نہ بھیا وہاں پہنچتے نہ بات اتنی بڑھتی نہ تمہارے والد اور پھوپھا جان کے درمیان تلخی اور بدمزگی کا امکان پیدا ہوتا۔

ساری صورت حال زلیخا کی سمجھ میں آگئی، اس نے کہا۔
اگر یہ بات ہے تو خیر ...

(۹)

شاہینہ کے جانے کے بعد زلیخا سوچنے لگی، دونوں بہن بھائی ہیں کتنا زمین آسمان کا فرق ہے، ایک ماں کے پیٹ سے پیدا ہونے والی یہ دونوں ہستیاں ایک دوسرے سے طبیعت، مزاج، اخلاق اور سیرت میں کتنی مختلف ہیں۔

صفدر کے لچھن چند ہی دنوں میں الم نشرح ہو گئے اور شاہینہ کے گن بھی چند روز میں نظر کے سامنے آ گئے دونوں میں وہی فرق جو زمین اور آسمان میں ہے، وہ بد نفس ہے، بدنظر ہے، بد چلن ہے۔ یہ خوش اخلاق ہے، خوش مزاج ہے خوش کردار ہے۔

اور پھر نہ جانے کیوں یکایک خیال آیا۔ یہ شاہینہ اور صفدر کا فرق نہیں ہے۔ مرد اور عورت کا فرق ہے، اپنی فطرت کے اعتبار سے مرد کچھ ہوتا ہی خود پسند ہے اور بچاری عورت، وہ تو صرف اس لئے ہے کہ دوسروں کے غم کو اپنا غم بنا لے،

اس نے وعدہ کر لیا تھا۔ کہ امتیاز کے پاس نہیں جائے گی، اسے خط نہیں لکھے گی، لیکن بار بار حیرت کے ساتھ وہ سوچتی آخر میں نے نسیم کا یا چچی جان کا کیا بگاڑا ہے، کیوں یہ لوگ میرے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑھ گئے ہیں کسی کے برے بھلے میں نہیں، کسی معاملہ میں دخل نہیں دیتی، کسی بات کی ٹوہ نہیں لیتی۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے نہ جانے کتنی پشتوں

سے دشمنی چلی آرہی ہے، میری اور ان ماں بیٹی کی،
پھر اس کا ذہن امتیاز کی طرف گیا۔
وہ سوچنے لگی، انہیں اب میری بے چارگی، بے بسی اور پریشانی کا احساس ہو چلا ہے، وہ اب مجھ سے وہی برتاؤ کرنے لگے ہیں جو ایک شفیق باپ کا، اپنی بیٹی سے ہونا چاہیئے، لیکن وہ بھی میرے کیا کام آسکتے ہیں وہ یہاں ہوتے بھی ہیں، تو کیا کام آتے ہیں، وہ باہر ہیں اندر اور یہ میری عادت نہیں کہ ہر وقت ادھر کی اُدھر لگاتی رہوں، ہر وقت شکایتوں کا دفتر کھول کر بیٹھ جایا کروں۔
اور پھر عالم تصور میں اعجاز سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔
چہرہ اترا ہوا۔ کپڑے پھٹے ہوئے۔
اعجاز کی یہ حالت دیکھ کر اس کا دل مسل گیا، وہ سوچنے لگی، اس کی یہ حالت میری ہی وجہ سے ہوئی ہے، کاش میری نظر نسیم کی گھڑی پر نہ پڑی ہوتی، بلا سے کوئی چرا لیتا، اور اگر میری نظر پڑی تھی تو میں نے اس منحوس چیز کو اٹھایا نہ ہوتا۔ اور اگر اُٹھایا تھا۔ تو بھیا کے پاس سے جاکر انہیں شریک سازش نہ کیا ہوتا۔
ان پر یہ ساری مصیبتیں میری وجہ سے نازل ہوئی ہیں!
انہوں نے ذلیل ہونا گوارا کر لیا۔ اس گھر کو جہاں وہ پیدا ہوئے تھے، جو ان کے باپ کا اور دادا کا گھر تھا۔ چھوڑنا منظور کر لیا، لیکن میرا نام زبان پہ نہ لائے۔
بہن پر کسی طرح کی آنچ نہ آنے دی۔
ایسے بھی بھائی ہوتے ہیں۔
میرا قابل فخر بھائی!

وہ نہ جانے کہاں کہاں کی ٹھوکریں کھا رہا ہے، فقر و فاقہ کی زندگی بسر کر رہا ہے، نہ جانے تندرست ہے یا بیمار، زندہ ہے یا —
اس سے آگے وہ کچھ نہیں سوچ سکی، دل اُمنڈ آیا، آنکھیں بھر آئیں

اور گریہ بے اختیار نے اسے سسکیوں اور ہچکیوں پر مجبور کر دیا۔ اس اکیلے کمرے میں اس تنہائی کی محفل میں کوئی ایسا نہ تھا۔ جو اس کے آنسو پونچھتا، اسے دلاسا دیتا، اس کے قلب ناشکیب پر ہاتھ رکھتا۔

بڑی دیر اسی طرح گزر گئی اور پھر نہ جانے کب سو گئی۔

(۱۰)

روورو اور دوبدو معرکہ آرائی کے بعد کلثوم نے زلیخا سے بات چیت بند کر دی تھی، اعزاز کی بھی تیوریاں چڑھی ہوئی تھیں وہ پہلے بھی شاذو نادر ہی اس بات کرتا تھا۔ مگر اب تو ایسا معلوم ہوتا تھا، صورت دیکھنے کا بھی روادار نہیں ہے نیم سے آنکھیں چار ہوتی تھیں تو شعلے برستے نظر آتے تھے، مگر اسے ذرا بھی پرواہ نہیں تھی۔ اس نے طے کر لیا تھا۔ ان لوگوں سے نہ اب دبے گی نہ اُن کی دل خراش اور جان سوز باتوں پر خاموش رہے گی۔ شاید اس کے ان تیوروں کو یہ لوگ بھی پہچان گئے تھے۔ لہٰذا الگ الگ رہتے تھے، جیسے اچھوت سے برہمن۔

" لیکن شاہینہ سب سے الگ تھی، اسے تو جیسے زلیخا سے محبت ہو گئی ہو۔ جب دیکھئے، جب موجود اس کے زیادہ آنے جانے سے زلیخا گھبراتی تھی، اسے ڈر لگتا تھا۔ کہیں شاہینہ کا یہ التفات بھی پیام مصیبت نہ بن جائے کسی دن؟"

اور ایک دن اس اندیشہ نے واقعہ کی صورت اختیار کر لی۔

شاہینہ حسب معمول آئی اور پاس بیٹھ گئی، پوچھا۔

" کیا ہو رہا ہے؟"

" جواب ملا " تمہاری یاد!" وہ ہنس پڑھی " تو تمہاری یاد کھینچ کر لائی ہے مجھے!"

ہاں۔ کچھے دھاگے ہیں۔

زلیخا یہاں سے جانے کے بعد تم بہت یاد آؤ گی!"

تو نہ جاؤ۔

جی تو نہیں چاہتا ہے لیکن جانا ہی پڑے گا؟"

" کیوں جانا پڑے گا؟"

" بھلا اپنا گھر چھوڑ کر کب تک دوسری جگہ رہا جاسکتا ہے!"

" تو کیا یہ تمہارا گھر نہیں ہے؟"

" ہاں ہے تو — مگر؟"

" مگر کیا؟ — اپنا گھر چھوڑ کر سسرال بھی تو جاؤ گی؟"

بے تکلفی سے لیکن ذرا شرماتے ہوئے، لڑکی کے لئے اپنا گھر سسرال ہی تو ہوتا ہے؟—

" کہاں بات ٹھہری ہے؟"

" وہیں اپنے شہر میں۔"

" کون لوگ ہیں وہ۔"

" اپنے کنبہ کے ہیں۔"

" دولہا کیسا ہے۔"

(ہنس کر) اگر عورت ہوتا تو تم جیسا ہوتا۔"

" دل لگی چھوڑو۔ پسند ہے تمہیں۔"

کیوں نہیں پسند ہے؟" کیا اچھی چیز بھی ناپسند کی جاتی ہے۔"

" کیا محبت ہے تم دونوں میں؟"

" شاہینہ نے منہ سے جواب نہیں دیا، ایک ادا کے ساتھ سر ہلا کر اقرار کر لیا۔"

زلیخا نے سوال کیا" ہمیں بلاؤ گی، اپنی شادی میں۔"

اگر آنے کا وعدہ کرو۔ تو ضرور بلاؤں گی۔"

" کر لیا وعدہ۔"

"تو ضرور بلائیں گے!"

"لیکن اگر نسیم روٹھ گئی، صفدر خفا ہو گئے! چچی جان بگڑ گئیں۔ تو دعوت نامہ واپس لے لو گی؟"

"ہرگز نہیں۔ مجھے نہیں معلوم یہ لوگ تم سے کیوں خفا ہیں، لیکن مجھے تو تم بہت اچھی لگتی ہو۔ کاش میری کوئی بہن ہوتی اور وہ تم ہوتیں" اور پھر دفعۃً" گفتگو کا موضوع بدلتے ہوئے اس نے کہا۔

"اب تم بتاؤ؟"

زلیخا سمجھ تو گئی اس سوال کا مقصد کیا ہے لیکن ان جان بن کر پوچھا۔ "میں کیا بتاؤں؟"

"تمہاری شادی کہاں ٹھہری ہے"

زلیخا نے اس سوال کا جواب نہیں دیا، لیکن شاہینہ نے ایک سوال اور کر ڈالا۔

"دولھا کیسا ہے؟"

مگر جب دونوں سوالوں کا جواب نہیں ملا۔ تو اس نے نظر اٹھا کر دیکھا اور محسوس کیا، ان سوالات کا کچھ اثر نہیں پڑا زلیخا پر معصومیت اور سادگی کے ساتھ اس نے پوچھا۔

"کیا خفا ہو گئیں؟"

"وہ بولی۔" بھلا تم سے بھی خفا ہو سکتی ہوں؟"

"شاہینہ نے اصرار کرتے ہوئے پوچھا" پھر ہمارے سوال کا جواب کیوں نہیں دیتیں"؟

وہ کہنے لگی" جواب کس چیز کا دوں؟ شاہینہ تم نہیں جانتیں۔ میری زندگی میں کبھی خوشی نہیں آئی۔ نہ آ سکتی ہے؟ جب سے آنکھیں کھولیں ہیں، روتے، بلکتے بسر ہو رہی ہے اور زندگی کے جو چند دن باقی ہیں۔ خدا کرے وہ جلد ختم ہوں، اسی طرح گزر جائیں گے۔

ان الفاظ میں درد تھا، حسرت تھی، سوز تھا، شاہینہ متاثر ہوئی،

ہمدردی کی نظروں سے دیکھتی ہوئی بولی ۔
ہاں میں سب کچھ جانتی ہوں ، تمہاری والدہ کا انتقال ہو گیا ۔
تمہارے والد کو نہ ان سے کوئی دلچسپی تھی ، نہ تم سے ، تمہارے بھائی کو صحیح تربیت نہ ملی ، اس لیئے چوری تک کرنے لگے ! اس لیئے نکال دیئے گئے ، گھر سے ۔
زلیخا کے لیئے اس سے زیادہ سہنا ناممکن ہو گیا ، اس نے کہا ۔
شاہینہ یہ غلط ہے ، جھوٹ ہے ، بکواس ، میرا بھائی ، میرا بھائی چور نہیں ہے ، وہ ایک لاکھ روپے کی چیز بھی نہیں چرا سکتا ۔ وہ سیر چشم عالی حوصلہ اور اولوالعزم ہے ، ان لوگوں نے بات کا بتنگڑ بنا کر اسے چور بنا دیا ۔ لیکن خدا کی نظر میں وہ بے گناہ ہے ؟
اور پھر اس نے سارا ماجرا شاہینہ کو سنا دیا اور یہ کہنے لگی ۔ تمہارا دل چونکہ صاف ہے ۔ اس لیئے تم یقین کر لوگی ، ان لوگوں کے دل میں کپٹ ہے یہ اپنی ہی کہے جائیں گے لیکن دیکھ لینا ایک وقت آئے گا کہ اس جھوٹ اور تہمت کا پھول کھل کر رہے گا ۔
شاہینہ نے زلیخا کی باتوں کا یقین کر لیا اور کہنے لگی "
تمہاری بات دل کو لگتی ہے ۔ ضرور ایسا ہی ہوا ہوگا ۔ لیکن تم نے کل جیسی بہادری سے کام کیوں نہ لیا ، سب کے سامنے حقیقت بیان کیوں نہ کر دی ؟"
وہ بولی اس وقت تک میں بزدل تھی ، بے حوصلہ تھی اور مجھے پتہ بھی اس وقت چلا جب بھیا یہاں سے نہ جانے کہاں اور کب تک کے لیئے جا چکے تھے ، ورنہ میں انہیں نہ جانے دیتی شاہینہ تم نہیں جانتیں ، وہ کتنے اچھے ، کتنے نیک اور کتنے شریف آدمی ہیں ۔ ٹھہرو میں تمہیں دکھاتی ہوں !"
یہ کہہ کر ، وہ جھپ سے اٹھی اور بکس کھول کارڈ ۔ سائز کا ایک فوٹو لے کر آئی اور شاہینہ کے سامنے رکھتی ہوئی بولی ۔

"یہ ہیں میرے بھیا - کیوں شاہینہ، کیا چور اچکے، لفنگے بدمعاش ایسے ہی ہوتے ہیں!"

اعجاز کی تصویر دیکھ کر شاہینہ بہت متاثر ہوئی کہنے لگی۔

"یہ تو واقعی بڑے اچھے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔"

زلیخا نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

اور شاہینہ ان لوگوں نے میرے اس فرشتہ صفت بھائی پر چوری کی تہمت لگائی، خدا سمجھے گا۔ ان سے!

(۱۱)

شاہینہ دراصل زلیخا کو سینما کی دعوت دینے آئی تھی، آج نسیم کلثوم رقیہ سب سینما دیکھنے جا رہی تھیں۔ وہ ایک ناممکن سی آرزو لیے کر یہاں آئی تھی۔ جانتی تھی زلیخا اس گروہ کے ساتھ نہیں جائے گی۔ پھر بھی اس سے کچھ بھی اس سے کچھ ایسا انس پیدا ہو گیا تھا کہ یہ جانتے ہوئے بھی دعوت دینے پہنچ گئی۔ مگر دعوت دینے کی جرأت نہ کر سکی آتے ہی ایسی باتیں چھیڑیں کہ سینما کا خیال ہی ذہن سے اتر گیا۔

جب کلثوم اور رقیہ تیار ہو چکیں تو شاہینہ کی تلاش شروع ہوئی نسیم نے کہا۔

وہ زلیخا کے کمرے میں ہے۔

کلثوم نے برا سا منہ بنا کر کہا۔ جھاڑو پھیرے اس زلیخا کی بچی پر۔ میں کہتی ہوں آخر شاہینہ اس کو اپنے ساتھ کیوں ہر وقت لگائے رکھتی ہے۔"

یہ تو جوابی تبصرہ تھا۔ پھر رقیہ سے مخاطب ہو کر کہا۔

بہن کہے دیتی ہوں صحبت کا بڑا اثر ہوتا ہے میں اسے بالکل پسند نہیں کرتی کہ میری بچی (شاہینہ) اس حرافہ (زلیخا) کے پاس پاس آمد و رفت رکھے۔

رقیہ نے آواز دی مگر وہاں تک پہنچی نہیں۔ نادرہ سے بلوانا چاہا مگر وہ چھٹی لے کر اپنی بہن کے ہاں گئی ہوئی تھی۔ نسیم سے کہا۔

بیٹی جا بلا لا۔

وہ کانوں پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

مجھے تو معاف ہی کیجئے۔ اس دن آپ تماشہ دیکھ چکی ہیں۔ میں گئی تو میری شامت ہی جائے گی۔

آخر اس مہم کے سر کرنے کا فیصلہ خود رقیہ بیگم نے کیا وہ خراماں خراماں زلیخا کی طرف بڑھیں۔ لیکن ذرا جھجکتی ہوئی جیسے بکری شیر کی کچھار کی طرف جا رہی ہو۔

رقیہ کو وہاں جاتا دیکھ انتہائی نفرت اور بیزاری کے باوجود کلثوم بیگم بھی اپنا شوق تماشہ ضبط نہ کر سکیں۔ سوچا ذرا دیکھیں تو سہی۔ یہ لڑکی وہاں کیا کر رہی ہے اور رقیہ کس طرح پھٹکارتی ہے اسے اور کلثوم کو جاتا دیکھ کر نسیم کے قدم بھی خود بخود اُٹھ گئے۔ اس طرح یہ مختصر سا قافلہ ایک ساتھ زلیخا کے کمرے میں پہنچ گیا۔

زلیخا خاموش تھی اور شاہینہ بڑی توجہ کے ساتھ اعجاز کی تصویر دیکھ رہی تھی۔

رقیہ نے پہنچتے ہوئے کہا۔ ارے لڑکی تو یہاں کر رہی ہے وقت نکلا جا رہا ہے سینما کا، کچھ خبر بھی ہے؟

شاہینہ نے چونک کر ماں کو دیکھا اور کہا چلتی ہوں!!

نسیم کی نظر تصویر پر اتفاقاً یا یوں کہیئے کہ قسمت سے پڑ گئی اس نے باآواز بلند دریافت کیا۔

شاہینہ یہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے۔

"وہ بولی تصویر ہے۔"

نسیم جان چکی تھی یہ اعجاز کی تصویر ہے لیکن معاملہ کو سنگین بنانے کے لئے اور کلثوم اور رقیہ کو پورے طور پر اس حادثہ کی جانب متوجہ

کرنے کے لئے اس نے پوچھا۔

کس کی تصویر ہے ہمیں بھی دکھاؤ۔

شاہینہ نے تصویر اس کی طرف بڑھادی۔ نسیم نے تصویر دیکھی اور حیرت کی کیفیت اپنے اوپر طاری کر کے ماں کی طرف بڑھادی۔

"دیکھنا امی"

"امی جان یہ تصویر دیکھتے ہی بھپٹ پڑیں، شعلۂ جوالہ بن کر بھڑکتی ہوئی بولیں۔"

یہ تصویر تیرے پاس کیسے آئی۔

شاہینہ نے بے دھڑک جواب دیا۔

زلیخا کے بھائی کی ہے اس نے۔

کلثوم نے وہ تصویر رقیہ کی طرف بڑھادی اور کہا۔

"دیکھا بہن؟ دیکھ لیا؟" اس لئے میں پسند نہیں کرتی کہ لڑکی کہیں آئے جائے۔

دیکھا بہن؟ دیکھ لیا۔؟ اس لئے میں۔

پھر رقیہ بدنصیب زلیخا کی طرف متوجہ ہوئیں اور فرمایا۔

میں کہتی ہوں، اس چولے، دغاباز اور اوباش کی تصویر تو میری بچی کو دکھا رہی تھی۔

کیسا اندھیر ہے؟ - میں کہتی ہوں، واقعی قیامت قریب آگئی ہے ماشاللہ جوان جہان لڑکی (شاہینہ) کو ایک غیر مردوے (اعجاز) کی تصویر

اکیلے میں بیٹھ کر دکھائی جارہی ہے کیوں کس لئے؟

یہ سن کر شاہینہ بھی اپنے آپ کو مجرم سمجھنے لگی اور رقیہ بیگم کا پارہ تو نقطۂ عروج پر تھا۔ کہنے لگیں۔

اس خدائی خوار کی تصویر میری بچی کو کیوں دکھائی جارہی تھی۔ زلیخا۔

کلثوم نے لقمہ دیا۔ ڈورے ڈالے جارہے تھے۔ میری معصوم بچی پر۔

نسیم ہنسنے لگی۔ اور اس ہنسی میں کس بلا کا زہر تھا اسے صرف زلیخا اور کسی حد تک شاہینہ محسوس کر سکی۔

دفعتہً کلثوم نے ایسی فضا پیدا کر دی تھی جس سے عہدہ برآ ہونا شاہینہ جیسی سادہ لوح لڑکی کے لئے آسان نہ تھا۔ وہ اپنے آپ کو بڑی پارسا اور نیک سمجھتی تھی، لیکن اب ایسا محسوس کر رہی تھی جیسے کوئی بہت بڑا جرم سرزد ہو گیا ہے! اس سے۔

جب اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا، تو وہ رونے لگی۔ ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر

(۱۲)

شاہینہ کو روتے دیکھ کر کلثوم نے فوراً دو قدم آگے بڑھ کر، اسے کلیجہ سے لگایا، محبت سے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرتی ہوئی بولیں۔
روتی کیوں ہے میری بچی! میں جانتی ہوں تو کتنی معصوم ہے، یہ سارا فساد تو اس چوٹے کی بہن کا برپا کیا ہوا ہے، جو خود بھی حرفوں کی بنی ہوئی ہے۔
زلیخا نے کہا۔ نہ میرا بھائی چوٹا ہے، نہ میں حرفوں کی بنی ہوئی ہوں
کلثوم کی ذیل فطرت پھر ابھر آئی، اس نے نقل اتارتے ہوئے کہا
اے چل بڑی آئی ہے پارسا بن کر۔ میں کہتی ہوں آخر تجھے ضرورت کیا تھی، اس ڈاکو کی تصویر میری بچی کے ہاتھ میں پکڑانے کی۔"
زلیخا نے جواب دیا" تو کون سا جرم ہو گیا؟ وہ بھی کوئی غیر تو نہیں ہیں۔"
" ہاں ہاں وہ تو بڑے اپنے ہیں۔ جب ہی تو چچا زاد بہن کی گھڑی لے اڑے اور کسی غیر نے نہیں سگے باپ نے جوتے مار کے گھر سے نکال دیا۔ اب ہو گا کسی جیل کی کال کوٹھڑی میں، ضرور یہاں سے جا کر بھی کہیں چوری کی ہو گی۔"
زلیخا نے چیخ کر بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔
" یہ غلط ہے!"

وہ زہر خندہ کرتی ہوئی بولیں۔
"اچھا تو کسی محل میں عیش کر رہا ہوگا۔"
زلیخا نے کہا "میرا بھائی، چور نہیں تھا، ڈاکو نہیں تھا۔"
اس نے زہر خند کے ساتھ جواب دیا۔
ہاں نصیب دشمناں وہ کیوں چور ہوتا، چور تو ہم ہیں، ہم نے اپنی چیز چرائی اس کی جیب میں رکھ دی!"
زلیخا اور زیادہ برہم ہو کر گویا ہوئی!
"میں اپنے بھائی کے لئے ایسے غلط اور ناشائستہ الزامات نہیں سن سکتی۔"
مصنوعی سنجیدگی کے ساتھ کہنے لگیں۔
وہ سننا ہی پڑیں گے۔ بنو۔ جو جیسا ہوگا ویسا ہی کہا جائے، چور کو چور ہی کہتے ہیں۔ ساہوکار نہیں کہتے؟ یا ممکن ہے آج کل کے زمانے میں کہتے بھی ہوں، ہمیں کیا معلوم۔
"نسیم ہنس پڑی۔" امی چلئے دیر ہو رہی ہے؟"
"امی نے جواب دیا۔" بس جا چکے، وقت ہی ختم ہو گیا، کل دیکھا جائے گا۔ نسیم نے تلخی کے ساتھ جواب دیا۔
یہ بھی اچھی رہی۔
"اب تو واقعی اس گھر میں رہنا مشکل ہو گیا ہے!"
کلثوم پھر اپنے اصلی موضوع پر آگئیں، کہنے لگی۔
میں کہتی ہوں، بھائی تم چور ہو یا ساہوکار، لونڈی ہو یا رانی ہمیں مطلب نہیں، تم جانو اور تمہارا کام، لیکن یہ شرافت نہیں ہے کہ دوسروں کی بھولی بھالی، سیدھی سادھی، نیک اور سادہ لوح لڑکیوں کو اپنے ہاں
بلاؤ، اور پھر انہیں بہکانے اور گمراہ کرنے کی کوشش کرو۔
رقیہ کے ہاتھ میں اب تک اعجاز کی تصویر موجود تھی۔ ایک مرتبہ اس پر حقارت اور نفرت سے بھری ہوئی نظر ڈالی پھر گویا ہوئیں۔

ہونہہ، صورت نہ شکل، بھاڑ میں سے نکل، کچھ صورت بھی ہے، معلوم ہوتا ہے، کسی چانڈو خانے سے چرس پی کر چلا آرہا ہے (کلثوم سے مخاطب ہو کر کہا) بہن چاہے تمہیں برا لگے یا بھلا، میں تو اس بات کا فیصلہ کر کے جاؤں گی۔

" نسیم نے پوچھا، ممانی جان فیصلہ کیا؟"

وہ بولیں کہ ان (زلیخا) صاحبزادی کے ابا جان آئیں، ان سے پوچھوں گی، یہی تربیت دی ہے، آپ نے لڑکی کو؟ یہی سکھایا ہے کہ وہ دوسرں کی لڑکیوں کو پر چائے اور گمراہ کرے؟ آخر منحوس شخص کا میری بچی سے کیا واسطہ تھا۔

" کیوں یہ تصویر دی گئی اسے؟ "کس لئے، کس مقصد سے؟

ہاں۔ نسیم نے اکساتے ہوئے۔ ہاں ان سے آپ ہی بات کر سکتی ہیں۔ ہم لوگ تو نہیں بھڑ سکتے، وہ سمجھیں گے ہم دشمنی کی وجہ سے ایسا کر رہے ہیں رقیہ بیگم نے سینہ ٹھونکتے ہوئے کہا۔

ہاں میں چھیڑوں گی بات وہ کون سے ایسے رستم ہیں اور ہیں تو اپنے گھر کے ہوں گے، ہمیں کسی سے دبنے کی کیا ضرورت ہے۔

کلثوم نے اعجاز کی تصویر رقیہ کے ہاتھ سے لے لی، اس کے ٹکڑے ٹکڑے کئے اور فرش پر پھینک دیئے، پھر رقیہ سے کہا۔

چلو بہن، یہاں وقت ضائع کرنے سے کیا فائدہ؟ بھائی آئیں تو ان سے بات کرنا۔ ان لوگوں کے جانے کے بعد زلیخا نے پھٹی ہوئی تصویر کے بکھرے ہوئے ٹکڑے اٹھائے، انہیں ایک لفافہ میں ڈالا اور احتیاط سے بکس میں رکھ دیا۔

انقلاب

یہ دو دن میں کیا ماجرا ہو گیا ؟

(۱۰)

نسیم کی منگنی بڑی دھوم دھام سے صفدر کے ساتھ ہو گئی۔

اس رسم میں اتنی شان و شوکت کا مظاہرہ کیا گیا تھا، کہ کیا شادی میں ہوتا ہوگا۔ سارا گھر مہمانوں سے بھرا ہوا تھا، مرد بھی اور عورت بھی غیر بھی اور شناسا بھی، عزیز بھی اور دور کے رشتہ دار بھی، اہل محلہ بھی اور اہل عملہ بھی،

احراز کی تنخواہ بھی معقول تھی، اور بالائی آمدنی بھی اچھی خاصی تھی، یہ سب جانتے تھے، لیکن یہ بات کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی، کہ وہ اتنا زیادہ مالدار ہے کہ صرف منگنی پر یوں بے دریغ روپیہ صرف کر سکتا ہے جو لڑکی کی منگنی اس شان سے کر سکتا ہے، وہ شادی میں، کیا کچھ نہ کرے گا۔

زلیخا ایک قیدی کی طرح اپنے کمرے میں دن بھر قید رہی، نہ اسے اس تقریب سعید میں شرکت کے لئے بلایا گیا، نہ وہ خود ہی حوصلہ کر سکی شاہینہ بھی اعجاز کی تصویر کے واقعہ کے بعد سے اتنی سہم گئی تھی کہ گو اس کا کئی بار جی چاہا، کہ زلیخا کے کمرے میں جائے اور اسے لے آئے مگر ہمت نہ پڑھی نہ جانے پھر کوئی نیا فتنہ اٹھ کھڑا ہو، اور لینے کے دینے پڑ جائیں، بس یہ سوچ کر وہ دل مسوس کر رہ گئی اور زلیخا کو شریک ہونے کی دعوت نہ دے سکی۔

آج نادرہ بھی بہت مصروف تھی لیکن اس غیر معمولی مصروفیت کے باوجود تھوڑے تھوڑے وقفہ سے زلیخا کے کمرے میں آکر تاک جھانک لیتی رہتی تھی، اور ایک مرتبہ تو خوان میں رکھ کر، دوسروں کی نظر بچا کے اور موقع دیکھ کر بہت سا نہایت عمدہ کھانا بھی لے آئی، آج کیا کچھ نہ پکا تھا۔ سب کا نمونہ اس خوان میں موجود تھا۔

لیکن زلیخا اس پُر خلوص پیش کش کو قبول نہ کر سکی، اس نے کہا۔

"نادرہ یہ سے جاؤ، میں ایک لقمہ بھی نہ کھاؤں گی، ہر گز نہیں۔" یہ بات اس نے کچھ تیور سے کہی کہ نادرہ کچھ نہ کہہ سکی، الٹے پاؤں خوان واپس لے کر چلی گئی۔

زلیخا نے آج کچھ نہیں پکایا۔ اسے یہ اچھا نہیں معلوم ہوا کہ اس ہجوم عام میں وہ اپنے کمرہ سے نکل کر باورچی خانے جائے اور اپنا چولہا سلگائے، اعتراضات شروع ہو جائیں، ممکن ہے اس پر بھی اُنگلیاں اُٹھنے لگیں۔ طنز و تعریض کے تیر پھینکے جانے لگے۔ عافیت اس میں تھی کہ اپنے کمرے میں چپ چاپ بیٹھی رہے بلا سے ایک دن فاقہ سہی کون سی موت آجائے گی ایک دن کے فاقہ میں۔

لیکن شام تک یہ کڑاکے کا فاقہ کھلنے لگا، بھوک نے بیتاب کر دیا۔ آج دن بھر اس چائے بھی نہیں پی تھی، اس لئے طبیعت اور زیادہ بے قابو تھی۔

آخر جب کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ تو اُٹھ کر ٹہلنے لگی اور جب بھوک کی شدت ضبط سے باہر ہوگئی تو اس نے تابڑ توڑ دو گلاس پانی کے پی لئے، جی ذرا ٹھہرا اور وہ چادر سے منہ ڈھانپ کر بستر پہ دراز ہوگئی۔

شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے
دل ہوا ہے چراغ ہی تھا

اور واقعی اس کا دل مفلس کا چراغ ہی تھا۔

سارے گھر میں شہنائیاں بجتی رہیں، گانے ہوتے رہے، چہل پہل اور ہنگامہ خیزی کا سلسلہ جاری رہا۔ سہیلیوں کی چہلیں اور بڑی بوڑھیوں کی داستان طلسم ہوشربا سب کچھ ہوتا رہا مگر زلیخا سب سے جدا اپنے گوشۂ عافیت میں منہ لپیٹے پڑی رہی، نہ جانے کیا خیالات آ رہے تھے اس کے دل میں؟

○

(۲)

اور نسیم کی منگنی کے ٹھیک تیسرے دن امتیاز واپس آگیا احراز نے اس تقریب میں شرکت کے لئے اس سے کئی بار کہا اور اس نے کوشش بھی لیکن رخصت نہ ملی اور جب رخصت ملی تو اس طرح اس کی ڈیوٹی پھر اپنے شہر ہی میں مستقل طور پر لگ گئی۔

امتیاز کے آنے سے زلیخا کا دل مغموم ٹھہر گیا۔ اس نے آتے ہی اسے باہر مردانے میں بلایا اور پوچھا۔

"کیوں بیٹی میرے بعد کوئی ایسی بات، تو نہیں ہوئی جو تمہارے لئے تکلیف دہ ہوئی ہو؟"

زلیخا نے دوپٹہ کے دامن سے گرہ باندھتے ہوئے کہا۔

ابا جی، اب تو میں عادی ہو گئی ہوں، اس طرح کی دل شکن اور تکلیف دہ باتوں کی، اگر کچھ باتیں، ایسی ہوئیں بھی، تو اب ان کے ذکر سے کیا حاصل البتہ اس کی مجھے خوشی ہے کہ آپ آ گئے۔ آپ کی موجودگی میرے لئے سب سے بڑی خوشی ہے ان الفاظ میں ایک پوری داستان درد موجود تھی جسے امتیاز نے سمجھ بھی لیا اور محسوس بھی کر لیا، اس نے ایک آہ سرد کے ساتھ گویا خود اپنے آپ سے کہا۔

واقعی اب پانی سر سے اونچا ہوتا جاتا ہے۔ پھر کچھ سوچتا ہوا بولا — کوئی نہ کوئی قدم اٹھانا ہی پڑے گا۔"

زلیخا کو ان الفاظ میں اندیشوں اور خطروں کی ایک دنیا نظر آئی اس نے کہا۔

ابا جی میں نہیں چاہتی کہ میری وجہ سے آپ کے اور چچا جان کے تعلقات پر اثر پڑے اور شاید آپ کی موجودگی میں اب ان لوگوں کا رویہ بھی وہ نہ رہے جو آپ کی عدم موجودگی میں رہا کرتا ہے۔"

امتیاز نے جیسے یہ الفاظ سنے ہی نہیں، اس نے کہا۔

میں جانتا ہوں بھائی بہت بڑی نعمت ہے، خواہ وہ کیسا ہی ہو کلثوم کی ذہنیت بھی مجھ پر منکشف ہو چکی ہے، لیکن اگر مجھے احراز کا خیال ہے، تو اس کے ساتھ بھی سابقہ طرزِ عمل قائم رکھنا ہوگا۔ رہی نسیم، تو وہ لاکھ تم سے چھیڑ چھاڑ کرے، لیکن بہر حال بچہ ہے۔ میری نظر میں اس کی بھی وہی حیثیت ہے جو تمہاری ــــ

زلیخا نے ابھی کوئی جواب نہیں دیا تھا، کہ پیچھے سے آواز آئی۔

یہ تو سچ ہے، لیکن سرکار، کیا رقیہ بیگم اور ان کے حواریوں کو بھی کھلی چھٹی ہے کہ جو چاہیں کریں؟ - میاں یہ تو انصاف نہیں ہے اس بچی کے ساتھ۔

امتیاز نے نظر اٹھا کر دیکھا، تو نادرہ سامنے کھڑی تھی، وہ اسے دیکھ کر مسکرایا اور کہنے لگا۔

" آ گئی تو بھی بس آفت کی پڑیا۔"

وہ اسی سنجیدہ لہجہ میں گویا ہوئی۔

" میاں یہ بات نہیں ہے، میرا خیال ہے، کہ اب دونوں کا فیصلہ ہونا چاہیے۔"

امتیاز نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا، اور سوال کیا۔

" کیا کہنا چاہتی ہے تو؟"

وہ بولی۔

اس گھر میں بٹوارہ ہو جانا چاہیے، دیوار کھینچ جانی چاہیے، بچوں

بیچ میں —

"اس سے کیا فائدہ ہوگا؟"

اس سے بہت بڑا فائدہ ہوگا - یہ ہر روز کی دانتا کلکل بند ہو جائے گی، یہ آئے دن کے فسادات ختم ہو جائیں گے اور میری بچی کے سر پر ہر وقت جوتی، سوار رہتی ہے، اس سے نجات مل جائے گی -

امتیاز خاموشی سے نادرہ کو تک رہا تھا اور وہ کہہ رہی تھی -

صبر اور ضبط کی کوئی حد ہوتی ہے، اس صبر و ضبط کے لئے بچی کی جان تو نہیں قربان کی جا سکتی - سچ کہتی ہوں میاں دق ہو جائے گی -

(۳۱)

امتیاز نے تمسخر کے انداز میں نادرہ سے کہا۔
" اب تو باتیں بنانا بہت آگئی ہیں تجھے ؟ یہ سبق کہاں سے رٹ کر آئی ہے ؟"
وہ بولی " جب پڑتی ہے ، انسان سب کچھ سیکھ جاتا ہے !"
امتیاز نے گفتگو کا موضوع بدلتے ہوئے کہا۔
جی چاہتا ہے کہ زلیخا کو رابعہ کے پاس بھیج دوں ، آخر خالہ ہے اور خالہ ماں کی جگہ ہوتی ہے ، اور خود حج بیت اللہ کو چلا جاؤں اور پھر کبھی واپس نہ آؤں !"
ان الفاظ نے زلیخا پر کچھ عجیب قسم کا اثر کیا۔
رابعہ کا نام آج پہلی مرتبہ اس نے اپنایت کے لہجہ میں امتیاز کی زبان سے سنا تھا۔ اور بہت خوشی ہوئی۔
واقعی اگر اس الم کدہ سے نکل کر وہ کسی طرح سعادت گنج پہنچ جائے تو وہاں کی فضا ہی دوسری ہو گی ، رابعہ کا برتاؤ ماں کا سا ہوگا۔ اور پھر اسے ارشاد یاد آگیا ، وہ سوچنے لگی ، اب تو کب کا مجھے فراموش کر چکا ہوگا۔ ممکن ہے اس کی شادی ہو چکی ہو۔ ممکن ہے کہیں بات ٹھہر چکی ہو۔ نہیں میں وہاں نہیں جاؤں گی۔ خالہ نے مجھے فراموش کر دیا ، ارشاد کا اب ذکر ہی بیکار ہے وہاں جانا تو اپنے آپ کو ذلیل کرنا ہے۔

اور پھر اسے باپ کے آخری الفاظ یاد آئے، یعنی حج بیت اللہ کے لئے جا کر پھر واپس نہ آنے کا عہد۔

اس بات نے اُسے اور زیادہ جنون میں مبتلا کر دیا، وہ سوچنے لگی۔ اگر ابا جی چلے گئے تو یہ دنیا میرے لئے تاریک ہو جائے گی، نہ میں اس گھر میں رہ سکتی ہوں نہ خالہ کے ہاں رہنا چاہتی ہوں؟ آخر کیا حشر ہوگا میرا؟"

یہ سوچتے سوچتے اس نے باچشم پرُآب امتیاز سے کہا۔

" ابا جی یہ نہیں ہو سکتا۔"

اور پھر وہ رونے لگی، امتیاز نے پوچھا:

" کیا نہیں سکتا بیٹی!"

زلیخا نے جواب میں کہا۔

نہ میں خالہ کے ہاں جاؤں گی، نہ تنہا آپ کو جانے دوں گی!"

ان الفاظ میں زور تھا، قوت تھی، عزم تھا، فیصلہ تھا۔

امتیاز نے محبت بھری نظروں سے پہلی مرتبہ اسے دیکھا اور سوال کیا؟

" کیوں تو رابعہ کے ہاں کیوں نہیں جائے گی؟"

وہ بولی " اس لئے کہ وہ مجھے بھول چکی ہیں، اماں جی کے مرنے کے بعد سے آج تک انہوں نے میری خبر نہیں لی، نہ ایک دن کے لئے یہاں آئیں، میں ناخواندہ مہمان بن کر وہاں جانا اپنی اور اپنے باپ کی توہین سمجھتی ہوں۔

امتیاز نے قہقہہ لگایا اور کہا۔

" اپنے باپ کی بھی توہین کا فیصلہ تو کرنے لگی ہے؟"

اور پھر پوچھا، اچھا تو رابعہ کے ہاں نہیں جاتی اور یہ کیا کہا کہ مجھے تنہا نہیں جانے دے گی۔

" وہ کہنے لگی " آپ اگر چلے جائیں گے تو میں یہاں رہ کر کیا کروں گی؟"

" کیا تو بھی میرے ساتھ چلے گی۔"

" کیوں نہیں چلوں گی! یہاں میرا کون ہے؟ بھیا بھی تو نہیں۔ نہ جانے کہاں ہیں؟"

اعجاز کا ذکر سن امتیاز کے دل میں تلاطم برپا ہو گیا! جیسے اس کے سینہ پر کسی نے گھونسہ مار دیا ہو، جیسے اس کے زخم دل کے کھرنڈ کو کسی نے ناخن سے اکھیڑ دیا، جیسے اس غم کو جسے اس نے نہ جانے کب سے چھپا رکھا تھا، کسی نے دیکھ لیا ہو لیکن۔

اس نے ذرا تلخ لہجہ میں کہا۔

" اس نالائق کا نام میرے سامنے مت لو۔"

زلیخا سہم کر خاموش ہو گئی۔

(۴)

اور اس گفتگو کے دوسرے دن ایک عجیب و غریب واقعہ رونما ہوا۔

زلیخا جس کے ہاں۔ ناخواندہ مہمان بن کر نہیں جانا چاہتی تھی، وہ خود ناخواندہ مہمان بن کر اس کے گھر آیا۔ یعنی رابعہ اور وہ بھی تنہا نہیں ارشاد کے ساتھ۔

دفعتہً اور بے سان و گمان رابعہ کو دیکھ کر، زلیخا نہ خوشی کا اظہار کر سکی، نہ غم کا وہ اسے ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگی، جیسے اسے سکتہ ہو گیا۔

رابعہ نے بڑھ کر اس کلیجہ سے لگایا، اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اس کی پیشانی اور رخسار کو بوسہ دیا اور کہا۔

"میری بچی —"

لیکن روٹھی ہوئی زلیخا نے اس اظہار محبت سے بہ ظاہر ذرا بھی متاثر ہوئے بغیر کہا۔

ہٹیے خالہ جان۔ اب تک آپ کہاں تھیں؟ مجھ پر غم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے، میری ماں اس دنیا سے رخصت ہو گئی، میرا بھائی بچھڑ گیا یہ گھر میرے لئے جہنم بن گیا، مگر آپ نے بات نہ پوچھی، خبر نہ لی — جھوٹوں بھی یہ معلوم کرنے کی کوشش نہ کی کہ زلیخا زندہ ہے یا مر گئی کاش میں مر گئی ہوتی؟"

یہ کہتے کہتے اس کی آنکھیں آب گوں ہوگئیں، رابعہ نے ایک مرتبہ پھر اسے گلے سے لگا لیا، خوب پیار کیا اور کہا۔

یہ جوتی رکھی ہے اٹھا اور میرے سر پر مار، بیشک میں نہیں آئی بیشک میں نے خط نہیں لکھا، بے شک میں نے خبر نہیں لی کیونکہ میں اس گھر میں قدم رکھنا نہیں چاہتی تھی، جہاں میری بہن کا قاتل موجود ہے، اس قاتل سے مجھے نفرت ہوگئی تھی، میں تجھے بہت چاہتی تھی اعجاز میرے دل کا ٹکڑا تھا۔ لیکن اپنی آپا سے زیادہ تم میں سے کسی کی محبت بھی میرے دل میں نہیں تھی، اس قاتل نے اگر میری بہن کو مار ڈالا تو بھانجا اور بھانجی بھی مر جائیں، میں نے تو اپنے دل میں فاتحہ پڑھ لیا تھا۔

زلیخا سمجھ گئی، رابعہ قاتل امتیاز کو کہہ رہی ہے، اس نے کہا۔

لیکن وہ قاتل تو اب بھی موجود ہے، پھر کیسے آگئیں آپ!

رابعہ نے زیر لب تبسم کے ساتھ کہا۔

" لیکن اب وہ تائب ہو چکا ہے "

اور زلیخا کے پوچھے بغیر اس نے بتایا۔

بھائی صاحب خود ہی بیگم کوٹ سے سعادت گنج گئے تھے، اب وہ بدل چکے ہیں اب آپا سے انہیں — مرنے کے بعد۔ محبت، پیدا ہو چکی ہے۔ اب ان کا دل محبت کا مخزن ہے وہ تجھے چاہتے ہیں، اعجاز سے گو بظاہر خفا ہیں اور بہت زیادہ خفا ہیں اس کا ذکر بھی سننا نہیں چاہتے، لیکن میں نے بھی دنیا دیکھی ہے، اس نفرت میں محبت جھلک رہی ہے، اس خفگی میں محبت کا سوتا ابل رہا ہے۔

بھائی صاحب میرے پاس آئے، انہوں نے مجھ سے معافی مانگی انہوں نے کہا مریم کی زندگی میں تو اس کی قدر نہ کر سکا لیکن اب میں نے

اس کی قدر پہچانی ہے جب تک وہ زندہ رہی مجھ سے میری ہر طرح کی زیادتیوں کے باوجود محبت کرتی رہی۔ اور بیٹی یہ سچ بھی ہے اور اب بھی وہ مجھ سے محبت کرتی ہے، ہر روز خواب میں آکر مجھے تسلی دیتی ہے، میری

خدمت کرتی ہے ، میں اب اس سے محبت کرتا ہوں شاید ہی کسی مرد نے کسی عورت سے اتنی محبت کی ہو جتنی مجھے مریم سے ہے ۔
اور یہ کہہ کر بھائی صاحب رونے لگے ۔
زلیخا بیٹی تو نے آج تک کبھی اپنے باپ کی آنکھیں روتی دیکھی ہیں
وہ بولی" نہیں خالہ جان کبھی نہیں ۔
" رابعہ نے کہا " اور میں نے ان آنکھوں سے جو ہمیشہ انگارے برساتی رہتی تھیں آنسوؤں کی جھڑی لگتی دیکھی ہے "
زلیخا جیسے یہ سن کر بہت خوش ہوئی ، اس نے بے یقینی کے لہجہ میں پوچھا
" سچ "
رابعہ نے کہا ہاں بیٹی بالکل سچ ، وہ مجھ سے یہ عہد کر کے آئے تھے کہ میں آؤں اور وہیں رہوں ، یا تجھے لے کر سعادت گنج آجاؤں ، بھائی صاحب کے آنسوؤں نے میرا دل صاف کر دیا ۔ میں چلی آئی ۔

(۵)

رابعہ کے پہلو میں، بالکل اس کے قریب، ایک خوش پوش، خوش وضع اور خوش اندام شخص کھڑا تھا۔

زلیخا نے اپنی محویت میں، اپنی باتوں کے استغراق میں رابعہ کی داستان عجیب کے انہماک میں اب تک اس طرف توجہ ہی نہیں کی تھی۔ اب دفعتہً نظر اٹھی تو دیکھا یہ ارشاد تھا۔

عالم خیال میں وہ اکثر ارشاد کو دیکھتی بلکہ اس سے باتیں بھی کرتی رہتی تھی لیکن عالم مثال میں کتنے دنوں سے، کتنے برسوں سے، اس نے اس کا دیدار نہ کیا تھا، نہ باتیں کی تھیں۔

اور آج وہ بالکل سامنے کھڑا تھا۔

اسے دیکھ کر اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی، چہرے پر سرخی سی دوڑ گئی وہ گو مگو اور چہ کنم کی مصیبت میں گرفتار ہو گئی۔

نہ مخاطب کر سکتی تھی، نہ آغاز کلام!

لیکن یہ مشکل ارشاد نے فوراً آسان کر دی۔ اس نے بڑے زور سے اسلام وعلیکم کا نعرہ مارا، پھر رابعہ سے کہا۔

امی پہلے دستور یہ تھا، کہ چھوٹے بڑوں کو سلام کیا کرتے تھے۔ اب زمانہ بدل گیا ہے بڑے چھوٹوں کو سلام کرتے ہیں۔

میں نے ٹھیک کہانا؟"

رابعہ نے مسکراتے ہوئے کہا" تجھے تو ہر وقت ہنسی دل لگی کی باتیں سوجھا کرتی ہیں۔ بیٹھا بیٹھ وہ بے چاری اپنی پریشانی میں گرفتار ہے تجھے سلام کرنے کھڑی ہو جاتی۔

ارشاد نے برجستہ جواب دیا۔

" لیکن کیا سلام کا جواب بھی نہیں دے سکتی؟"

بے ساختہ زلیخا کا ہاتھ ماتھے تک گیا اور پھر وہ اٹھ کر سیدھی باورچی خانے کی طرف بھاگی۔

اس وقت اس کا دل وفور طرب سے بلیوں اچھل رہا تھا۔

اس وقت وہ بہت خوش تھی۔

وہ دل ہی دل میں کہنے لگی، ارے یہ شخص تو ذرا بھی نہیں بدلا، وہی شوخی، وہی تبسم، وہی شرارت۔

" اور واقعی یہ میری غلطی تھی، مجھے سلام کرنا چاہیے تھا۔"

" لیکن کیسے کرتی، اول تو مجھے ہوش ہی نہ تھا، خالہ کو چھوڑ کر کسی اور طرف دیکھنے کا، دوسرے اتنے دنوں کے بعد ملنے اور دیکھنے کا اتفاق ہوا ہوا۔ تو اجنبیت اور تکلیف محسوس ہونا ہی چاہیے تھا۔

مجھ سے تو سلام کا ڈنڈا نہیں مارا گیا۔ اور حضرت کو موقعہ مل گیا مجھے جتانے کا چڑانے کا۔"

اور پھر وہ جلدی جلدی چائے اور اس کے لوازمات تیار کرنے لگی اور تھوڑی دیر میں چائے کے ساتھ کئی اور چیزیں تیار کر کے خوان میں رکھ کر اپنے کمرے میں پہنچ گئی، جلدی جلدی میز ٹھیک کی، ساری چیزیں سے رکھیں، پھر رابعہ سے کہا۔

" آیئے خالہ جان چائے تو پی لیں۔"

" وہ بولیں" بیٹی ابھی آئی، ذرا منہ ہاتھ دھولوں،

وہ منہ ہاتھ دھونے چلی گئیں، ارشاد کو پھر چھیڑنے کا موقع مل گیا اس

نے پوچھا۔

"کیا میں بھی منہ ہاتھ دھو آؤں؟"

وہ دزیدہ تبسم کے ساتھ گویا ہوئی۔

دھو آیئے ۔

ارشاد نے کہا: "لیکن میں گرم پانی سے منہ ہاتھ دھونے کا عادی ہوں

وہ چائے دانی کی طرف اشارہ کرتی ہوئی بولی ۔

حاضر ہے ۔

ارشاد ہنس پڑا،

"کیا چائے سے ہاتھ دھولوں؟ پھر پیوں گا کیا؟"

"وہ بولی" پہلے پی لیجیے پھر ہاتھ منہ دھو لیجیے گا ۔

اتنے میں رابعہ بیگم تشریف لے آئیں۔ ان کے آتے ہی زلیخا نے خوان کھولا۔ اور چیزیں پکائی تھیں سب الگ الگ طشتریوں میں رکھ دیں، پھر چائے بنائی اور ماں بیٹے کے سامنے رکھ دی۔

"ارشاد نے ماں سے کہا۔ اچھے میزبانوں سے پالا پڑا ہے جو مہمانوں سے پہلے پیٹ بھر لیتے ہیں۔"

"رابعہ نے ڈانٹا، تو بک بک کئے جائے گا؟"

اس نے اپنی پیالی زلیخا کی طرف بڑھا دی اور خود اپنے لئے بنانے لگا۔

٭

(۶)

رابعہ کے آنے سے زلیخا کو بڑا سکون پہنچا، اور کلثوم و نسیم نہ جانے کیوں انگاروں پر لوٹنے لگیں، بلکہ احراز تک اس کی آمد سے کچھ بے کیف سا نظر آرہا تھا۔

رابعہ کی آمد ان لوگوں کے لئے حیرت انگیز اور تکلیف دہ یوں تھی کہ وہ مہمان کی طرح دو چار دن کے لئے نہیں آئی تھی۔ بلکہ بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا۔ اب وہ یہاں مستقل طور پر ورنہ ایک عرصہ دراز تک مقیم رہے گی۔

زلیخا کی حیثیت مریم کی زندگی میں بھی اس گھر کے اندر کچھ نہ تھی اور اس کے انتقال کے بعد تو وہ بالکل ناچیز ہو کر رہ گئی تھی۔ لیکن رابعہ مریم نہیں تھی۔ اس نے آتے ہی اپنے دبدبے طنطنے کا مظاہرہ شروع کر دیا۔

رقیہ اور شاہینہ اور صفدر وغیرہ جا چکے تھے، نکاح میں ابھی کافی دن تھے، طے یہ ہوا تھا۔ کہ نکاح اور رخصتی کی تقریب ساتھ ساتھ عمل میں آجائے گی۔ گو جہیز وغیرہ کے لئے کلثوم کو کسی طرح کا نیا بندوبست نہیں کرنا تھا۔ پھر بھی احراز کے ایما پہ ایک سال کی مہلت رقیہ سے کی گئی جو بادل نخواستہ انہوں نے دے دی، صفدر نے لاکھ ہاتھ پاؤں مارے لیکن بڑوں کے فیصلہ کے آگے سر جھکانا ہی پڑا۔

صفدر جا چکا تھا۔ لیکن اعجاز کا کمرہ جس میں اتنے عرصہ تک وہ مقیم رہا تھا۔ اب تک کلثوم اور نسیم کے کنٹرول میں تھا۔ لیکن رابعہ نے آتے ہی سب سے پہلے اس کمرہ پر قبضہ کیا اور ارشاد کو وہاں کا مالک بنا دیا۔ کلثوم اور نسیم کو یہ بات بری تو لگی لیکن زبان سے کچھ نہ کہہ سکیں کلثوم کا جی چاہا کہ رابعہ سے ایک جنگ کر ڈالے لیکن اس کے تیور دیکھ کر ہمت نہ پڑی اور ہمت نہ پڑنے کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی۔ کہ امتیاز جب سے بیگم کوٹ سے آیا تھا۔ بالکل بدل گیا تھا۔ اس نے اپنا سارا گھر رابعہ کی تحویل میں دے دیا تھا۔ اور اس نے اس اختیار و اقتدار سے فائدہ اٹھانے میں ذرا بھی تکلف یا تامل سے کام نہیں لیا تھا۔

سب سے پہلے اس نے گھر حصّہ پر جو امتیاز کا تھا۔ سفیدی کرائی کمروں میں رنگ کرایا۔ ٹوٹے پھوٹے فرنیچر کو ٹھکانے لگایا، نیا اور اچھا فرنیچر خرید کر گھر کو اس طرح سجایا کہ اب واقعی وہ ایک کھاتے پیتے آدمی کا گھر معلوم ہوتا تھا۔

زلیخا کی حالت تھی۔ کہ اوّل تو اس کے پاس کپڑے یوں ہی کم تھے اور اعلیٰ درجہ کے ملبوسات تو گویا بالکل نہیں تھے، معمولی سے لباس میں زندگی کے دن گذار رہی تھی۔ دل بجھ چکا تھا۔ شوق افسردہ ہو چکا تھا۔ ہفتوں آئینہ نہ دیکھتی۔ کنگھی چوٹی سے بھی کوئی دلچسپی باقی نہیں رہ گئی تھی۔

لیکن رابعہ نے زلیخا کو بھی بالکل بدل ڈالا، زلیخا کو اپنے ساتھ لے کر خود بازار پہنچی اور اس کی پسند اور اپنے مشورے سے کافی قیمتی اور اچھے کپڑے خرید لائی اور چند ہی روز میں اس کے نئے ملبوسات تیار ہو گئے۔ خوبصورت وہ پہلے بھی تھی۔ لیکن اب حسن کے ساتھ سنگھار کا اضافہ ہو گیا، چار چاند لگ گئے، رانی معلوم ہونے لگی، اب وہ اپنی شان اور ٹھاٹھ میں نسیم سے ٹکر لیتی تھی۔

اب تک گھر کا سارا کام کاج وہ خود کیا کرتی تھی، یا نادرہ کچھ ہاتھ بٹا لیتی تھی، وہ اس گھر کی خانہ زاد تھی، اس کا معاوضہ کھانا اور کپڑا تھا کبھی اجازہ، دو چار روپے دے دیتا، کبھی امتیاز اور وہ اسی میں مگن تھی۔ پوری وفاداری کے ساتھ دونوں بھائیوں کے گھریلو کام کرتی رہتی تھی۔ چونکہ کلثوم کا دبدبہ تھا۔ اس لئے زیادہ تر انہی کی خدمت میں حاضر رہا کرتی اور ان کے کام کیا کرتی تھی۔ لیکن رابعہ نے اس سے باقاعدہ کام لینا۔ شروع کر دیا محض یہ ثابت کرنے کے لئے کہ نادرہ صرف کلثوم کے لئے وقف نہیں ہے ، اسے پورا وقت یہاں بھی صرف کرنا ہے، اس کے علاوہ باہر کے کام کے لئے ایک لڑکا بھی ملازم رکھ لیا۔

امتیاز جسے نہ گھر سے کبھی دلچسپی تھی نہ گھر کا بجٹ سو پچاس سے زیادہ بڑھنے دیا تھا۔ اب نہایت خوشی سے اعتراض کا ایک لفظ بھی منہ سے نکالے بغیر یہ تمام مصارف پورے کر رہا تھا۔

(۷)

امتیاز میں اتنا زبردست انقلاب کس طرح آگیا، یہ سوال کلثوم اور احراز کے لئے یکساں طور پر تشویش انگیز بھی تھا اور حیرت خیز بھی۔

ایک روز کلثوم نے نادرہ سے کہا۔

"اری سنتی ہے، میں غسل کروں گی، ذرا میرا سر دھو دینا آج "

نادرہ نے نہایت سعادت مندی کے ساتھ وعدہ کر لیا اور کہا جب غسل خانے جایئے گا، آواز دے لیجئے گا، میں جب تک ذرا چھوٹی بیگم صاحبہ کو ناشتہ کرا آؤں۔

چھوٹی بیگم یعنی رابعہ۔

یہ لفظ سن کر کلثوم کی تیوریاں چڑھ گئیں، برا سا منہ بنا کر کہا۔

اے ہے، وہ اب خیر سے ناشتہ بھی نہیں کر سکتیں، تم لقمے ڈالو گی جا کر ان کے منہ میں۔ کیا کہنا ہے بی بنو گا۔"

نادرہ دوپٹہ سے منہ ڈھانک کر ہنسنے لگی اور گویا ہوئی۔

کیا کروں سرکار، حکم یہی ہے۔ بیچاری بڑی بیگم تو اللہ میاں کی گائے تھیں، خدا انہیں جنت نصیب کرے اور یہ اتنی ہی تیز مزاج ہیں۔"

یہ غنیمت نہیں تھی، دراصل نادرہ کلثوم کے اس پیچ و تاب سے لطف لے رہی تھی۔ کلثوم نے کہا۔

ہاں ہیں تو سہی، لیکن کسی دن میرے منہ آئیں تو ایک ایک کی دس

دس سناؤں گی ۔"

نادرہ دل ہی دل میں دعا مانگا کرتی تھی، کہ خدا وہ ساعت سعید جلد لائے جب رابعہ اور کلثوم میں زوردار لڑائی ہو، تب ہی ان کا رکلثوم کا، غرور جائے گا۔ اس وقت بھی دل ہی دل میں اس نے یہ دعا مانگی، پھر گویا ہوئی ۔

" آپ کے منہ لگنا کچھ ہنسی کھیل ہے ؟"

الفاظ میں کلثوم کو اپنی شان جھلکتی نظر آئی، کہنے لگی ۔

میں تو بھائی صاحب کی وجہ سے چپ ہوں، لیکن صبر کی بھی کوئی حد ہوتی ہے، کسی دن ایسی خبر لوں گی، کہ سیدھی سعادت گنج کا رخ کریں گی۔

" نادرہ ہنسنے لگی " بی بی - اب تو وہ سعادت گنج جاتی نظر نہیں آتیں ۔"

جیسے کوئی خیال دل میں مچل رہا تھا، بے ساختہ زبان پر آگیا

ہاں معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے ۔ لیکن کیوں ؟"

" یہ میں کیا جانوں ؟"

" مجھے تو دال میں کچھ کالا نظر آتا ہے ؟"

(ٹوہ لینے کے لئے) بی بی میں سمجھی نہیں !"

اب اتنی نادان بھی نہ بنو۔ میں پوچھتی ہوں جو دبدبہ مریم کو بھی حاصل نہ تھا۔ وہ رابعہ کو کیسے حاصل ہو گیا۔

" یہی تو میں بھی سوچتی ہوں مگر خاک سمجھ میں نہیں آتا ۔"

میرا خیال تو یہ ہے کہ بھائی صاحب اس بڑھاپے میں دوسری شادی کریں گے ۔

" اے بی بی توبہ کرو ، وہ اب شادی وادی نہیں کرنے کے !"

تو کیا جانے ؟ دیکھ لینا، ایک دن ان کے سر پہ سہرا بڑا ہو گا اور بی رابعہ دلہن بنی نظر آئیں گی ۔

نادرہ کھل کھلا کر ہنس پڑی ۔

اب ایسا اندھیر بھی نہیں ہے ۔ وہ تو چھوٹی بیگم کو اپنی بیٹی کی طرح

مانتے ہیں اور ان سے چھوٹی جی تو بہت ہیں۔

"لیکن بیوہ بھی تو ہیں۔"

"تو اس سے کیا ہوتا ہے؟ ماشاءاللہ جوان لڑکا موجود ہے انھیں ضرورت کیا ہے، شادی کرنے کی؟"

میرا دل تو یہی کہتا ہے، دیکھ لینا، ایک دن یہ ہو کر رہے گا!"

اتنے میں رابعہ کی آواز آئی، نادرہ

" اور اپنا نام سنتے ہی نادرہ جھٹ سے اُٹھ کھڑی ہوئی اور کہنے لگی!" بڑی دیر ہو گئی ہے، آج ضرور میری شامت آئے گی۔

کلثوم نے گھور اسے دیکھا، اور اس وقت تک دیکھتی رہی جب تک نظر سے اوجھل نہیں ہو گئی، کتنا غصہ تھا، اسے نادرہ کی دہشت پر گویا اس گھر میں اب کوئی اور بھی تھا۔ جس سے نادرہ ڈر سکتی ہے۔

(۸)

ایک روز زلیخا اپنے کمرہ میں بیٹھی کتاب پڑھ رہی تھی، نادرہ کلثوم کی طرف تھی، رابعہ باورچی خانہ میں "لنچ" تیار کر رہی تھی یکایک ارشاد آیا اور وہیں دروازے پر ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ پھر اس نے پوچھا۔

"کیا امی یہاں نہیں ہیں؟"

ذرا کے ذرا زلیخا نے کتاب سے نظر ہٹائی اور جواب دیا۔

دکھائی تو نہیں دیتیں۔

یہ کہہ کر پھر اس نے کتاب پڑھنا شروع کر دی۔

ارشاد نے دوسرا سوال کیا۔

"تو پھر آخر کہاں ہیں۔؟"

ذرا کے ذرا اس نے کتاب سے نظر اٹھائی اور بولی۔

"وہ آئیں تو پوچھ کو بتا سکوں گی"

پھر نظر کتاب پر۔

ارشاد جھلایا ہوا اندر آ گیا۔ اور زلیخا کے بالکل قریب پہنچ کر اس نے پوچھا۔ یعنی آپ کو اتنا بھی نہیں معلوم؟"

اس نے پھر ایک لمحہ کے لئے کتاب سے نظریں ہٹائیں اور گویا ہوئی۔

"اگر معلوم ہے تو اتنا ہی جتنا آپ جانتے ہیں"

ارشاد نے ایک مرتبہ زلیخا کے سراپا پر نظر ڈالی اور پوچھا۔
"میں کیا جانتا ہوں؟ مجھے کیا معلوم ہے؟"
"یہی کہ وہ میری خالہ اور آپ کی امی جان ہیں۔
"میں بالکل نہیں جانتا ہوتا تو پوچھتا کیوں!"
"اسی پر تو مجھے بھی حیرت ہے!"
"یعنی میں جھوٹ بول رہا ہوں۔"
یہ ذرا سخت لفظ ہے، میں اگر اس مفہوم کو ادا کرتی تو میرے الفاظ یہ ہوتے، آپ درست نہیں کہہ رہے ہیں۔
"مجھے اب تہذیب کا درس بھی آپ سے لینا چاہیئے؟"
"آپ نے مجھے تو نہیں کہا تھا، اپنے آپ کو کہا تھا اور آدمی اپنے تیئں جو چاہے کہے، اس کا تہذیب یا بد تہذیبی سے کیا تعلق؟"
آخر ان باتوں کا مقصد کیا ہے؟"
"مقصد؟۔ میرا خیال ہے ہم دونوں کی باتیں بے مقصد ہی ہیں۔"
"مجھے یہ تسلیم کر لینے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ میں اول درجے کا بے غیرت ہوں۔"
"لیکن آپ تو اس طرح تسلیم کر رہے ہیں جیسے میرا یہ مطالبہ ہے؟"
"ہاں یہ آپ کا مطالبہ ہے۔"
حالانکہ میں آپ کے بارے میں ایسا تصور بھی نہیں کر سکتی۔"
"کیا خیال ہے آپ کا میرے متعلق؟"
یہ کہ آپ خالہ جان کے بیٹے ہیں۔"
"اور —"
اور یہ کہ اس وقت بے بات کی بات پر مجھ سے لڑ رہے ہیں۔"
اور —
"اور یہ کہ بے انتہا غصیلے ہیں، لیکن نہ جانے کیوں؟"
بتاؤں میں بے غیرت کیوں ہوں؟"
"جب میں آپ کو بے غیرت تسلیم ہی نہیں کرتی، تو پوچھ کر کیا کروں؟"

میں بے غیرت بھی ہوں اور احمق بھی "۔
مجھے اس سے بھی اختلاف ہے ۔
میں بے غیرت ہوں، بے وقوف ہوں، گدھا ہوں ۔
" لیکن میں کیسے مان لوں ؟"
" آپ کو ماننا پڑے گا ۔"
" کچھ زبردستی ہے ؟" نہیں بھئی !
" یہ آپ کی دھاندلی ہے !"
" آخر آپ کو اتنا اصرار کیوں ہے ، توبہ توبہ اپنے بے غیرت ، بے وقوف اور وہ تیسرا لفظ تو میں ہرگز نہیں کہہ سکتی ۔ ہونے پر "۔
" اس لئے کہہ رہا ہوں ۔ کہ بنا دیا گیا ہوں، اس لئے کہ بننا پڑا ہے !"
ایک سانس میں اتنی ساری باتیں کہہ گئے آپ ، اب میں کس کی تردید کروں ۔
آپ کو تو بہ زور تردید کرنی چاہیئے ، کیوں کہ سب کچھ آپ ہی کا کرشمہ ہے "۔
" میرا کرشمہ ہے ، یہ سب کچھ ؟"
" اور کیا ، صرف آپ کا ۔"
اگر جانے کی جلدی نہ ہو تو بتا دیجئے ، کیوں ؟ — کیسے ؟"
جی مجھے جانے کی جلدی نہیں ، مرنے کی جلدی ہے "۔
خدا کے لئے ایسی باتیں نہ کیجئے ۔
" بہت تکلیف ہوتی ہے آپ کو ان باتوں سے !"
" ظاہر ہے ، ہونی ہی چاہیئے !"
" کیوں ہونی چاہیے ۔ کیا میرے مر جانے کے بعد آپ کو اذیت ہو گی ، رنج ہوگا ۔ دکھ ہوگا ؟ ۔ بتایئے جواب دیجئے ، خاموش رہنے سے کام نہیں چلے گا ؟"
" پہلے بتایئے آپ اتنے بھرے ہوئے کیوں ہیں ؟" کیا کسی سے لڑ کر آئے ہیں ؟"
" جی نہیں ، لڑنے آیا ہوں ۔ آپ سے ؟"
مجھ سے لڑنے آئے ہیں ۔ کیوں مگر ؟" ۔
اس لئے کہ آپ کے طرزِ عمل نے مجھے بدحواس کر دیا ہے اور زندگی

واقعی میرے لئے ایک بوجھ بن گئی ہے؟"
"میرے طرز عمل سے اگر آپ کو یہ شکایت ہے، تو مجھے اپنی بدنصیبی پر افسوس ہے اس لئے کہ میں نے تو کوئی ایسی بات نہیں جو آپ کے لئے اہانت انگیز یا تکلیف دہ ہو۔ آپ خود سوچئے بھلا ایسا کر سکتی ہوں میں؟"
"جی ہاں کیا کہنا ہے آپ کا؟"
"پھر وہی جلی کٹی باتیں۔ آخر ان باتوں کا کچھ سرا بھی تو معلوم ہو؟"
کیا آپ چاہتی ہیں، کچھ صاف صاف باتیں کروں؟" وقت ہے۔
"ضرور ہے، فرمائیے کیا کہنا چاہتے ہیں آپ؟"
"میں کون ہوں؟"
"ہنسی ضبط کر کے، ظاہر ہے میں وہ الفاظ نہیں دوہرا سکتی، جو آپ ابھی کہہ چکے ہیں اپنے لئے، میں تو آدمی ہی کہوں گی۔"
اچھا آدمی ہی سہی اور اس کے علاوہ؟
اس کے علاوہ خالہ جان کے لخت جگر ہیں۔
چلئے آدمی بھی اور آپ کی خالہ جان کا لخت جگر بھی ہوں؟"
اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہوں گے۔ مگر میں تو اتنا ہی جانتی ہوں۔
کیا آپ اس ارشاد کو جانتی ہیں جو آج سے بہت پہلے کبھی آپ کے گھر میں آیا کرتا تھا، آپ سے ملا کرتا تھا، آپ سے باتیں کیا کرتا تھا، کھیلا کرتا تھا، چھیڑا کرتا تھا۔" بہت اچھی طرح؟"
"اب وہ کہاں ہے؟"
"میرے سامنے اس کمرے میں۔"
مگر اس کے ساتھ آپ کا سلوک کیا ہے؟"
کیا ہے آپ ہی بتائیے۔
وہ آپ کو کبھی نہیں بھولا، وہ ہمیشہ آپ کو یاد کرتا رہا اس نے عالم خیال میں جب دیکھا، آپ ہی سے ملا۔ آپ ہی سے باتیں کیں لیکن ——
ہاں کہہ ڈالئے لیکن۔

لیکن آپ نے اسے بھلا دیا، آپ نے اسے کبھی نہیں یاد کیا۔

"یہ کس نے کہا آپ سے!"

"میرے دل نے، آپ کے برتاؤ نے"

"دونوں جھوٹے!"

"تو کیا میں یہ سمجھ لوں کہ آپ نے مجھے فراموش نہیں کیا۔ آپ نے مجھے یاد رکھا۔؟

واقعہ تو یہی ہے، باقی سمجھنا یا نہ سمجھنا، آپ کا کام ہے آپ جانیے"

(ذرا جذباتی لہجہ میں) زلیخا کیا تم سچ کہہ رہی ہو؟"

جھوٹ کہنے کی وجہ بھی تو ہونی چاہیئے۔ مگر دفعتہً" آپ سے تم پر کیسے آگئے؟

(سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے) لیکن اگر واقعہ یہی ہے جو تم کہہ رہی ہو تو پھر مجھ سے الگ الگ کیوں رہتی ہو۔ یہ بیگانگی سی کیوں نظر آتی ہے؟ ایک طرف قرب، ایک طرف دوری، یہ کیا ماجرا ہے؟"

کوئی ماجرا نہیں، سوچیئے تو آپ کا دل جواب دے سکتا ہے"

"میں نے بہت کچھ مگر سوچا مگر کچھ سمجھ میں نہیں آیا"

"نہیں آپ نے بالکل نہیں سوچا!"

"اچھا تو اب تم ہی بتا دو!"

آپ آئے میں خوش ہو گئی، جیسے میں نے کوئی دولت پالی، آتے ہی آپ نے مجھے چھیڑنا اور بنانا شروع کر دیا میں سمجھی آپ وہی ہیں۔ ذرا بھی نہیں بدلے، مگر اس کے بعد یک بیک آپ کے اندر کچھ جھجک کچھ مغائرت، کچھ اجنبیت سی محسوس ہونے لگی۔ آپ قریب آ کر پھر دور ہو گئے میں نے بھی سمجھ لیا، زمانہ بدلتا ہے، موسم بدلتا ہے، وقت بدلتا ہے انسان بدلتے ہیں، آپ بھی بدل گئے۔

"اور تم خفا ہو گئیں!"

"خفا ہونے کا مجھے کیا حق تھا، ہاں یہ ضرور کیا کہ بڑھے ہوئے قدم پیچھے ہٹا لیے"

"زلیخا کبھی آئینہ بھی دیکھتی ہو تم؟"

" ہاں کبھی کبھی۔ مگر یہ کیوں پوچھا آپ نے؟"
ایک مرتبہ پھر سے اپنے سراپا پر نظر ڈالو؟"
" الحمد وللہ کہ میرا دماغ خراب نہیں ہے۔"
" زلیخا تم آئینہ دیکھو اور میری نظروں سے اپنے آپ کو دیکھو۔"
" اس سے کیا ہوگا؟"
" پھر تم محسوس کر لوں گی، میرے اندر جھجک کیوں پیدا ہوئی۔"
" اب اس وقت آئینہ ڈھونڈنے کہاں جاؤں آپ ہی بتا دیں گے تو کیا ہوجائیگا۔
زلیخا تم بہت بدل چکی ہو۔ " میں بدل چکی ہوں؟"

ہاں ۔ پہلے تم ایک الہڑ اور نادان لڑکی تھیں، جسے چڑایا، جا سکتا تھا۔ چھیڑا جا سکتا تھا۔ بنایا جا سکتا تھا۔ اور میں نے جب اس گھر میں قدم رکھا تو وہی لڑکی سمجھ کر تمہیں چھیڑا بھی، چڑایا بھی، بنایا بھی۔

" مگر کیا میں خفا ہوگئی، کیا میں نے آپ سے شکایت کی۔"

نہیں لیکن میں نے جب باقاعدہ تمہیں دیکھا تو محسوس کیا، تم وہ لڑکی نہیں ہو، تم اب دوسری دنیا میں پہنچ چکی ہو۔ تمہاری آنکھوں میں پہلے چمک تھی، اب سحر ہے،

باتوں میں پہلے معصومیت تھی اب جادو ہے، تمہارے انداز و اطوار میں پہلے سادگی تھی، اب وقار ہے پہلے تمہیں چھیڑ کر لطف آتا تھا۔ اور اب۔

اور اب —
" ڈر لگتا ہے۔"
" زلیخا کھل کھلا کر ہنس پڑی، کہنے لگی۔

" آپ نے اپنے تئیں بے غیرت، احمق، گدھا اور نہ جانے کیا کیا کہہ ڈالا مگر جو اصل بات تھی وہ نہیں کہی۔"
" وہ کیا بات تھی؟"
" آپ بیوقوف نہیں ہیں، مگر دوسروں کو بیوقوف بنانے کی کوشش ضرور کرتے ہیں!"

"کیا کیا میں نے ؟"

آپ باورچی خانے کی طرف آئے، وہاں خالہ جان موجود تھیں آپ نے ضرور دیکھا ہوگا، لیکن یہاں آکر انجان بن گئے اور مجھ سے پوچھنے لگے امی کہاں ہیں ؟" ارشاد نے ایک قہقہہ لگایا اور کہا۔

"تکلف برطرف تھا۔ کہ انداز جنون وہ بھی "۔ زلیخا بھی مسکرانے لگی"

(۹)

رالعبہ کو دیکھ دیکھ کر کلثوم تو انگاروں پر لوٹ رہی تھی، بد قسمتی سے رقیہ بھی جا چکی تھی، ورنہ اس کے سامنے دل کے جلے پھپھولے، پھوڑ لیتی، اب لے دے کے نادرہ تھی، کبھی کبھی بے ساختہ اس کے سامنے دل کا زہر زبان پر آجاتا تھا۔ لیکن یہ ڈر بھی لگا رہتا تھا،
کہ رالعبہ سے نہ لگا دے۔ بھائی صاحب سے نہ کہہ دے تو لینے کے دینے پڑ جائیں، کلیجہ مسوس کر رہ جاتی تھی، بے چاری اور رالعبہ کا اقتدار تھا کہ دن بدن بڑھتا ہی جارہا تھا۔ وہ پورے طور پر امتیاز پر اس کے گھر پر اس کے آمدو خرچ پر حاوی ہو چکی تھی۔

آخر سوچتے سوچتے ایک تدبیر کلثوم کے ذہن میں آئی، زلیخا کو توڑنا چاہیے، یہ اگر آلہ کار بن جائے تو بڑی آسانی سے رالعبہ کا طلسم توڑا جا سکتا ہے، اور پھر بعد میں زلیخا کو پھر بے سہارا اور تنہا پاکر ہدف ستم بنایا جا سکتا ہے

لیکن ایک مصیبت یہ تھی کہ زلیخا سے تعلقات اتنے بگڑ چکے تھے کہ بول چال تک بند تھی، ایک گھر میں رہتے ہوئے بھی نہ وہ اس طرف آتی نہ نسیم یا کلثوم اس کی طرف جاتی تھیں، جانے کے لئے منہ بھی تو چاہیے تھا۔

لیکن ضرورت ایجاد کی ماں ہوتی ہے، آخر ایک روز کلثوم نے زلیخا کو گرفتار ہی لیا۔

ہوا یہ کہ رابعہ اور ارشاد کسی کام سے شہر گئے ہوئے تھے، امتیاز دفتر میں تھا، نادرہ گھر کے کام کاج میں مصروف و منہمک تھی، زلیخا کے کمرے میں پہنچ گئی۔ وہ حسب عادت اپنے کمرے میں بیٹھی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔

اس صورت حال سے مطمئن ہو کر کلثوم زلیخا کے کمرے میں پہنچ گئی اور جاتے ہی کہنے لگی۔

نہ جانے نادرہ کمبخت کہاں مر گئی ہے۔ ادھر تو نہیں آئی تھی۔

زلیخا یہ عجوبہ دیکھ کر حیرت میں رہ گئی، کہ کلثوم بیگم اس کے کمرے میں رونق افروز تھیں، بہر حال وہ اس کی بڑی چچی تھیں ماں کی جگہ تھیں، تعلقات لاکھ تلخ سہی، لیکن جب وہ اس کمرے میں آئی ہیں۔

تو شرافت اور سعادت کا تقاضا یہ ہے کہ ان سے بات کی جائے نہ ان کا ادب ملحوظ رکھا جائے، چنانچہ کتاب میں نشانی لگا کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور کہنے لگی۔

یہاں تو بڑی دیر سے نہیں آئی۔

کلثوم جانے کے لئے مڑی اور کہنے لگی۔

"اچھا۔ نہ آئی ہوگی"

زلیخا نے ذرا جھجکتے ہوئے کہا۔

پان تو کھاتی جائیے۔

اندھا کیا چاہے، دو آنکھیں، جاتے جاتے رُک گئیں اور پھر آکر بیٹھ گئیں۔

تم کھلاؤ گی تو ضرور کھالوں گی!"

زلیخا نے جلدی جلدی پان بنایا اور بیڑا ان کی طرف بڑھا دیا۔

زلیخا بے چاری پان لگانا کیا جانے، نہ کبھی کھایا، نہ کھلایا، جب سے رابعہ آئی تھیں، پان دان کا چلن اس نے دیکھا تھا۔ خود کھانے کی نوبت تو کبھی نہیں آئی، ہاں انھیں بناتے اور پھر کھاتے دیکھتی رہتی تھی، پان بالکل خراب بنا تھا۔ وہ تو۔

خیریت یہ گذری کہ چونا زیادہ نہیں لگایا۔ کتھا اتنا زیادہ تھوپ دیا کہ کلثوم کا منہ بکھٹا ہو گیا۔ پھر بھی انہوں نے فرمایا۔

"بڑا سواد ہے تیرے ہاتھ میں۔ اتنے مزے کا تو میں بھی نہیں بنا سکتی، جو عمر بھر سے کھا رہی ہوں۔"

زلیخا نے جواب کچھ نہ دیا، مسکرانے لگی۔

(۱۰)

اس نہایت بدمزہ پان کو گلاب جامن اور بالوشاہی کی طرح شوق سے کھاتے ہوئے کلثوم نے کہا۔

" بیٹی آخر کب تک خفا رہو گی اپنی چچی سے "

یہ کہتے کہتے کلثوم کی آواز بھرا گئی، اور آنکھیں پرنم ہو گئیں، زلیخا نے سوچا، شاید یہ ضمیر کی خلش ہے، جو آنسوؤں کی صورت میں نمودار ہو رہی ہے، اس کا دل بالکل صاف ہو گیا۔ اس نے کہا۔

" چچی جان، یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟۔ کہیں چھوٹے بھی بڑوں سے خفا ہوتے ہیں؟۔

کلثوم نے ایک بالشت آگے کھسک کر اسے کلیجہ سے لگا لیا اور اس کے سر پر دست شفقت پھیرتی ہوئی کہنے لگی۔

نہیں بیٹی یہ نہ کہو۔ میں خطاوار ہوں میں نے قصور کیا ہے، مجھ سے تیرا دل دکھا ہے، میں نے تیرے ساتھ زیادتی کی ہے۔

زلیخا کے لئے اس سے زیادہ سننا مشکل ہو گیا، اس نے کہا۔ ان باتوں کا ذکر نہ کیجئے، میرا دل آپ سے بالکل صاف ہے مجھے کوئی شکایت نہیں "

ایک مرتبہ پھر کلثوم نے زلیخا کو کلیجہ سے لگایا اور کہا۔

بالکل ماں کا دل پایا ہے۔ میری بچی نے۔ یہی ادا خدا غریق رحمت

کرے بھابی (مریم) کی تھی، کوئی کچھ کہہ لے مگر ان کے دل پر میل نہیں آسکتا تھا۔

ماں کا ذکر سن کر زلیخا اور زیادہ متاثر ہوئی کلثوم نے باتوں کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ضبط نہ ہو، چلی آئی۔

"تو آپ کو تکلیف دینے کی ضرورت تھی۔؟ —

مجھے بلا لیا ہوتا؟"

کلثوم نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

نہیں، یہ کیسے ہو سکتا۔ کنواں پیاسے کے پاس نہیں جاتا پیاسا کنویں کے پاس آتا ہے — میں آگئی!

زلیخا نے زچ ہو کر کہا۔

جانے کیا کہہ رہی ہیں آپ! میں تو سمجھی نہیں۔

کلثوم نے گویا اسے راز دار بناتے ہوئے سرگوشی کے لہجہ میں کہا۔

"میرے اس انقلاب کا سبب تجھے معلوم ہے۔ جانتی ہے میرے کالے دل پر نور کی روشنی نے کیسے قبضہ کر لیا۔

ان باتوں سے جن پر تصوف کا رنگ غالب تھا، زلیخا کو دلچسپی ہونے لگی، اس نے سوال کیا۔

آپ ہی کیوں نہیں بتا دیتیں۔

کلثوم نے اطمینان سے بیٹھتے ہوئے کہا۔

ذرا ایک پان اور کھا لوں، پھر کہوں

زلیخا کا ہاتھ بے اختیار پاندان کی طرف گیا۔ اور کلثوم دوبارہ بدمزا پان کھانے کو تیار نہیں تھی، اس نے پاندان اپنی طرف گھسیٹ لیا اور بولی۔

رہنے دو بیٹی تیرے ہاتھ کتھے چونے سے خراب ہو جائیں گے

پھر اطمینان سے بیڑا بنا کر منہ میں رکھ لیا اور پاندان کو پرے کھسکاتے ہوئے کہا۔

کئی دن سے لگاتار بھابی کو خواب میں دیکھ رہی ہوں۔
بے ساختہ زلیخا کے منہ سے نکلا۔
سچ آپ نے اماں کو خواب میں دیکھا۔
"مجھے تو خواب میں وہ بالکل نہیں دکھائی دیتیں، شاید خفا ہیں مجھ سے۔"

عارفانہ انداز میں بولی۔
تجھ سے کیا خفا ہوں گی، تیرے لئے تو وہ جنت میں بھی بے قرار رہتی ہیں، خفا مجھ سے ہیں۔ کہہ رہی تھیں، تم نے میری زلیخا کا دل دکھایا ہے جب تک اسے خوش نہ کر لو گی میں تم سے خفا رہوں گی!"

❁

(۱۱)

زلیخا اس وقت کچھ کھوئی کھوئی سی تھی، ماں کی یاد، ماں کا خیال ماں کی محبت، ماں کی شفقتیں، نہ جانے کون کون سی چیزیں اس کے دل و دماغ پر حاوی اور مسلط ہو چکی تھیں۔ کلثوم کی ان باتوں نے اسے اور زیادہ متاثر اور سحر زدہ کر دیا تھا۔

یکایک کلثوم کی آواز اس کے پردۂ گوش سے ٹکرائی۔

وہ جنت کی بی بی مجھ پر خفا ہو رہی تھی اور میرا سر ندامت سے جھکا ہوا تھا۔ میں نے ان سے وعدہ کیا تھا۔ میں زلیخا کو راضی کر لوں گی، خوش کر لوں گی۔ اب اسے کبھی بھی شکایت کا موقعہ نہیں دوں گی۔ آنکھ کھلی تو کمرے میں عجیب طرح کی بھینی بھینی خوشبو سی مہک رہی تھی، میں سمجھ گئی یہ خیال نہیں حقیقت ہے۔ خواب نہیں واقعہ ہے۔ چنانچہ بیٹی میں تیرے پاس معافی مانگنے آئی ہوں، تجھے خوش کرنے آئی ہوں، تو معاف کر دے گی، خوش ہو جائے گی، تو بھابی جان مجھے معاف کر دیں گی۔ خوش ہو جائینگی مجھ سے۔

زلیخا کو بڑی حد تک ان باتوں کا یقین آگیا، اس نے کہا۔

"چچی جان کہہ تو چکی، میرا دل صاف ہے، مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں میں خوش ہوں آپ سے۔

کلثوم نے پوچھا "تو بھابی کو اطمینان دلا دوں، ان سے کہہ دوں کہ تو خوش ہے، تو نے معاف کر دیا؟"

زلیخا نے جواب دیا، ہاں کہہ دیجیے!"

کلثوم نے اسے گلے سے لگاتے ہوئے کہا۔

میں قربان۔ تو نے میرے دل کا بوجھ اتار دیا۔ بیٹی غلطی کس سے نہیں ہوتی، مجھ سے بھی ہوگئی اور اب سوچتی ہوں تو ایسی شرمندہ ہوتی ہوں، کہ کیا کہوں، سمجھ میں نہیں آتا کہ مجھے کیا ہوگیا تھا۔

ان باتوں کا جواب زلیخا کے پاس کیا تھا۔ وہ خاموش سنتی رہی کلثوم نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

بیٹی یہ نادرہ بھی بڑی مال زادی ہے۔ آفت کی پڑیا یہی ہے جس نے مجھ سے تجھ کو بدظن کر دیا تھا۔

یہ انکشاف زلیخا کے لئے ناقابل یقین تھا۔ وہ نادرہ کی وفاداری، محبت خلوص اور سچائی کی دل سے قائل تھی، کہنے لگی۔

نہیں چچی جان نادرہ ایسی نہیں ہے!"

چچی جان نے چمک کر کہا، تو کیا جانے بیٹی؟ نہ جانے کیسی کیسی باتیں تیرے متعلق کہا کرتی تھی۔

زلیخا دل میں ہنسی، اس نے سمجھ لیا، یہ عذر گناہ بدتر از گناہ ہے۔ لیکن زبان سے کچھ نہ کہا اور کہا تو صرف اتنا۔

"خیر جو ہونا تھا، ہوگیا، ان اب ان باتوں کے ذکر سے کیا حاصل۔"

کلثوم نے گویا یہ باتیں سنی ہی نہیں، وہ تو اپنی منصوبہ بندی میں مصروف تھی، اس نے کہا۔

لیکن بیٹی تجھے اپنے کہے کا ثبوت دینا ہوگا۔ تب میرا دل مطمئن ہوگا۔؟"

ثبوت کے لفظ پر زلیخا ذرا چونکی، اس نے کہا۔

ثبوت کیسا چچی جان۔

وہ بولیں اگر واقعی تو نے پچھلی باتیں بھلا دی ہیں۔ تو پھر نسیم کی شادی میں تجھے شریک ہونا پڑے گا۔ کر وعدہ۔

یہ وعدہ کرنے پر زلیخاں ہرگز تیار نہیں تھی، اسے کلثوم سے اتنی

شکایت نہیں تھی، جتنی نسیم سے اسے کلثوم نے اتنی ذہنی اذیت نہیں پہنچائی تھی جتنی نسیم نے، رقیہ اور کلثوم نے اسے اتنا ذلیل بھی نہیں کیا تھا، جتنا نسیم نے، پھر بھی آج کے خوش گوار واقعہ کو وہ تلخی سے بدلنا نہیں چاہتی تھی اس نے جواب دینے کی بجائے سوال کیا۔

"کلثوم نے کہا وہ لوگ کسی طرح مانتے ہی نہیں، بہت اصرار کر رہے تھے آج جنوری کی کون سی تاریخ ہے؟"

"زلیخا نے بتایا چوتھی!"

کلثوم نے کہا، بس مارچ کی پندرہ تاریخ کو خدا نے چاہا تو دلہن بن کر اس گھر سے رخصت ہو جائے گی، اس عرصہ میں سارے انتظامات مکمل ہو جائیں گے۔

✪

(۱۲)

اور پھر دفعتہً کلثوم نے سوال کیا۔
یہ رابعہ بیگم کہاں گئی ہیں؟
وہ بولی "بازار گئی ہیں کچھ سامان خریدنے !"
"اور ارشاد ؟"
"وہ بھی انہی کے ساتھ گئے ہیں "
بیٹی یوں تو رابعہ تیری خالہ ہیں اور خالہ ماں کی جگہ ہوتی ہے لیکن ایسی خالہ دشمن کی بھی نہ ہو، جو بن ماں کی بھانجی کو اپنے لئے تباہ ہو جانے دے۔ بلکہ بھینٹ چڑھا دے اپنی خوشی پر۔

یہ عجیب و غریب الفاظ سن کر زلیخا کا بدن سنسنانے لگا، اسے غصہ بھی آیا وہ اپنی خالہ کو ماں سے زیادہ چاہتی تھی خالہ کے دامن میں جو لازوال مسرت اور عافیت اسے حاصل ہوئی تھی وہ دنیا کی ہر چیز سے قیمتی اور گراں بہا تھی خالہ کے آنے سے پہلے اس گھر میں اس کی حیثیت کیا تھی وہ ہر وقت ذلیل کی جاتی تھی اسے چور بنایا جاتا تھا۔ اسے بدچلن ثابت کیا جاتا تھا۔ وہ اس وسیع گھر کے اس مختصر سے کمرے میں قید رہنے پر مجبور تھی لیکن خالہ کے آتے ہی فضا بدل گئی، سماں بدل گیا، حالات بدل گئے اب کون تھا، جو اسے ذلیل کر سکے؟ اسے دھتکار سکے؟ اس پر تہمت لگا سکے؟ اب وہ اپنے مختصر سے کمرے میں نظر بند رہنے پر مجبور نہیں تھی۔

وہ آزاد تھی، یہ گھر اس کا تھا، یہاں اسے وہی اختیار اور اقتدار حاصل تھا جو نسیم کو اپنے گھر میں اور خالہ کا حال کیا تھا؟ بھانجی پر دن رات صدقے قربان ہوا کرتی تھیں۔ ذرا اس کے سر میں درد ہوا اور وہ اپنا دل پکڑ کر بیٹھ گئیں۔

ذرا وہ افسردہ یا مغموم نظر آئی، اور وہ اس پر صدقے واری ہونے لگیں۔ کسی وقت اس نے کھانا نہ کھایا، اور وہ پریشان ہو گئیں وہ اسے آرام پہنچانے کے لیئے رات رات بھر جاگتیں اور دن دن بھر کام کرنے میں خوشی محسوس کرتی تھیں اور اس کے لیئے ہر ایثار اور ہر قربانی کو تیار رہتی تھی اور وہ اکثر سوچا کرتی تھی، اگر اماں زندہ ہوتیں تو شاید وہ بھی اتنا چاہ سکتیں، جتنا خالہ جان مجھے چاہ رہی ہیں " اماں کی محبت مجھ میں اور بھیا (اعجاز) میں منقسم ہو جاتی لیکن خالہ نے تو ارشاد کی محبت بھی مجھی کو دے دی ہے۔

اس خالہ کے متعلق کلثوم کے یہ تاثرات معلوم کر کے اسے بیحد تکلیف ہوئی، اس کا جی چاہا کوئی سخت ترین جواب دے لیکن یہ سوچ کر خاموش رہی کہ اس بیچاری کو تو ان سے خفا ہونا ہی چاہیے، ان کے آتے ہی ان کی بلا شرکت غیرے حکومت ختم ہو گئی، اور پھر بحث کرنے سے کیا حاصل یہ خالہ کے بارے میں لاکھ بدگمانیوں سے کام لیں، ان کا بگاڑ کیا سکتی ہیں؟

وہ اپنی جگہ پر، اپنی جگہ پر۔ پھر بھی بالکل خاموش نہ رہ سکی۔ اس نے کہا۔

چچی جان، ایسا تو نہیں ہے، خالہ مجھے اتنا چاہتی ہیں کہ شاید آپ بھی نسیم کو اتنا نہیں چاہتیں۔ وہ مجھے بہت چاہتی ہیں، آپ اس کا اندازہ بھی نہیں کر سکتیں۔

کلثوم کو اس جواب کی توقع تھی۔ لہٰذا نہ وہ مایوس ہوئی نہ دل شکستہ اس نے کہا۔

بیٹی کاش ایسا ہوتا۔ لیکن تو نہیں جانتی، بہت جلد تیرے سر پر کیسی قیامت ٹوٹنے والی ہے اور جب وہ قیامت آئے گی۔ تب تجھے احساس ہوگا۔ کہ اپنی سادہ لوحی کے باعث کتنی بڑی غلط فہمی میں مبتلا تھی

ان الفاظ نے ایک مرتبہ تو واقعی زلیخا کو چونکا دیا۔ اس نے اس

گفتگو کو نہ بڑھانے کا ارادہ کر چکنے کے باوجود پوچھ ہی لیا۔

"قیامت کیسی چچی جان۔ میں بالکل نہیں سمجھ سکی آپ کا مطلب؟"

چچی جان نے ایک مرتبہ پھر نہایت چاؤ اور پیار سے پان بنایا۔ بیڑا منہ میں رکھا۔ پاندان زور سے بند کیا اور اسے پرے ہٹاتے ہوئے اور زہر خند کرتے ہوئے پوچھا۔

"بتادوں؟۔"

زلیخا نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ جواب دیا۔

"بتا دیجئے۔"

کلثوم نے اس کے اشتیاق کی آگ کو بھڑکاتے ہوئے دریافت کیا۔

تو مجھ سے پھر تو خفا نہیں ہو جائے گی۔ اللہ جانتا ہے۔ اس خطرے سے صرف بھابی کی محبت اور تیری الفت کے باعث آگاہ کر رہی ہوں۔ ورنہ مجھے کیا تھا۔ جو چاہے ہو جاتا۔

زلیخا سخت ذہنی کشمکش میں تھی کہ آخر وہ کون سی قیامت ہے جس کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے وہ کون سا خطرہ ہے جو اس کے سر پر منڈلا رہا ہے۔ لیکن اسے نظر نہیں آتا۔ آخر وہ ضبط نہ کر سکی اور سوال کرنے پہ مجبور ہو گئی۔

"لیکن کچھ بتائیے بھی ہی سہی بات کیا ہے؟"

کلثوم نے ادھر اُدھر دیکھ کر جیسے ہم گوش وار دسے خائف ہیں۔ بہت آہستہ سے کہا۔

وہ بہت جلد تیری ماں بن جائیں گی۔"

زلیخا پر بجلی گر پڑی

اس نے بہ وقت اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے پوچھا،

"یعنی۔"

کلثوم نے نہایت اطمینان سے جواب دیا۔

"یعنی کیا ہے۔ بھائی صاحب شادی کر رہے ہیں رابعہ بیگم سے بڑھاپے

میں تیری قسمت پھوڑنے کے لئے !"

زلیخا کے تن بدن میں آگ لگ گئی اس نے لاکھ لاکھ اپنے جذبات ضبط کرنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوسکی، کلثوم نے اسے جو چاہیے کہہ لیا ہوتا۔ گالیاں بھی دے لی ہوتیں، تو وہ برداشت کر جاتی اف نہ کوئی حرف شکایت زبان پر نہ لاتی۔ لیکن اپنی خالہ کے بارے میں ایسے ناشائستہ اور ناپاک خیالات سن کر اسے ضبط نہ رہی۔ اس نے کہا۔

"میں ایسی باتیں نہیں سن سکتی۔"

کلثوم نے یہ دیکھ کر اتنی دیر کی محنت رائگاں گئی اور وار اوچھا پڑا بڑے ٹھنڈے اور میٹھے لہجہ میں کہا۔

شاید کہ تجھے میری بات کا یقین نہیں آیا۔

زلیخا نے جواب دیا۔

ہاں بالکل یقین نہیں آیا۔ آبھی نہیں سکتا۔ پھر وہ کہنے لگی۔

میں آپ سے زیادہ اپنے باپ اور اپنی ماں کی بہن کو جانتی ہوں مجھے آپ کا ادب ملحوظ ہے۔ ورنہ شاید میں سخت جواب دیتی بہتر یہ ہے کہ آپ اب مجھ سے اس مسئلہ پر گفتگو نہ کریں۔

کلثوم نے پسپا ہوتے کہا۔

میں نے تمہاری ہمدردی میں ایک بات کہی تھی بیٹی بری لگتی ہے تو چلو خاموش ہوئی جاتی ہوں، قسم لے لو، جواب کچھ کہوں !!

زلیخا نے بگڑے تیور اور درشت لہجہ میں کہا۔

شکریہ۔ اور کان کھول کر سن لیجئے کہ جو کچھ آپ نے کہا ہے اگر وہ سچ ہے تو مجھ پر قیامت کیوں ٹوٹنے لگی؟ میرے لئے کوئی خطرہ کیوں پیدا ہونے لگا۔ وہ میری ماں اب بھی ہیں جب بھی رہیں گی اگر وہ ایسا کر بھی لیں تو شرعاً، اخلاقاً، کون سا جرم کریں گی؟"

اس جواب کی تو کلثوم کو ہرگز توقع نہیں تھی، گویا ساری اسکیم ناکام ہوئی کہنے لگیں۔

ہاں بیٹی میرا کیا ہے تم جانو اور وہ جانیں مجھے کیا غرض پڑی ہے۔

کسی کے پھٹے میں ٹانگ اڑانے کی، واقعی عجیب زمانہ آگیا ہے۔ یہ سب قربِ قیامت کی علامتیں ہیں۔

زلیخا پھر کوئی سخت جواب دینے والی تھی کہ دھڑ سے دروازہ کھلا اور ارشاد اندر آیا، اور اس کے پیچھے پیچھے رابعہ!!

کلثوم کو اپنی منصوبہ بندی کے جوش میں اس کا احساس بھی نہ ہو سکا کہ کتنی دیر ہو چکی ہے یہاں بیٹھے بیٹھے؟ ان لوگوں کو دیکھ کر ایک مجرم کی طرح اس کا چہرہ سفید پڑھ گیا اور چپکے سے اٹھی اور کسی سے مخاطب ہوئے بغیر واپس چلی گئی، اتنی تیزی سے کہ نادرہ جائے کی ٹرے لے کر آرہی تھی، اس سے ٹکرا کر خود گرتے گرتے بچیں لیکن ٹرے گرا دی۔

✪

شادی و غم

شادی جو ہوئی غم کے بھی پہلو نکل آئے
جب کوئی ہنسا ساتھ ہی آنسو نکل آئے

(۱)

کلثوم کو اس طرح حواس باختہ اور سراسیمہ جاتے دیکھ کر رابعہ نے زلیخا سے پوچھا۔
خیریت تو ہے؟ آئیں کیوں؟ اور مجھے دیکھتے ہی چلی کیوں گئیں۔
" ارشاد نے لقمہ دیا؟ وہ تو جانا ہی چاہیئے تھا۔ آب آمد تیمم برخاست!"
رابعہ نے ڈانٹا تو ہر معاملہ میں ٹانگ کیوں اڑاتا ہے!"
لیکن خالہ اماں بات تو یہی ہے، وہ آپ کو آتا دیکھ کر ٹھہر نہ سکیں
" اے ہے تو کیوں! میں نے کیا بگاڑا ہے ان کا۔
آپ نے کیا نہیں بگاڑا ہے! اس سارے گھر پہ وہ بلا شرکت غیرے حکمران تھیں، آپ کے آتے ہی وہ طلسم درہم برہم ہو گیا۔
تو بیٹی خوش ہو یا خفا! اپنے جیتے جی تو اہیں تجھ پہ حکومت کرنے دوں گی نہیں۔
" اسی مایوسی نے انہیں حواس باختہ کر دیا ہے "
لیکن اس وقت کیوں آئی تھیں۔
" کچھ امیدیں لے کر!"
امیدیں لے کر!"

یہ کہ آپ بہت بڑی ہیں، آپ کا ظاہر کچھ ہے، باطن کچھ ہے آپ درحقیقت میری سب سے بڑی دشمن ہیں۔

"اور سب سے بڑی دوست وہ خود ہیں!" ارشاد نے مداخلت کی

"زلیخا نے جواب۔" یہی ظاہر کر رہی تھیں۔ ان کا خیال تھا۔ میرا حافظہ بہت کمزور ہے میں سب کچھ فراموش کر چکی ہوں حالانکہ ——

"مجھے یاد سب ہے۔ ذرا تمہیں یاد ہو کہ یاد نہ ہو —— کیوں جی!" ارشاد نے پوچھا۔

زلیخا مسکرانے لگی، رابعہ نے پھر ڈانٹا۔

"تو نہیں چپے گا؟"

پھر زلیخا سے پوچھا۔

"آخر کہہ کیا رہی تھیں، یہ بھی تو معلوم ہو۔!"

خالہ جان چھوڑیے ان باتوں کو۔ ان کی عادت ہی یہی ہے؟"

ارشاد نے پھر مداخلت کی۔

یہ کیوں نہیں کہہ دیتیں، یہ راز کی باتیں ہیں!

زلیخا کی تیوریاں چڑھ گئیں، اس نے ذرا درشت لہجہ میں کہا۔

خالہ جان دیکھ لیجئے مجھے ایسی باتیں اچھی نہیں لگتیں۔

رابعہ نے پھر ارشاد کی خبر لی۔

اب تو جاتا ہے کہ میں نکالوں کان پکڑ کر تجھے یہاں سے؟"

اس نے سوکھا سا منہ بنا کر کہا۔

واہ بھئی کیا اخلاق ہے۔ مہمانوں کو کان پکڑ کے نکال دیا جاتا ہے ایوان شاہی سے!"

اتنے میں نادرہ چائے تیار کر کے لے آئی اور گفتگو کا موضوع بدل گیا۔

اصل میں زلیخا وہ باتیں رابعہ کے سامنے دہرانا نہیں چاہتی تھی جو کلثوم نے کہی تھیں۔ وہ جانتی تھی یہ باتیں اگر منہ سے نکلیں تو قیامت

آجائے گی اور وہ آئے دن کی خانہ جنگیوں سے اتنی دل برداشتہ اور سراسیمہ ہو چکی تھی کہ اب کم ازکم اپنے منہ سے کچھ کہہ کر کوئی فساد برپا کرنا چاہتی تھی ، یہی وجہ تھی ، کہ رابعہ کے استفسار کے باوجود اس نے اصل بات زبان تک نہیں آنے دی اور رابعہ کے وہم وگمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ برہمی اور دشمنی میں کلثوم شرافت اور انسانیت کی حدوں کو توڑ سکتی ہے ۔

اور کلثوم گو زلیخا کی باتوں سے مایوس ہو کر گئی تھی ، لیکن درحقیقت مایوس نہیں ہوئی تھی چنانچہ اس واقعہ کے دوسرے روز ـــ

(۲)

سہ پہر کا وقت تھا۔ امتیاز مردانے میں بیٹھا کسی رسالے کی ورق گردانی کر رہا تھا کہ نادرہ چائے لے کر آگئی۔ اس نے رسالہ ایک طرف رکھ دیا اور چائے سے شغل شروع کر دیا۔ اتنے میں احراز بھی اندر سے آیا بھائی کے پاس بیٹھ گیا۔ امتیاز نے نادرہ سے کہا۔

احراز بھی چائے پیئے گا۔ اس کے لئے کچھ کھانے کو بھی لاؤ۔

ابھی نادرہ نے اپنی جگہ سے جنبش نہیں کی تھی کہ کلثوم ایک طشتری میں تلے ہوئے مٹر، کچھ سموسے اور کھجوریں لے کر آئی، نادرہ پر خفا ہو کر گویا ہوئی۔

"کمبخت کہہ دیا تھا۔ بھائی صاحب چائے کے لئے بیٹھیں تو مجھے بتا دینا۔ لیکن تو اپنے ہوش میں کب ہے؟"

وہ معذرت کرتی ہوئی بولی ـــ

"بھول گئی بی بی؟"

نادانستہ طور پر طنز کا تیر چل ہی گیا، کہنے لگی۔

"ہاں ہماری باتیں کیوں یاد رہیں گی تجھے۔"

وہ چپ ہو گئی، امتیاز نے سموسہ منہ میں رکھ کر چباتے ہوئے کہا۔

بڑے مزے کا ہے۔ لیکن آج یہ عنایت کیسے ہو گئی۔ ہم پر ـــ؟"

ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں ـــ

یہ کہہ کر امتیاز نے ایک قہقہہ لگایا۔ کلثوم کچھ جھینپ سی گئی، کہنے لگی۔
بھائی صاحب کی ہی باتیں۔ آج نسیم نے یہ چیزیں پکائی تھیں اور بیتاب ہو رہی تھی کہ بڑے ابا ضرور چکھیں۔
لیکن وہ کیوں نہ آئی کہاں ہے؟"
"میں نے تو کہا تھا۔ تو خود لے کر جا لیکن بہت ڈرتی ہے آپ سے!"
"ڈرتی ہے؟" کیا میں ہوا ہوں؟"
احراز نے مداخلت کی۔ بھائی صاحب اس گھر میں آپ سے کون نہیں ڈرتا۔ رعب ہی کچھ ایسا ہے آپ کا؟"
امتیاز نے کلثوم سے پوچھا۔
"کیوں بہن تم بھی ڈرتی ہو مجھ سے؟"
وہ بولی "ہمیشہ سے بھائی صاحب!"
امتیاز نے پھر ایک قہقہہ لگایا اور کہا۔
"حیرت ہے میں اپنے آپ کو اتنا ڈراؤنا آدمی نہیں سمجھتا تھا۔"
" احراز نے کہا۔ گھر میں جو سب سے بڑا ہو، اس سے ڈرنا بھی چاہیے سب کو، اس طرح گھر کا نظم و امن قائم رہتا ہے۔"
امتیاز نے گویا ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔
" اچھا بھئی ڈرو جتنا جی چاہے۔"
" کلثوم نے پوچھا "بھائی صاحب تھوڑے سے مٹر اور لے آؤں؟
امتیاز نے مٹر الگ کھسکاتے ہوئے کہا۔
نہیں بھئی بہت کھالیا۔ معدہ یوں ہی ٹھیک نہیں رہتا۔
کلثوم نے وہ طشتری پھر اٹھالی جس میں مٹر لائی تھی۔ پھر جاتے جاتے احراز سے کہا۔
تم بھی چچا ہو، آخر تم اپنا فرض ادا کیوں نہیں کر سکتے، کسی طرح، کتنا اچھا ہوتا۔ اگر صفدر اور نسیم کی شادی کے موقع پر یہ بوجھ بھی اتر جاتا سر سے!"
کلثوم تو اتنا کہہ کر چلی گئی۔ امتیاز نے احراز سے پوچھا۔

کیا بات ہے؟ یہ کلثوم کیا کہہ گئی؟

احتراز نے کچھ سوچتے ہوئے قدرے تامل اور تذبذب کے ساتھ کہا۔

"بھائی صاحب بات یہ کہ تو آپ کو معلوم ہی ہے نسیم کی شادی صفدر سے ہو رہی ہے۔"

"ہاں معلوم ہے پھر؟"

"منگنی کے سلسلہ میں صفدر کی ماں، باپ، بہن وغیرہ بھی یہیں آئے تھے!"

ہاں یہ بھی میں نے سنا ہے، میں تو اس زمانہ میں بیگم کوٹ گیا ہوا تھا

جی ہاں۔ صفدر کی والدہ کو زلیخا بہت پسند آئی۔"

"اچھا پھر؟"

وہ چاہتی ہیں کہ صفدر کے چھوٹے بھائی سے زلیخا کا نکاح ہو جائے۔

"ہوں۔ تمہاری کیا رائے ہے؟"

میری رائے وہی ہے جو آپ کی۔ ویسے اچھا ہے اگر دونوں لڑکیاں (نسیم اور زلیخا) ایک ہی گھر میں رہیں؟"

"کلثوم کو بھی اس سے اتفاق ہے؟"

جی بہت زیادہ، بلکہ سچ پوچھئے تو انہی کی تحریک پر بات آگے بڑھی۔

"لڑکا ہے کیسا؟"

"بہت اچھا۔ صفدر کا بھائی ہے۔"

"اخلاق و عادات؟"

"تعریف نہیں ہو سکتی!"

تعلیم —؟

"تعلیم؟ کوئی ڈگری تو نہیں ہے، ویسے خاصا پڑھا لکھا ہے۔ اور ضرورت بھی کیا ہے ڈگری کی؟ گھر میں کھانے کی کمی تو ہے نہیں، دس کو کھلا کر کھائے گا۔؟"

لیکن وہ دولت ہی تو سب کچھ نہیں ہے۔ میں نے تو سنا ہے وہ نہایت آوارہ اور عیاش قسم کا آدمی ہے، شراب بھی پیتا ہے اور جوا بھی کھیلتا ہے کیا یہ سب گپ ہے؟"

بالکل گپ ہے بھائی صاحب، وہ نہایت سعید اور ہونہار لڑکا ہے۔

صورت شکل کیسی ہے؟"

"وہ بھی بری نہیں، ناک، نقشہ تو بہت اچھا ہے، ویسے رنگ ذرا سفید ہے۔"

"یعنی بہت گورا ہے!"

جی ہاں۔ بہت زیادہ گورا رنگ بھی تو بعض دفعہ بلائے جان بن جاتا ہے، یعنی سورج مکھی۔

ہاں میں سمجھ گیا۔

ویسے علاج ہو رہا ہے اور شفاء الملک صاحب نے امید دلائی ہے کہ ٹھیک ہو جائے گا، لیکن حقیقت میں یہ کوئی مرض نہیں ہے، نہ اس کی صحت پر کوئی اثر پڑتا ہے" پھر یہ بھی تو دیکھئے، بچی گھر کی گھر میں روپے پیسے کی کمی نہیں، عیش کرے گی، راج کرے گی۔

C

(۳)

نادرہ چائے کی ٹرے لے کر واپس جا چکی تھی، اس کے سامنے ہی کلثوم نے احراز کو بات کرنے کے لئے اکسایا تھا، سارا پلان اس کی سمجھ میں فوراً آگیا تھا، ٹرے لے کر جیسے ہی واپس پہنچی، رابعہ سے کہا۔
ذرا جا کر سنئے تو سہی، کیا باتیں ہو رہی ہیں بھائی بھائی میں "
وہ بولی "مجھے کیا پڑی ہے، بھائی بھائی کی باتیں سننے کی "
وہ کہنے لگی، پھر مجھے الہنا نہ دیجئے گا، کہے دیتی ہوں!"
اب تو رابعہ کے کان کھڑے ہوئے پوچھا؟
کس طرح کی باتیں ہو رہی ہیں؟"
وہ کہنے لگی "وہی تو کہتی ہوں سن لیجئے جا کر۔ آپ ہی کی باتیں ہیں۔
رابعہ نے پھر کوئی سوال، جواب نہیں کیا۔ لپکی لپکی گئی اور دروازے کی اوٹ میں کھڑی ہو کر احراز اور امتیاز کی باتیں سننے لگی اور جب کسی طرح ضبط نہ ہو سکا تو دروازہ کھول اندر۔
امتیاز نے اسے دیکھتے ہی کہا۔
" خوب آگئیں تم رابعہ! بڑی ضرورت تھی، دیکھو یہ احراز کیا کہہ رہے ہیں؟

رابعہ نے اپنے جذبات اور تاثرات ظاہر نہیں ہونے دیئے کہنے لگی
" یہ کیا کہہ رہے ہیں "
" امتیاز نے بتایا۔ زلیخا کی شادی چاہتے ہیں کہ صفدر کے بھائی سے کر دی جائے !"
پھر احراز سے کہا، بات یہ ہے کہ زلیخا پر مجھے ذرا بھی اختیار نہیں ہے یہ اس کی خالہ بھی ہیں، ماں بھی ہیں باپ بھی ہیں اس کے متعلق میں آپ نے سارے حقوق سے دست بردار ہو چکا ہوں جو فیصلہ کر دیں گی میں بھی منظور کر لوں گا۔
احراز رابعہ کو آتا دیکھ کر سٹ پٹا گیا۔ اور اب امتیاز کی یہ باتیں سن کر اور زیادہ متوحش ہو گیا، لیکن بات چھیڑ چکا تھا۔ لہٰذا خاموش بھی نہیں رہ سکتا تھا، کہنے لگا۔
" مجھے امید ہے، آپ کو بھی اس رشتے سے انکار نہ ہو گا۔
" احراز نے پوچھا " کیا آپ کو لڑکی کا مفاد عزیز نہیں ہے ؟ کیا اس سے اچھا رشتہ مل سکتا ہے، ماں باپ کی سب سے بڑی خواہش یہ ہوتی ہے کہ لڑکی اچھے گھر میں جائے، مالدار گھر میں جائے دودھوں نہائے، پوتوں پھلے، خوش قسمتی سے ایسا رشتہ مل رہا ہے پھر کیا وجہ ہے کہ اسے نامنظور کر دیا جائے " کہنے لگیں، وجہ پوچھتے ہو تو وجہ یہ ہے کہ میں اس کی شادی ارشاد سے کروں گی "
وہ پیش گوئی صحیح ثابت ہوئی، جو کلثوم نے کی تھی، وہ بولا۔
" ارشاد سے !"
رابعہ نے نہایت اطمینان سے جواب دیا۔
" ہاں ارشاد سے، کچھ اعتراض ہے تمہیں ؟"

احراز نے جواب دیا۔ اگر بھائی صاحب کو یہ رشتہ منظور ہے تو میں اختلاف نہیں کروں گا۔ لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ لڑکی کی قسمت کا فیصلہ جذبات کی رو میں نہ کرنا چاہیے، حقائق کی روشنی میں کرنا چاہیے۔ ارشاد بے شک

آپ کا لڑکا ہے اور آپ کی نظر میں وہ دنیا جہاں کے لڑکوں سے بہتر بھی ہوگا۔ لیکن ہم بھی یہ معلوم کرنے کا حق رکھتے ہیں کہ آیا وہ لڑکی کو سکھ اور آرام سے رکھ سکے گا۔

رابعہ نے جواب دیا۔ سکھ اور آرام کا تعلق قسمت سے ہے مال و دولت سے نہیں؛ ایسی نہ جانے کتنی لڑکیوں کو میں جانتی ہوں، جو مالدار گھرانے میں بیاہی گئیں لیکن ساری عمر رونے جھینکنے گزری، زندگی جہنم بن گئی بیچاریوں کی اور ایسی لڑکیاں بھی میری نظر میں ہیں جو غریب گھر بیاہ کر گئیں شوہر کی محبت نے غریبی کی زندگی کو بھی جنت بنا دیا۔"

احراز نے دفعتہً بڑا نفسیاتی سوال کیا۔

"محبت؟" کیا آپ کا مطلب یہ ہے کہ ارشاد محبت کرتا ہے؟"

بغیر کسی جھجک کے رابعہ نے جواب دیا۔

"کیوں نہ کرے! کیا اسے محبت کرنے کا حق نہیں ہے۔ کیا یہ حق صرف صفدر کو ہے؟"

احراز کا چہرہ سرخ ہوگیا، آنکھیں ابل آئیں، سارے بدن سے کانپنے لگا، بڑے طیش کے عالم میں دریافت کیا۔

"یہ آپ نے کیا کہا؟"

وہ بغیر کسی جھجک کے گویا ہوئی۔

"جو تم نے کہا اس کا جواب دیا کچھ اور کہو گے تو اس کا جواب بھی پالو گے؟

(برہمی کے عالم میں) آپ نے بہت سخت اور قطعاً ناقابل برداشت بات کہی ہے؟"

"وہ بولی" لیکن بالکل سچ بھی تو ہے۔"

"آپ تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے لڑنے آئی ہے!"

رابعہ نے کہا۔ "مجھے کیا ضرورت ہے لڑنے کی؛ میں نے تو یہ نہیں

کہا۔ کہ نسیم کی شادی فلاں امیر کبیر، فلاں جاگیردار بھائی سے ہو رہی ہے
ٹھیک ہے، پھر تم یہ کیوں چاہتے ہو کہ زلیخا عنبر کے گھر جائے اور
اپنی خالہ کے لڑکے سے نہ بیاہی جائے۔"

"میں کچھ بھی نہیں چاہتا۔ جو جی چاہے کیجئے۔"

یہ کہتا ہوا احراز اٹھا اور خفگی کے عالم میں اندر چلا گیا۔

(۳)

رابعہ اور احراز کی گفتگو میں امتیاز نے بالکل حصہ نہیں لیا وہ حقہ کے کش لگاتا۔ اور رسالہ کی ورق گردانی کرتا رہا جیسے اس گفتگو سے اسے کوئی تعلق نہیں ہے جیسے یہ گفتگو اس کی موجودگی میں نہیں ہو رہی ہے وہ سن ہی نہیں رہا ہے۔ ان دونوں کی باتیں۔

احراز کے جانے کے بعد امتیاز نے رسالہ کی ایک طرف ٹپکا اور حقہ کا ایک زوردار کش لینے کے بعد کہا۔

"میں یہ دیکھ کر حیران رہ جاتا ہوں، کتنا فرق ہے، تم میں اور مریم میں۔"

وہ بولی۔ ہاں اگر اتنا فرق نہ ہوتا، تو ابھی وہ زندہ ہوتیں اس قدر جلدی اس دنیا سے رخصت نہ ہو جاتیں۔"

امتیاز نے جواب کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔

مریم میرے سامنے بات نہیں کرتی تھی، میری وجہ سے کلثوم اور احراز کڑوی کسیلی باتیں برداشت کرتی تھی، وہ میرے ماتھے کی شکن پہچانتی تھی۔ میرے مزاج کی افتاد سے آشنا تھی۔ اس کے لب میرے سامنے بند رہتے تھے۔ نہ اس نے مجھ سے کوئی مطالبہ کیا، نہ فرمائش، نہ میری کسی بات پر اعتراض کیا، نہ جواب دیا۔ میں نے جو چاہا کیا، وہ خدا کی

بندی چپ چاپ برداشت کرتی رہی۔ نہ زبان حرف شکایت سے آشنا ہوئی، نہ لب شکوہ سنج ہوئے مجھ سے اسے تکلیفیں پہنچیں، دکھ پہنچے لیکن اس نے میرے معاملہ میں کبھی مداخلت نہیں کی زندگی میں میں نے اس کی قدر نہ کی اور اب دن میں ہزار مرتبہ یاد آتی ہے اور جب یاد آتی ہے دل خون کے آنسو روتا ہے۔ جب تک وہ زندہ تھی میں سمجھتا رہا یہ شاید زائد شے ہے اس کا اور میرا کوئی میل نہیں ہم دونوں کو نہ جانے کیوں قسمت نے ایک کر دیا ہے اسے میری ضرورت ہوتی ہو تو ہو میں اس کی قطعاً ضرورت محسوس نہیں کرتا لیکن جب وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئی تو ایسا محسوس ہوتا ہے، سب کچھ چھن گیا سب کچھ جاتا رہا! زندگی بے کیف ہو گئی زندہ رہنے میں مزا نہ رہا۔ اب محسوس کرتا ہوں، جیسے میں اس کے دم سے زندہ تھا اسی کے لئے زندہ تھا۔ اب وہ نہیں تو زندگی کاٹنے کو دوڑتی ہے اب زندگی سے نفرت ہو گئی ہے مجھے۔"

اور پھر بڑے جوش کے عالم میں اس نے کہا۔

رابعہ یا تو مریم کو زندہ ہو جانا چاہیئے ورنہ مجھے مر جانا چاہیے، وہ زندہ نہیں ہو سکتی۔ مجھ کو مرنا پڑے گا۔ اور میں اس کے تیار ہوں۔

رابعہ امتیاز کی یہ کیفیت دیکھ کر گھبرا گئی۔ اس نے کہا۔

بھائی صاحب آپ اتنے پریشان کیوں ہیں، آپ کو زندہ رہنا ہے مجھے زندہ رہنا ہے؟ نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے۔

" اپنے لئے نہیں، زلیخا کے لئے!"

زلیخا کے لئے تم کافی ہو۔ میں چاہتا ہوں، جلد از جلد زلیخا اور ارشاد کی شادی انجام پا جائے، تم زلیخا کو بیٹی تو بنا چکی ہو، اب بہو بناؤ اور اپنے ساتھ سعادت گنج لے جاؤ تاکہ میں اطمینان سے مر سکوں۔

رابعہ نے جو دیکھا، اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا، وہ گھبرا گئی اس نے کہا۔

بھائی صاحب یہ آپ کو کیا ہو گیا ہے! آپ کس طرح کی باتیں کر

رہے ہیں، اللہ نے چاہا تو زلیخا اور ارشاد کی شادی ضرور ہو گی۔

" امتیاز نے ٹوکا!" یہ تو میں بھی جانتا ہوں، ضرور ہو گی۔ لیکن چاہتا ہوں جلد ہو، میرے سامنے، میری زندگی میں، مرنے سے پہلے ایک خوشی تو دیکھ لوں، تم نہیں جانتیں رابعہ، مجھے مرنے کی کتنی جلدی ہے میں تمہیں اسی امید پر لایا تھا۔ کہ جلد از جلد یہ رسم انجام پا جائے گی۔ لیکن تم نہ جانے کیا سوچ رہی ہو؟"

" وہ بولی۔" بھائی صاحب میں تو کچھ نہیں سوچ رہی صرف آپ کے ارشاد کی دیر ہے!"

یہ کہہ کر رابعہ نے جو نظر اٹھائی تو امتیاز کی گردن ڈھلک چکی تھی وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔

○

(۵)

تو چل میں آیا۔

امتیاز کی بے ہوشی نے سارے گھر میں ہل چل مچادی، نوکر چاکر، عزیز، اقارب، دوست، احباب، حکیم، ڈاکٹر بھائی، بھاوج، رابعہ اور زلیخا سب ہی دوا دوش میں لگ گئے۔

کافی دیر کے بعد امتیاز کو ہوش آیا تو سب کے دم میں دم آیا، آپس کے اختلافات کتنے ہی سنجیدہ ہوں، لیکن ایسا کوئی نہ تھا، جو اس کا مرنا چاہتا ہو، وہ بہر حال گھر کا بڑا تھا، اپنے مخصوص عادات و اطوار کے باوجود، احترام، عزت اور وقار کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔

جب تک امتیاز کو ہوش نہیں آگیا، یوں تو سب ہی پریشان تھے۔ لیکن زلیخا اور رابعہ کی حالت سب سے زیادہ ابتر تھی، زلیخا کی آنکھوں سے جو سیل اشک جاری ہوا تو رکنے کا نام ہی نہیں لیتا تھا، یہی حالت رابعہ کی تھی۔ نہ آنسو رکتے تھے نہ پاؤں کو قرار تھا، کبھی حکیم صاحب سے حال دریافت کر رہی ہیں کبھی ڈاکٹر صاحب سے پوچھ رہی ہیں ڈاکٹر صاحب نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"ہوش میں آگئے، یہ بڑی بات ہے لیکن مطمئن نہ ہونا چاہیے، یہ دورہ پھر بھی پڑ سکتا ہے اور مہلک بھی ثابت ہو سکتا ہے۔"

یہ سن کر رابعہ کی جان نکل گئی، اس نے ڈرتے ڈرتے سوال کیا

"کیا خدانخواستہ —"

ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا، ہاں دماغ بھی متاثر ہے اور دل بھی، فالج بھی گر سکتا ہے، اور ہارٹ بھی فیل ہو سکتا ہے!"

رابعہ کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی، بے بسی تصویر بن کر پوچھنے لگی۔

پھر اب کیا ہوگا؟" ڈاکٹر صاحب نے ہمدردانہ انداز میں کہا۔

جب تک سانس تب تک آس جو بہتر سے بہتر دوا ممکن ہے وہ دی جا رہی ہے، اب یہ آپ کا کام ہے کہ انہیں مشتعل نہ ہونے دیں انہیں صدمہ نہ پہنچنے دیں، خوش رکھیں، فکر، تشویش اور اضطراب کو پاس نہ پھٹکنے دیں۔ اگر آپ نے یہ کر لیا، تو میں ذمہ داری کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ انشاءاللہ کافی دن زندہ رہیں گے۔"

اس کے بعد رابعہ کوشش کے باوجود کچھ نہ پوچھ سکی، چپ چاپ سر جھکا کر کھڑی ہو گئی اور کچھ سوچنے لگی۔ اتنے میں نادرہ آئی اس بیچاری کا بھی چہرہ اترا تھا، حد درجہ غمزدہ اور پریشان نظر آ رہی تھی کہنے لگی!"

بی بی جی صاحب بلا رہے ہیں، آپ کو؟

ڈاکٹر کو رخصت ہونے کا موقعہ مل گیا، پھر وہ آنے وعدہ کر کے چلا گیا، رابعہ نے نادرہ سے پوچھا۔

"اب طبیعت کیسی ہے؟"

"وہ بولی: ٹھیک ہے!" ڈاکٹر کیا بتا رہا تھا۔ خدانخواستہ کوئی خاص بات تو نہیں ہے؟"

رابعہ نے ڈاکٹر کے الفاظ با چشم پرنم دہرا دیئے اور گلوگیر آواز میں کہا۔

خدا خیر کرے، آج بھائی صاحب باتیں بھی کچھ ایسی کر رہے تھے۔ کہ شروع ہی سے میرا دل دھڑک رہا تھا۔ انہوں نے کبھی بھولے سے

بھی آپا! مریم کا نہ ذکر کیا تھا، نہ انہیں یاد کیا تھا۔ آج بس انہی کا ذکر کرتے ہوئے۔ انہیں کی باتوں میں اُلجھائے رکھا ہے مجھے، نادرہ آج تو ایسا معلوم ہو رہا تھا۔ جیسے وہ آپا کے غم میں گھلے جا رہے ہیں۔ کئی بار انہوں نے مریم کے بغیر زندگی، زندگی نہیں، اب مر جانے کو جی چاہتا ہے، میں نے ٹوکا بھی، روکا بھی لیکن وہ سنتے کسی کی بھی نہیں اپنی کہتے رہے، اور یہی باتیں کرتے کرتے بیہوش ہو گئے۔ نادرہ۔ بھائی صاحب اچھے ہو جائیں گے؟"

نادرہ نے محبت اور ہمدردی کی نظر سے رابعہ کو دیکھا اور کہنے لگی خدا نے چاہا تو ضرور ہو جائیں گے۔ لیکن بی بی جی دیر ہو گئی۔ جلدی چلئے، انہوں نے بلایا ہے۔ انتظار کر رہے ہیں آپ کا۔

رابعہ نے دوپٹہ سنبھالا اور ساتھ ہو لی نادرہ کے۔

○

(۶)

رابعہ امتیاز کے کمرے میں پہنچی، وہ بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ لیکن اتنی ذرا سی دیر میں کئی مہینے کا بیمار معلوم ہونے لگا تھا۔ مگر آدمی با حوصلہ اور باہمت تھا۔ کامیابی کے ساتھ اپنی کمزوری چھپانے کی کوشش بھی کر رہا تھا۔ رابعہ کو با چشم پرنم دیکھ کر اس نے مسکرانے کی کوشش کی، پھر بڑے چاؤ کے ساتھ اس سے کہنے لگا۔

بے وقوف ہوا چھی خاصی رو کیوں رہی ہو؟"

اور قبل اس کے رابعہ میں کچھ کہے۔ وہ بولا۔

زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے۔ آدمی وقت سے پہلے کسی طرح نہیں مر سکتا اور وقت کے بعد کسی طرح زندہ نہیں رہ سکتا اور پھر میرا جہاں تک تعلق ہے مجھے زندگی سے کوئی خاص رغبت بھی نہیں ہے۔ کافی عمر ہو گئی۔ کافی دنیا دیکھ لی۔ اب کون سی حسرت ہے جس کی تکمیل کے لئے میرا زندہ رہنے کو جی چاہے۔"

رابعہ خفا ہوتی ہوئی بولی۔

بھائی صاحب پھر آپ نے وہی باتیں شروع کر دیں۔

"میں چلی جاؤں گی؟"

اس نے زیر لب تبسم سے کہا۔

ابھی نہ جاؤ۔ کچھ ضروری باتیں کرنے کے لئے تمہیں بلایا ہے۔
رابعہ نے اُلجھتے ہوئے کہا۔ باتیں ہوتی رہیں گی، پہلے آپ تندرست ہو لیجئے۔

امتیاز نے ابھی کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ کہ احراز آگیا، اس نے آتے ہی رابعہ کی طرف دیکھے بغیر لیکن درحقیقت اس سے کہا۔
"ڈاکٹر صاحب نے سخت تاکید کی ہے کہ کسی طرح کی باتیں نہ کی جائیں۔"

پھر امتیاز سے مخاطب ہو کر گویا ہوا۔
بھائی صاحب آپ کو مکمل آرام کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر صاحب کہہ رہے تھے۔ یہ حملہ آپ پر بیماری کا اس لئے ہوا کہ نہ آپ کو آرام میسر ہے، نہ سکون، اس نے حکم دیا ہے کہ دوسرے لوگ آپ کے پاس کم سے کم سے نشست برخاست رکھیں اور آپ بھی بالکل خاموش رہیں
امتیاز نے گویا فیصلہ کن انداز میں جواب دیا۔
دونوں باتیں ناممکن ہیں۔ ڈاکٹر کو بکنے دو۔"
اتنے میں کلثوم چائے کی پیالی میں یخنی لے کر آئی اور بڑے محبت بھرے لہجہ میں کہا۔
لیجئے صاحب پی لیجئے۔
"امتیاز نے پوچھا۔ یہ کیا بلا لے آئیں؟"
وہ یخنی ہے، چوزے کی ذرا طاقت آجائے گی؟"
احراز نے جھڑکا" عجیب بے وقوف آدمی ہو۔ یہ چوزے کی یخنی کا کون سا موقعہ ہے۔
گلوکوز لاؤ۔"

کلثوم کے پیچھے پیچھے نسیم بھی آگئی تھی، گلوکوز کا نام سن کر وہ دوڑی دوڑی گئی اور ذرا دیر میں گلوکوز کا گلاس لے کر حاضر ہو گئی۔ کلثوم نے دزدیدہ نظروں سے رابعہ کو دیکھا، پھر کہنے لگی۔

"خون پھر خون ہوتا ہے!" لیجئے بھائی صاحب پی لیجئے۔

اس مرتبہ امتیاز نے انکار نہیں، پی لیا، پھر رومال سے منہ پونچھتے ہوئے کہا۔

"زلیخا کہاں ہے۔"

"زلیخا کہاں ہے"؟

"رابعہ بول پڑی" وہیں ہے اپنے کمرے میں، اس کے تو آنسو ہی نہیں تھمتے کسی طرح۔"

کلثوم نے اپنی بیٹی سے کہا۔ نسیم یہاں کھڑی کیا کر رہی ہو، بس دیکھ لیا تایا باجی کو، خدا کے فضل سے اچھے ہیں، بہت جلد بالکل اچھے ہو جائیں گے جاؤ زلیخا کی خبر لو، میری بچی ہلکان ہوئی جا رہی ہے، روتے روتے میں بھی ابھی آتی ہوں۔"

نسیم نے ایک سعادت مند لڑکی کی طرح اس ہدایت کی تعمیل کی اور زلیخا کے کمرے میں اس کا جی بہلانے کے لئے چلی گئی۔

امتیاز نے بستر پر پاؤں پھیلا لئے اچھی طرح، پھر کہا۔

"نیند آرہی ہے!"

احراز نے کہا۔

یہ تو بہت اچھا ہے سو جایئے۔

(۷)

امتیاز ایک مہینے تک بستر سے نہ اُٹھ سکا، دوا علاج پر کافی روپیہ صرف ہو گیا۔ اتنے دنوں کے بعد آج پہلی مرتبہ بستر سے اترنے اور چند قدم ٹہلنے کی اجازت ملی، وہ ڈاکٹروں پر سخت جھنجھلاتا تھا، کہ میں کوئی خاص شکایت محسوس نہیں کرتا، نہ سر میں درد ہے نہ چکر آرہے ہیں، نہ کوئی اور خاص تکلیف ہے۔ لیکن ڈاکٹروں نے مجھے بیمار بنا رکھا ہے خواہ مخواہ نہ بستر سے اتر سکتا ہوں، نہ لوگوں سے بات چیت کر سکتا ہوں نہ مرضی کا کھا سکتا ہوں، وہی ابلا ہوا کھانا، بے مزہ، بے رنگ، بے کیف، کمرہ کے اندر تھوڑی دیر ٹہلنے کے بعد وہ آرام کرسی پر دراز ہو گیا، اتنے میں زلیخا آئی۔ اس نے دریافت کیا۔

" ابا جی کھانا لے آؤں؟"

امتیاز نے شفقت اور محبت کی نظر سے بیٹی کو دیکھا اور کہنے لگا۔

"لے آؤ۔ لیکن وہی پھیکا اور سیٹھا کھانا پکایا ہوگا اب تو اس کے تصور سے ابکائی آتی ہے۔

یہی باتیں وہ خود بھی پکاتے وقت سوچا کرتی تھی اور اسے اپنے باپ پر بڑا ترس آتا ہے کہ اتنا خوش خوراک شخص کس طرح ابلا اور بے مزہ کھانا کھا رہا ہے لیکن زندگی بڑی قیمتی ہوتی ہے اسے قائم رکھنے کے لئے ہر طرح کے دکھ جھیلے جا سکتے اور تکلیفیں اٹھائی جا سکتی ہیں، یہی

سوچ کر وہ چپ رہتی تھی۔ لیکن آج باپ کے منہ سے یہ الفاظ سننے کے بعد وہ خاموش نہیں رہ سکی، بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

تو جو کچھ کہئے وہ پکا لاؤں؟"

امتیاز نے بے بسی کے ساتھ جواب دیا" لیکن گھر میں جو ڈاکٹر صاحب (رابعہ) بیٹھے ہوئے ہیں، وہ تمہیں کب کچھ پکانے دیں گے؟

وہ مسکراتی ہوئی بولی"۔ آج بڑے مزے کے گلاوٹ کے کباب پکے ہیں، پرہیزی کھانے کے ساتھ تھوڑے سے نظریں بچا کر وہ بھی لیتی آؤں گی، ذرا منہ کا مزہ بدل جائے گا۔"

امتیاز انکار نہ کر سکا، کہنے لگا" اچھی بھئی، تمہاری اس ہمدردی اور محبت کا شکریہ، اگر لا سکو تو لے آؤ تھوڑے سے۔!"

زلیخا واپس جانے کے لئے مڑی ہی تھی کہ سینی ہاتھ پر رکھے رابعہ بیگم آگئیں، ملامت آمیز نظروں سے اسے دیکھا اور بولیں۔

واہ بیٹی واہ غضب خدا کا، اتنی دیر ہو گئی، تم یہاں باتیں کر رہی ہو اور کھانے کی کچھ فکر ہی نہیں!"

زلیخا سٹپٹا گئی، کہنے لگی۔

"خالہ جان جا تو رہی تھی کہ آپ خود لے آئیں۔"

امتیاز کو بڑی ذہنی کوفت ہوئی تھی، اس وقت، اتنے دنوں کے بعد سازش کامیاب ہوئی تھی اور منہ کا ذائقہ بدلنے کا موقعہ ملا تھا۔ لیکن رابعہ کی ہمدردی نے وہ زریں موقعہ بھی کھو دیا۔ لیکن آج وہ بھی احتجاج بلکہ اسٹرائیک پر تلا ہوا تھا، کہنے لگا۔

رابعہ اب یہ کھانا مجھ سے نہیں کھایا جاتا۔ اب تو اس کے تصور سے جی متلاتا ہے، لے جاؤ، اور جب ڈاکٹر اجازت نہ دے مجھے فاقہ کرنے دو۔

رابعہ نے سینی ایک طرف رکھ کر سنی کی ان سنی کرتے ہوئے کھانا میز پر لگا دیا اور بولی۔

بھائی صاحب بچّہ نہ بنئیے، اب تو ڈاکٹر صاحب نے کافی پرہیز توڑوا دیا ہے کئی چیزوں کی اجازت دے دی ہے۔ دیکھئے یہ تھوڑے سے گلاوٹ کے کباب بھی لائی ہوں آپ کے لئے۔

امتیاز کے چہرے پر رونق آ گئی کہنے لگا۔

گلاوٹ کے کباب ــ یہ میں کیا سن رہا ہوں؟"

" وہ بولی بھائی صاحب، سچ مجھے خود بڑا ترس آتا ہے آپ پر میں نے ارشاد کو خاص طور پر ڈاکٹر صاحب کے پاس بھیجا اور ان سے اجازت منگوائی کہنے لگے، تھوڑے سے دے سکتی ہو۔ لیکن میں کچھ زیادہ ہی لے آئی خدا آپ کو کھانا نصیب کرے اب تھوڑے دنوں میں پرہیز بالکل ختم ہو جائے گا۔ پھر اللہ چاہے سب کھایئے گا۔"

امتیاز کھانے پر بیٹھ گیا۔ کباب بہت مزے کے تھے چند لقموں میں صاف ہو لئے۔ پھر وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔

" رابعہ نے پوچھا" ارے آج تو آپ نے کچھ کھایا ہی نہیں!"

وہ بولا جو کھانے کی چیز تھی کھالی۔ اگر اور کھلانا چاہتی ہو تو دو اور لے آؤ۔

زلیخا دوڑی گئی اور پلک جھپکاتے میں تین چار کباب ایک طشتری میں رکھ کے لے آئی، رابعہ نے اُسے گھورا اور طشتری اس کے ہاتھ سے لے لی پھر امتیاز سے کہا۔

بھائی صاحب ان کبابوں سے آپ کی جان ہمیں زیادہ عزیز ہے بھلے سے اب کچھ نہ کھایئے۔ ہاتھ کھینچ لیجئے۔ لیکن یہ تو اب نہیں ملنے کے میں ڈاکٹر کی ہدایت کے خلاف نہیں کرنے دوں گی آپ کو۔"

بہت اچھا جناب! یہ کہہ کر امتیاز نے ہاتھ دھو لئے اور زلیخا سینی اور برتن لے کر واپس چلی گئی لیکن ذرا ہی دیر میں پھر واپس آ گئی اور رازدارانہ لہجہ میں کہنے لگی۔

" آپا جی میں لے آئی اور دروازہ اندر سے بند کئے دیتی ہوں کھا لیجئے۔"

امتیاز کو ہنسی آگئی اس نے کہا۔
"کیا تو چوری کر لائی ہے۔؟"
اس نے اقرار میں گردن ہلائی۔ امتیاز نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔
کتنا خیال رکھتی ہے میری بیٹی اپنے باپ کا، لیکن میری بچی اب طبیعت راغب نہیں ہے کل پھر سہی؟" اور زیادہ بدپرہیزی کرتے ڈر بھی لگتا ہے یہ پکائے کس نے ہیں!"
"وہ بولی ہیں نے۔"
امتیاز نے ایک مرتبہ پھر محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہنے لگا۔" بڑا سوراہے تیرے ہاتھ ہیں۔ بالکل مریم کی طرح۔
زلیخا نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ تو اس کی آنکھوں ہیں آنسو جھلملا رہے تھے۔

○

(۸)

باپ کی اس تبدیلی پر زلیخا حد درجہ متحیر تھی!
اس نے جب سے ہوش کی آنکھیں کھولی تھیں، کبھی مہر پدر سے آشنا نہیں ہوئی تھی۔ گھر کا ماحول اسے ہمیشہ دہشت انگیز ہی نظر آیا۔ ماں کو باپ سے ڈرتے، بھائی باپ سے سراسیمہ ہوتے، باپ کو ایک فرعون ایک ڈکیٹیٹر ایک سفاک، ایک درندہ خو شخص کی حیثیت سے گھر میں آتے۔ وہ ہمیشہ سے دیکھتی چلی آرہی تھی۔ چنانچہ جب اس کی ماں اس دنیا سے رخصت ہوئی اور باپ کی آنکھ سے ایک قطرۂ اشک بھی نہ گرا۔ جب اس کے بھائی کو جلا وطن کیا گیا اور باپ نے مڑ کر بھی اس کی طرف نہیں دیکھا تو اسے صدمہ ضرور ہوا تھا۔ بڑی دیر تک وہ اپنے گوشۂ تنہائی میں روتی بھی تھی۔ لیکن حیرت نہیں ہوئی تھی۔ اس لئے کہ شقاوت کے اس طرز عمل میں کوئی ندرت نہیں تھی جس پر حیرت کی جاتی۔

لیکن مریم کے انتقال کے کچھ عرصہ بعد اعتنائیانہ کی روش میں تبدیلی شروع ہوئی یہ خوش گوار بھی تھی اور حیرت انگیز بھی۔ پھر اعجاز کی جلا وطنی کے بعد یہ تبدیلی اور نمایاں ہوئی۔ اس نمایاں تبدیلی نے حیرت بھی بڑھا دی اور خوشگواری میں بھی اضافہ کر دیا۔ پھر رابعہ اور ارشاد کے آنے کے بعد مہر پدر میں اور اضافہ ہوا اور جب سے وہ بستر علالت سے اٹھا تھا۔ اگر یہ کہا جائے کہ کایا پلٹ گئی تھی تو ذرا بھی مبالغہ نہ ہوگا۔

پہلے کبھی امتیاز اس کے پاس خود آ کر نہیں بیٹھا تھا، کبھی اپنے پاس اصرار سے بٹھا کر باتیں کیں۔ کبھی اس کی دلجوئی کا خیال نہیں رکھا کبھی اسے خوش دیکھ کر خوش نہیں ہوا۔ کبھی اسے افسردہ دیکھ کر دکھی اور غمگین نظر نہیں آیا۔ لیکن اب اس کے وقت کا بڑا حصّہ اس کے پاس صرف ہوتا تھا وہ اسے زیادہ سے زیادہ خوش رکھنے کی کوشش کرتا تھا۔ ذرا بھی اسے پریشان یا افسردہ دیکھتا تو بے کل ہو جاتا تھا۔۔ ایسا محسوس کرنے لگی تھی زلیخا جیسے مریم قبر سے زندہ ہو کر واپس آگئی ہے۔

یہ کتنی خوشی کی بات تھی۔

کیا اب بھی وہ خوش اور مسرور نظر آتی ہے۔

اب اُسے کیا غم تھا، رابعہ کی صورت میں ماں مل گئی۔ امتیاز کی صورت میں گم شدہ باپ مل گیا اور ارشاد کی صورت میں اسے ایک سچا دوست بھائی اور محبت کرنے والا عاشق جانباز مل گیا۔

کلثوم نے جو ستم توڑے تھے، نسیم کی طرف سے جو زیادتیاں ہوئی تھیں، صفدر کے زمانہ قیام میں مسلسل اور پیہم اس کی دل آزاری اور توہین اور تذلیل کا جو سلسلہ جاری تھا۔ صفدر کی ماں نے جس طرح اسے پاؤں کی جوتی سمجھ کر پاؤں تلے روندنے کی کوشش کی تھی، یہ سب باتیں اب اس کی لوح دل سے محو ہو گئی تھیں۔۔ برائے کینۂ اغیار در دلم جا نیست

اب وہ سراپا مسرت تھی، اب اس کی خوشی کوئی نہیں چھین سکتا تھا۔

وہ بیٹھی یہی باتیں سوچ رہی تھی کہ امتیاز نے ٹوکا اور پوچھا۔

"بیٹی کیا سوچ رہی ہے تو؟"

وہ مسکراتی ہوئی کہنے لگی "کچھ بھی تو نہیں ابا جی!"

لیکن امتیاز کا تقاضا جاری رہا۔

ضرور تو کوئی خاص بات سوچ رہی تھی!"

زلیخا دل کی بات چھپا نہ سکی، کہنے لگی۔

سوچتی ہوں آپ کتنی محبت کرنے لگے ہیں مجھ سے اور یہ سوچ کر

میرا دل اتنا خوش ہوتا ہے۔ اتنا خوش ہوتا ہے کہ کہہ نہیں سکتی۔"

ان الفاظ میں صداقت بھی تھی، اور طنز تھا۔ امتیاز نے دونوں چیزیں محسوس کیں۔

لیکن بیٹی، اگر باپ بیٹی کو نہ چاہے گا، تو اور کون چاہے گا۔"

"یہی تو میں خود ہمیشہ سوچا کرتی تھی۔ لیکن آپ پہلے ایسے کب تھے جیسے اب ہیں؟"

امتیاز نے محبت بھری نظروں سے اسے دیکھا اور کہنے لگا۔

ہاں بیٹی تو نے سچ کہا۔ میں پہلے بہت برا تھا۔ بہت ذلیل تھا۔ میں نے اپنی بیوی کا حق ادا نہیں کیا۔ میں نے اپنی اولاد کا حق ادا نہیں کیا، یہ باتیں جب سوچتا ہوں، تو ہوک سی اٹھتی ہے، اک تیر سا لگتا ہے آکر کلیجے میں لیکن اب تو میں بدل گیا ہوں۔ یہ مانتی ہے تو؟

وہ کچھ فخر، کچھ ناز کچھ محبت کے ساتھ بولی۔

"ہاں مانتی ہوں۔ میں کیا سارا گھر مانتا ہے چچا میاں، چچی جان، نسیم نادرہ سب کو حیرت ہے۔" "کیا تجھے بھی حیرت ہے۔"

"ہاں ابا جی مجھے بھی ہے۔ کیا نہیں ہونا چاہیے۔" ضرور ہونی چاہیے بیٹی تم نے اپنے باپ کو معاف کر دیا۔ اگر تو معاف کر دے گی تو مریم بھی معاف کر دے گی۔ میں اس سے کہہ سکوں گا۔ کہ زلیخا نے مجھے معاف کر دیا ہے زلیخا کے نام پر وہ جان دیتی تھی، پھر وہ میری خطا معاف کر دے گی بڑی خوشی سے۔ بیٹی جواب دے، میں تیرے منہ سے ہاں سننا چاہتا ہوں۔"

(۹)

زلیخا کے منہ سے "ہاں" کا لفظ تو نہیں نکلا۔ لیکن اس کے چہرے، بشرے اور انداز و اطوار سے امتیاز نے "ہاں" کا مطلب لیا۔

کچھ دیر تک خاموشی سی طاری رہی پھر امتیاز نے گفتگو کا سلسلہ شروع کرتے ہوئے کہا۔

لوگ کہتے ہیں۔ میں اچھا ہوں اور بظاہر ہوں بھی تندرست۔"

" وہ بیچ میں بول پڑی "تو کیا خدانخواستہ آپ تندرست نہیں ہیں؟"

امتیاز نے جواب دیا۔

کیا تو نہیں دیکھتی اب بھی میرے اوپر تھوڑے تھوڑے وقفہ سے دورے پڑتے ہیں۔

وہ بولی" لیکن ڈاکٹر صاحب تو کہتے ہیں۔ تشویش کی اب کوئی بات نہیں۔"

بے پروائی کے ساتھ امتیاز نے کہا۔

ممکن ہے کہ وہ ٹھیک کہتے ہوں ممکن ہے ان کا اندازہ غلط ہو"

بے کلی کے ساتھ زلیخا نے سوال کیا۔

آخر آپ اس طرح کی باتیں کیوں کرتے ہیں جن سے مایوسی ٹپکتی ہے۔"

اتنے دنوں کے بعد مجھے خوشی ملی ہے میں نے اپنے کھوئے ہوئے باپ کو پایا ہے میں ایسا محسوس کرنے لگی ہوں جیسے میری ماں مری نہیں، زندہ ہے، اب مجھے کوئی غم نہیں، فکر نہیں، پریشانی نہیں لیکن — یہ باتیں کر کے، ایسی باتیں کر کے آپ میری خوشی چھین لیتے ہیں، اباجی، آپ زندہ رہیں گے، میرے لئے زندہ رہیں گے۔ آپ کو زندہ رہنے پڑے گا۔"

یہ کہتے کہتے زلیخا کی آنکھیں آب گوں ہو گئیں۔

امتیاز نے رحم اور ترس کی ملی جلی نظروں سے اسے دیکھا اور کہنے لگا۔

اچھا اگر تو کہتی ہے، تو زندہ رہوں گا۔ ملک الموت آیا کہہ دوں گا، ابھی نہیں مرتا۔

"زلیخا کی اجازت نہیں ہے۔"

"اب تو خوش ہو نا!"

وہ واقعی خوش ہو گئی، آنسو خشک ہو گئے، نرم و نازک ہونٹوں پر تبسم رقص کرنے لگا۔

اس نے کہا۔

"سب ہی بیمار پڑتے ہیں، اور اچھے ہو جاتے ہیں۔ لیکن آپ کی طرح کوئی بھی مایوس نہیں ہوتا۔

ہاں بیٹی تو نے سچ کہا۔ میں تیری ہر بات، مانتا ہوں کیا ایک بات میری تو مان لے گی؟"

زلیخا سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ اس نے کہا۔

میں یہ مانتا ہوں کہ زندہ رہوں گا، تو یہ مان لے کہ سب کے ماں باپ ہمیشہ زندہ نہیں رہتے۔ یوں مانتی ہے؟"

جی تو نہیں چاہتا تھا۔ لیکن انکار بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کہنے لگی یہ تو سچ ہے لیکن ـــ

امتیاز نے آگے کچھ نہیں کہنے دیا

" لیکن دیکھ کچھ نہیں میں یہی کہلانا چاہتا تھا۔ اور اب مجلس برخاست تھک گیا ہوں، آرام کروں گا!"

٭

(۱۰)

امتیاز نے غلط نہیں کہا تھا۔ واقعی گو بظاہر میں اچھا ہو گیا تھا اور ڈاکٹر امید دلاتے رہتے تھے کہ بہت جلد تمام شکایتیں رفع ہو جائیں گی۔ لیکن کیفیت یہ تھی کہ برابر دورے پڑتے رہتے تھے اب تک وہ رخصت پر تھا۔ ملازمت پر نہیں جا سکا تھا۔ کمزوری محسوس کرتا رہتا تھا۔ اور کبھی کبھی باتیں کرتے کرتے کتاب پڑھتے پڑھتے حقہ پیتے پیتے بیہوش ہو جاتا تھا۔ اور یہ چیز اب اس طرح معمولات میں داخل ہو چکی تھی۔ کہ گھر والے اس کے عادی ہو گئے تھے اس میں اب کوئی ندرت نہیں رہ گئی تھی بیہوشی کا وقفہ بہت مختصر سے وقفہ کے لئے ہوتا تھا، ذرا دیر میں آنکھ کھل جاتی تھی اور بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا اور خود امتیاز بھی زیادہ سے زیادہ اپنی کمزوری کو چھپانے کی کوشش کرتا تھا۔ ایسا ظاہر کرتا تھا جیسے یہ بیہوشی غنودگی کا ایک جھونکا تھا جو آیا اور چلا گیا۔ لیکن دل ہی دل میں برابر محسوس کرتا رہتا تھا کہ اب چل چلاؤ کا وقت آ گیا ہے جب بھی اجل کا پیغام آ جائے۔

امتیاز کا عندیہ پا کر رابعہ نے شادی کی تیاریاں شروع کر دی تھیں۔ گو ان تیاریوں کا اعلان نہیں کیا تھا۔ نادرہ نے بھی اپنی طرف سے پوری رازداری برتی تھی۔ اور احراز، کلثوم، نسیم کسی کو بھی خبر نہیں ہونے دی تھی۔ کہ اندر ہی اندر کیا گل کھل رہے ہیں۔

کلثوم وغیرہ کو اندرون خانہ تیاریوں کا علم ہو یا نہ ہو، لیکن ارشاد اور زلیخا کو تھا اور یہ دونوں بہت خوش تھے، دونوں کے دل کی مراد پوری ہو رہی تھی۔ ارشاد اگر جان و دل سے زلیخا کا پرستار تھا تو وہ ہزار جان سے اسے چاہتی تھی۔ بچپن کا رشتہ ویسے بھی بڑا گہرا اور مضبوط ہوتا ہے اور اگر اس میں محبت شامل ہو جائے تو پھر یہ رشتہ پہاڑ سے بھی زیادہ مستحکم ہو جاتا ہے یہاں یہی کیفیت تھی۔

ایک روز رابعہ امتیاز کے کمرے میں بیٹھی اس سے شادی کی تفصیلات پر کچھ ضروری باتیں کر رہی تھی۔ نادرہ کلثوم اور نسیم کے کام میں دلچسپی لے رہی تھی۔ زلیخا اپنے کمرے میں بیٹھی سوئیٹر بن رہی تھی کہ کہ ارشاد صاحب بے سان و گمان وہم سے آن موجود ہوئے۔ اسے یوں دفعتہً اپنے سامنے کھڑا دیکھ کر گھبرا گئی۔ اس نے اُون ایک طرف پھینکا اور سہمگیں لہجہ میں کہا۔

توبہ ہے — آپ نے تو ڈرا دیا مجھے۔

وہ مسکراتا ہوا گویا ہوا۔

کیا میں شیر ہوں جو تم ڈر گئیں ؟

وہ ایک ادائے خاص کے ساتھ گویا ہوئی۔

" آخر آپ کو اس وقت یہاں تشریف لانے کی کیا ضرورت تھی ؟"

نہ ہوتی تو آتے کیوں ؟

" چلے جایئے —"

" کیوں ؟ اس حکم نادری کا کوئی سبب بھی تو ہو گا۔

خالہ اماں آتی ہی ہوں گی ؟"

" وہ نہیں آئیں گی ابھی کافی دیر تک ان کی تشریف آوری کا اندیشہ نہیں ہے۔ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ آیا ہوں، نہایت اطمینان کے ساتھ خالو ابا کے ساتھ باتیں کر رہی ہیں اور غالباً ہم دونوں کا مستقبل زیر بحث ہے۔

"ممکن ہے نادرہ آجائے!"

"وہ کیا کرے گی آکر"؟

"آتی ہی رہتی ہے کام دام کے سلسلے میں"۔

"دروازے کے پاس تو کھڑا ہوں، اسے آتا دیکھ کر فوراً نو دو گیارہ ہو جاؤں گا۔"

"شاید نسیم"۔ —

"شاید نسیم کا مطلب کیا؟"

شاید، نسیم یا کلثوم، چچی یا اعزاز چچا ادھر تشریف لے آئیں"۔

"اور ان میں سے کوئی آ گیا تو آتے ہی گولی مار دے گا ہمیں؟"

گولی کیوں مارنے لگا، لیکن مفت کی بدنامی تو ہوگی۔ انگلیاں تو اٹھیں گی، سب لوگ کہیں گے، بے غیرت ہے یہ لڑکی؟"

اور یہ سب لوگ اس وقت کیوں خموش تھے، جب صفدر یہاں تھا، اور نسیم سے آکر ملتا رہتا تھا۔ بلکہ نسیم اس سے برابر ملتی رہتی تھی"۔

"تو کیا آپ نے مجھے نسیم سمجھا ہے؟"

زلیخا یہ باتیں چھوڑو، ایک سوال کا جواب دو"۔

کیا سوال ہے آپ کا، کہہ ڈالیے جلدی سے

اب تمہارے مزاج کیوں نہیں ملتے؟"

"زیر لب تبسم کے ساتھ) بڑے آدمیوں کے مزاج آسانی سے کب ملتے ہیں"۔

تو کیا میں چھوٹا آدمی ہوں؟ بڑا آدمی نہیں ہوں!"

"اپنے منہ میاں مٹھو سے کیا فائدہ؟ ہوں گے، میں کیا جانوں؟"

"اچھا ایک بات تو بتاؤ؟"

"ابھی کوئی بات باقی ہے؟ کہیے۔

"کیا تم خوش نہیں ہو؟"

"اس کا مطلب؟"

"بہت جلد وہ دن آنے والا ہے، کہ ہم دونوں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ایک ہو جائیں گے۔ کیا میری طرح خوشی اور مسرت کے ساتھ تم بھی اس مبارک دن کا انتظار کر رہی ہو۔؟"

زلیخا نے کوئی جواب نہیں دیا! دن اٹھا کر پھر سے سویٹر بننا شروع کر دیا۔ ارشاد ایک قدم اور اندر آگیا۔ اس نے کہا۔

"زلیخا میں تمہارا جواب چاہتا ہوں؟"

وہ اس طرح سویٹر بنتے بنتے بولی۔

"جو لوگ خموشی کی زبان نہیں سمجھ سکتے، وہ کچھ بھی نہیں سمجھ سکتے!"

ایک عجیب تاثر اور جذبہ کے عالم میں ارشاد نے کہا۔

گویا — یعنی تمہارا مطلب۔

زلیخا ہنس پڑی، اس نے شوخ نظروں سے ارشاد کو دیکھا اور پھر تبسم کی بجلیاں گراتی ہوئی بولی۔

"گویا۔ یعنی تمہارا مطلب — یعنی میرا مطلب — جی ہاں۔ بس اب تشریف لے جایئے، خالہ جان آتی ہوں گی اور پھر گویا اور یعنی سب دھرے رہ جائیں گے!"

ارشاد مسکراتا ہوا، الٹے پاؤں واپس چلا گیا۔

(۱۱)

شادی کی تاریخ مقرر ہو چکی!

یہ خوشی کا موقع تھا ارشاد کے لئے بھی، زلیخا کے لئے بھی دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ ارشاد بھی خوش تھا اور زلیخا بھی لیکن زلیخا کے دل میں ایک کانٹا بھی کھٹک رہا تھا اور وہ کانٹا تھا۔ اعجاز کی یاد۔

مریم مر چکی تھی لیکن اعجاز تو زندہ تھا۔ اسے تو اس موقع پر موجود ہونا چاہیے، بہن کی شادی ہو اور بھائی موجود نہ ہو، یہ کتنے ستم کی بات ہے۔ کتنا بڑا ظلم؟ اور نہ جانے اور کہاں ہے؟ کس حالت میں ہے؟ کیا کر رہا ہے لیکن وہ کہیں بھی ہو، کسی حالت میں بھی ہو۔ کچھ بھی کر رہا ہو، اسے آنا چاہیے، اسے اس جشن مسرت میں شریک ہونا چاہیئے۔

لیکن کیونکر، کس طرح؟

یہ سوچتے سوچتے یک بیک اس کے دل نے ایک طرح کی طمانیت سی محسوس کی۔ امتیاز کے بدلے ہوئے طرز عمل نے اس کی محبت اور شفقت نے اس کے چاؤ اور پیار کے برتاؤ نے زلیخا کی بے زبانی ختم کر دی تھی۔ اس کے حوصلہ بڑھا دیا تھا۔ اب وہ باپ کے سامنے دل کی بات کہہ سکتی تھی۔ اس سے منوانے کے انداز میں ضد کر سکتی تھی۔ اس سے مطالبہ کر سکتی تھی اور اسے تسلیم کرا سکتی تھی۔

کیوں نہ امتیاز سے اعجاز کو بلانے کا مطالبہ کرے۔

دل میں ایک طرح کی خلش سی پیدا ہوئی، سوال پیدا ہوا۔

"کیا اباجی یہ بات مان لیں گے؟"

خود اعتمادی نے اکسایا اور ابھارا اور وہ نتائج سے بے پروا اٹھی اور تیر کی طرح سیدھی باپ کے کمرے میں پہنچ گئی۔

امتیاز کی طبیعت ادھر کئی دن سے پھر کچھ خراب سی تھی، ایسی تو نہیں کہ وہ صاحب فراموش ہو جاتا۔ یا حکیموں اور ڈاکٹروں کا تانتا لگ جاتا لیکن تھوڑے تھوڑے وقفہ سے کئی دورے پڑ چکے تھے وہ ہار ماننا نہیں جانتا تھا۔ ہر دورے کے بعد وہ لوگوں کے سامنے اس طرح اپنے آپ کو بے پرواہ ظاہر کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ گویا نہ اسے کوئی سنگین قسم کا مرض ہے، نہ ان دوروں سے پریشان ہونے کی کوئی بات ہے، لیکن چہرے کی زردی، اعصاب کی کمزوری اور عام جسمانی نقاہت اس چوری کا پردہ فاش کر رہی تھی۔ درحقیقت وہ اپنے بارے میں طے کر چکا تھا کہ کسی وقت بھی پیام مرگ آ سکتا ہے، اسی لئے زلیخا کی شادی میں وہ اتنی زیادہ جلدی کر رہا تھا۔ اس فرض سے وہ اپنی زندگی ہی میں سبک دوش ہو جانا چاہتا تھا۔ اس وقت ایک آرام کرسی پر دراز عالم خیال میں بیٹھا نہ جانے کیا سوچ رہا تھا کہ زلیخا کو آتا دیکھ کر وہ چونک پڑا اس نے اضطراب کے ساتھ پوچھا۔

"کیا بات ہے بیٹی تو اس وقت مجھے غمزدہ اور دلگیر کیوں نظر آ رہی ہے؟"

زلیخا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ لیکن اس کی آنکھیں پرنم ہو گئیں امتیاز نے سوچا کہیں ایسا تو نہیں ہے زلیخا اس رشتہ کو پسند نہ کرتی ہو؟ اس نے کہا

میں نے سوچ سمجھ کر تیری بہتری، راحت، آسائش اور بہبود کے تمام پہلوؤں کو پیش نظر رکھ کر ارشاد سے تجھے بیاہنے کا فیصلہ کیا ہے۔ لیکن اگر تجھے یہ رشتہ منظور نہ ہو تو ابھی کچھ نہیں گیا ہے۔ ذمہ داری میں اپنے سر لوں

گا اور صاف انکار کر دوں گا۔"

ان الفاظ نے زلیخا کے دل میں ہل چل مچادی وہ قہار و جبار باپ جو ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتا تھا۔ جس کے فیصلے کی کوئی اپیل نہیں تھی جس کا ہر قول گھر میں حرف آخر کا درجہ رکھتا تھا۔ اب تلافیٔ مافات پر یہاں تک اتر آیا تھا کہ بیٹی کے استمزاج کئے بغیر اس شادی تک کرنا نہیں چاہتا اس نے محبت اور ممنونیت کی نظروں سے باپ کو دیکھا۔ پھر بولی۔

ابا جی، میں نے تو ماں کی گود میں صرف ایک ہی بات سیکھی ہے — باپ کی اطاعت، جب تک وہ زندہ رہیں مجھے اور بھیا کو صرف یہی ایک نصیحت کرتی رہیں، پھر آپ کے کسی فیصلہ کے خلاف سوچنا میرے لئے ممکن ہی کب ہے —

امتیاز نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

" تو نے مریم کا ذکر کر کے پھر میرے سینہ پر گھونسہ مار دیا۔"

اور پھر گفتگو کا موضوع بدلتے ہوئے کہا۔

" اگر یہ بات نہیں تو پھر میں تجھے، غمزدہ، افسردہ اور دلگیر کیوں دیکھ رہا ہوں؟"

دل کی بات زبان پہ لانے کا بہترین موقعہ مل گیا۔ کہنے لگی۔

" جانے کیا بات ہے، بہت دنوں سے بھیا مجھے بہت یاد آرہے ہیں —"

امتیاز نے غور سے زلیخا کو دیکھا، پھر کہا۔

امتیاز نے غور سے زلیخا کو دیکھا، پھر کہا۔

" تجھے اعجاز یاد آرہا ہے؟"

" جی — بہت زیادہ

تیرا وہ کون ہے؟

" بھائی ہیں —"

" اور میرا؟ میرا کون ہے؟"

آپ کے تو وہ بیٹے ہیں ؟"

"بہن بھائی سے زیادہ محبت کرتی ہے یا باپ بیٹے سے ؟"

ابا جی یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے، والدین کی محبت کو دنیا میں کون پہنچ سکتا ہے۔ ؟"

"پھر کیا تیرا خیال ہے !" وہ صرف تجھی کو یاد آتا ہے۔

(خوش ہو کر) آپ کو بھی ضرور یاد آتے ہوں گے !"

ہاں مجھے بھی یاد آتا ہے۔ آخر وہ میرا بیٹا ہے، صرف میرا ہی نہیں مریم کا بھی، صرف میرا اور مریم کا بیٹا ہی نہیں۔ تیرا بھائی بھی ہے اتنی ساری نسبتوں کے بعد میں اُسے یاد کرنے اسے چاہنے پر مجبور ہوں ۔"

"بہت زیادہ خوش ہو کر) تو پھر انہیں تلاش کیوں نہیں کرتے انہیں بلا کیوں نہیں لیتے ؟"

"نہیں بیٹی یہ نہیں ہو سکتا !"

"(حیرت سے باپ کو دیکھتے ہوئے) کیوں ابا جی ؟"

اس لئے کہ وہ سرکش ہے باغی ہے اور امتیاز کی گردن کسی کے سامنے نہیں جھک سکتی بیٹے کے سامنے کیا جھکے گی امتیاز کسی کی خوشامد نہیں کر سکتا، بیٹے کی کیا کرے گا ؟

"لیکن ابا جی —"

ہاں بیٹی میں جانتا ہوں، تو چاہتی ہے کہ وہ آ جائے، اس گھر کے دروازے اس کے بند نہیں ہیں، کبھی بھی بند نہیں ہوں گے، لیکن امتیاز اسے پکار نہیں سکتا۔ بلا نہیں سکتا۔ اس کا تعاقب نہیں کر سکتا۔

"لیکن ابا جی —"

میں تیرے جذبات کو سمجھتا ہوں، تو بھی میرے جذبات کو سمجھنے کی کوشش کر، تو چاہتی ہے کہ اس مسرت بخش موقع پر اعجاز بھی موجود ہو اس خوشی میں وہ حصہ لے وہ بھی اپنی بہن کو دلہن بنتا دیکھے تیرا یہ چاہنا بالکل قدرتی اور فطرتی ہے۔ لیکن کیا تو یہ بھی جانتی ہے میں کیا چاہتا ہوں۔ ؟"

"بتا دیجئے ابا جی —"

"وہ میرا اکلوتا بیٹا ہے، آج وہ آجائے تو مجھے نئی زندگی مل جائے میں کتنے اطمینان سے مروں، زندگی کے چند دن باقی ہیں وہ کتنے سکھ سے کٹیں۔ وہ میرا عصائے پیری بن سکتا ہے وہ میری تیمارداری کر سکتا ہے تیرے سسرال جانے کے بعد وہ ہر طرح میری خبرگیری کے فرائض انجام دے سکتا ہے۔ میں جانتا ہوں تو مجھ سے کتنی محبت کرتی ہے لیکن میری بچی اتنی محبت کرنے کے بعد بھی تو اعجاز کا بدل نہیں بن سکتی۔"

"یہی تو میں بھی کہتی ہوں۔"

"تو بہر حال عورت ذات ہے، تو وہ دشواریاں نہیں جھیل سکتی، جو اعجاز جھیل سکتا ہے میرے لئے۔"

"بے شک ابا جی۔"

وہ ہوتا تو میں ساری ذمہ داری سے سبکدوش ہو جاتا اس بیماری، اس کمزوری، اس نقاہت میں بھی بہت سے کام مجھی کو کرنا پڑتے ہیں وہ میرا ہاتھ بٹاتا، وہ میرا بوجھ اٹھا لیتا۔ وہ مجھے ہر ذمہ داری سے آزاد کر دیتا تو یہاں رہتی یا سسرال میں مجھے کوئی فکر نہ ہوتی اس کے نہ ہونے سے مجھے کتنا دکھ ہے۔ کتنی تکلیف ہے! اسے صرف میرا ہی دل جانتا ہے۔ کوئی نہیں جانتا کوئی نہیں جان سکتا۔

"ابا جی، اسی لئے تو میں نے کہا تھا کہ ——"

"سن لے بیٹی، باپ کی پوری بات سن لے۔"

"سن رہی ہوں ابا جی۔"

لیکن وہ مجھ سے روٹھ کر چلا گیا۔ نہیں میں نے غلط کہا، وہ مجھ سے نفرت کرتا ہے۔ اس لئے چلا گیا۔ بیٹی جو مجھ سے نفرت کرتا ہو۔ اس سے محبت کی بھیک کم از کم مجھ سے مانگی جا سکتی۔ جو مجھ سے نفرت کرتا ہو میں اس کی طرف محبت اور دوستی کا ہاتھ نہیں بڑھا سکتا۔

مگر ابا جی وہ آپ سے کس طرح نفرت کر سکتے ہیں؟ کہیں بیٹا بھی باپ

سے نفرت کر سکتا ہے ؟"

ہاں کر سکتا ہے ، اعجاز کو دیکھ لو "

" میں نہیں مانتی ابا جی "

" تیرے نہ ماننے سے کیا ہوتا ہے ، تو اگر یہ کہہ دے کہ اس وقت دن نہیں رات ہے تو کیا رات ہو جائے گی !"

" ابا جی وہ ہرگز آپ سے نفرت نہیں کرتے !"

جھوٹ نہ بول بیٹی کرتا ہے ، بہت زیادہ نفرت ہے اسے اپنے گناہ گار باپ سے ؟"

" یہ کیسے ہو سکتا ہے "

یہ کوئی خلافِ عقل بات نہیں ، کئی دفعہ میرے ذہن میں یہ بات آ چکی ہے کہ مجھ سے اس کی نفرت بیجا نہیں "

" یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں ابا جی ؟"

ہاں بیٹی میں غلط نہیں کہتا ، وہ مجھ سے اس لئے نفرت کرتا ہے کہ میں نے اس کی ماں کو دکھ دیا ، میں نے اس کی قدر نہ کی ، میں نے اس کی بہن کو محبت نہیں دی اور خود اس سے شفقت و محبت کا کبھی برتاؤ نہیں کیا - اسے اپنے آپ سے محبت ہے اپنی بہن سے محبت ہے اپنی ماں سے محبت ہے اور جسے وہ ان تینوں کا دشمن سمجھتا ہو - اس سے نفرت ہی کر سکتا ہے چنانچہ کرتا ہے !"

" لیکن بھیا بڑے اچھے ہیں ابا جی !"

" اسے میں تسلیم کرتا ہوں "

وہ غیرت مند ہے ، خود دار ہے ، اس میں خود اعتمادی ہے جس شخص کے یہ جوہر ہوں ، اس کے اچھے آدمی ہونے میں کیا کلام ہو سکتا ہے اگر وہ بے غیرت ہوتا تو باپ کے ٹکڑوں پر پڑا رہتا . اگر اس میں خودداری نہ ہوتی تو ماں کی توہین اور بہن کی درگت پر اسے غصہ نہ آتا اگر اس میں خود اعتمادی کا جوہر نہ ہوتا تو خالی جیب ہر طرح کے وسائل و ذرائع سے تہی دست

دنیا کے سمندر میں بے خوف و خطر نہ کود پڑتا۔

" ابا جی ۔"

یہاں سے جانے کے بعد اسے پھولوں کی سیج تیار نہیں ملی ہوگی۔ کانٹوں سے بار بار دامن الجھا ہوگا۔ طرح طرح ناقابل تصور تکلیفوں سے سابقہ پڑا ہوگا۔ لیکن فاقے کرنا پڑے ہوں۔ ممکن ہے۔ ٹھوکریں کھانا پڑی ہوں، ہو سکتا ہے کہیں مزدوری کر کے پیٹ پالنا پڑا ہو لیکن۔ اس نے پلٹ کر اس طرف نہیں دیکھا۔ اس کے بڑھتے ہوئے قدم پیچھے نہیں ہٹے، اس کی خود اعتمادی کو زمانہ شکست نہ دے سکا وہ جہاں کہیں بھی ہے جس حالت میں بھی ہے جو کچھ بھی کر رہا ہے بہر حال دنیا کے ان میں چند لوگوں میں ہے جو اپنی قسمت کی تشکیل خود کرتے ہیں۔ اپنا مستقبل خود بناتے ہیں۔ دوسروں کی محتاجی نہیں کرتے دوسروں کے سامنے — حتیٰ کہ باپ کے سامنے بھی ہاتھ نہیں پھیلاتے۔

" لیکن ابا جی ۔"

اگر وہ یہاں رہتا تو شاید بی اے کر چکا ہوتا میرا خیال ہے اسے یہاں سے گئے ہوئے چار سال سے کچھ زیادہ ہی کی مدت گزر چکی ہے اس نے بڑے امتیاز کے ساتھ میٹرک کا امتحان پاس کیا تھا۔ میں اسے کالج بھیجتا اگر وہ چاہتا تو انگلینڈ بھی بھیج دیتا۔ میں اسے شہزادوں کی طرح رکھتا جس طرح تجھ سے پیار کرتا ہوں اسی طرح اسے بھی چاہتا۔ تو جانتی ہے کہ میں بدل چکا ہوں۔ لیکن وہ نہیں جانتا اور اسی لئے ہر طرح کی سہولتوں آسائشوں اور فراغتوں کو چھوڑ کر اس نے دکھ اور تکلیف کی زندگی بے جھجک اختیار کر لی — زلیخا۔"

" جی ابا جی —"

" مجھے اس پر فخر ہے میں اس سے بے پناہ محبت کرتا ہوں۔"

" ابا جی میرے بھیا ایسے ہی ہیں کہ ان پر فخر کیا جائے۔ ان سے بے پناہ محبت کی جائے!"

"سو وہ میں کرتا ہوں۔"

"پھر آپ ان سے کیوں خفا ہیں؟ انہیں بلا کیوں لیتے۔"

"بس بیٹی، یہی نہیں ہو سکتا۔ وہ میرا بیٹا ہو کر اگر اتنا غیرت مند اور خوددار ہو سکتا ہے، تو میں اس کا باپ ہو کر۔ کیوں نہیں ہو سکتا؟"

"لیکن ابا جی ـــ"

"ہاں بیٹی کہہ، کیا کہنا چاہتی ہے؟"

بڑے چھوٹوں کی خطا معاف کر دیا کرتے ہیں، بزرگوں کا قول ہے از خورداں خطا و از بزرگاں عطا۔ آپ بھی کیوں نہیں انہیں معاف کر دیتے۔

"معاف کر دیا بیٹی!"

"(بے انتہا خوش ہو کر) معاف کر دیا؟ ابا جی آپ نے میرے بھیا کو معاف کر دیا۔؟"

"ہاں ـ میں اس سے نفرت نہیں کرتا!"

"آپ ان سے نفرت نہیں کرتے؟"

"بالکل نہیں ـ میں اس سے محبت کرتا ہوں۔"

"آپ ان سے محبت کرتے ہیں؟"

"ہاں اتنی ہی جتنی تجھ سے کرتا ہوں۔"

"ابا جی اگر آپ انہیں مجھ سے زیادہ چاہیں تو مجھے خوشی ہو گی، شکایت نہ ہو گی؟"

"لیکن اپنے دل کو کیا کروں؟" پھر کچھ سوچتا ہوا بولا۔

میری دو آنکھیں ہیں "ایک تو ایک وہ!"

"ابا جی۔"

"اس لئے میں نے اسے کوئی سزا بھی نہیں دی۔"

"لیکن وہ گھر سے نکل گئے۔"

ہاں لیکن وہ خود نکلا۔ جب وہ نکلنے لگا تو میں نے ایک دھکا دے کر دو قدم اور آگے بڑھا دیا، ورنہ اگر میں سزا دیتا۔ کچھ معلوم ہے میری سزا کیا ہوتی۔

"میں نہیں جانتی ابا جی۔"

مجھ سے سن لے، میں اسے عاق کر دیتا جائداد سے محروم کر دیتا لیکن میں نے جو وصیت نامہ لکھا ہے اس کی رو سے اسے پورا حصہ دیا ہے ہر چیز میں اس کی ذرا بھی حق تلفی نہیں ہونے دی ہے اور اب تجھ سے کہتا ہوں کہ اگر میرے بعد اگر وہ آئے تو خبردار اسے ذرا بھی ملامت نہ کرنا، کوئی تلخ اور ناگوار بات نہ کہنا، جب مجھے اس سے کوئی شکایت نہیں تو اور کسی کو ملامت کرنے کا کیا حق ہے؛

وہ جب آئے اگر آئے تو اس کا پورا حصہ اسے سونپ دینا، وصیت نامہ کی رو سے میں نے سب کچھ تیری تحویل میں دیا ہے۔ تو ہی مختار ہے اور اگر میرے مرنے کے بعد بھی نہ آئے تو پھر تجھے اختیار ہے جو چاہنا کرنا۔

لیکن ابا جی اگر آپ انہیں بلا لیں گے۔

یہ کیسے ہو سکتا ہے بیٹی؟ تو اب تک اپنے باپ کو نہیں سمجھ سکی۔ تو امتیاز سے یہ توقع کرتی ہے کہ اپنی آن چھوڑ دے، اپنی شان چھوڑ دے اپنی شان سے دستبردار ہو جائے، اپنی خودداری کو خود اپنے پاؤں سے روند ڈالے؛ جب تک وہ پاگل نہیں ہو جاتا۔ اس کے بارے میں کبھی ایسا خیال نہ کرنا!"

اور پھر دفعتاً اس نے کہا۔

"بیٹی میرا دل گھبرا رہا ہے، ذرا ٹھنڈا پانی تو مجھے پلا!"

زلیخا تیزی سے اٹھی اور پانی۔ لینے کے لئے چلی گئی۔ پانی لے کر آئی تو امتیاز کو پانی پینے کا ہوش نہ تھا۔ وہ بیہوش ہو چکا تھا۔

اس نے جلدی سے الماری کھولی اور ایک دوا نکال اُسے سنگھائی اور پنکھا جھلنے لگی، کوئی دس منٹ کے بعد اسے ہوش آگیا۔ لیکن اتنا کمزور ہو چکا تھا کہ منہ سے بات نکلنا مشکل تھی۔

(۱۲)

امتیاز جب ہوش میں آگیا تو تھوڑی دیر زلیخا باپ کے پاس بیٹھی رہی اس کے بعد جب دیکھا کہ اس نے کروٹ بدل لی ہے اور سونا یا آرام کرنا چاہتا ہے تو چپ چاپ اپنے کمرے میں چلی آئی اور حالات کا جائزہ لینے لگی۔

امتیاز کی اس گفتگو سے اس نے اندازہ کر لیا تھا۔ ادھر کی دنیا اُدھر ہو جائے۔ مگر وہ کسی قیمت پر بھی اس بات کے لئے آمادہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کہ اعجاز کو بلا لے، لیکن اسے یہ امید تھی کہ اگر وہ خود آجائے تو ساری غلط فہمی اور خفگی آن کی آن میں دور ہو جائے گی۔ کیونکہ آج کی باتوں سے اس نے یہ اندازہ لگا لیا تھا۔ کہ اعجاز کے اقدام سے امتیاز کو کتنا ہی صدمہ پہنچا ہو لیکن وہ اس سے بے پناہ محبت کرتا ہے، جیسے ہی نظر سے نظر ملی۔ ساری تلخیاں ختم ہو جائیں گی اور اعجاز کی سلامت روی اور سعادت مندی سے بھی اسے توقع تھی کہ باپ کا سامنا ہونے کے بعد وہ سر جھکا دینے کے سوا کچھ نہ کر سکے گا۔

لیکن سوال یہ تھا کہ وہ آئے کس طرح ؟

اگر معلوم ہوتا کہ وہ فلاں شہر میں ہے فلاں مقام پر ہے تو جس طرح بھی بنتا وہ اسے تلاش کرتی اور ڈھونڈ کر لے آتی اور باپ کے قدموں پر گرا دیتی لیکن اس یوسف گم گشتہ کا سراغ لگانا بھی تو آسان نہیں تھا۔

وہ اسی فکر میں بیٹھی تھی کہ ارشاد کسی کام سے اس طرف ہوتا ہوا گزرا۔ وہ اُٹھ کر دروازے تک آگئی اور ارشاد سے مخاطب ہوتی ہوئی کہنے لگی۔

"کیا میرا ایک کام کر دیں گے؟"

ارشاد صاحب نہال ہو گئے، کہنے لگے۔

"صرف ایک کام؟ کیوں میرے جذبۂ وفا کی توہین کرتی ہو، کم از کم ہزار کام تو ہوں۔"

وہ ذرا چڑتی ہوئی بولی۔

"جائیے نہیں، کہتی کچھ؟"

ارشاد نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ تو وہ بہت زیادہ سنجیدہ، افسردہ اور دل گرفتہ نظر آئی، وہ بھی سنجیدہ ہو گیا، اس نے کہا۔

معلوم ہوتا ہے کوئی خاص بات ہے۔ اچھا اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں، کہو۔

وہ بولی جس طرح بھی ہو سکے، بھیا کا پتہ چلائیے۔

"بھیا کا پتہ چلاؤں؟ یعنی اعجاز کا؟"

"ہاں — کیا آپ کا جی نہیں چاہتا کہ ہماری خوشی میں ان کا حصہ بھی ہو۔ کیا اس بات پر آپ کا دل نہیں کڑھتا۔ کہ ہم خوش ہوں۔ اور وہ پردیس میں کسی انجانی جگہ ٹھوکریں کھا رہے ہوں؟ وہ صرف میرے ہی بھائی تو نہیں ہیں آپ کے بھی تو ہیں۔؟"

ان باتوں سے ارشاد بہت متاثر ہوا اس نے کہا۔

"میں تمہارے اس جذبہ کی قدر کرتا ہوں۔"

"وہ چمک کر بولی۔" قدر دانی کا شکریہ، لیکن کچھ کر کے دکھائیے۔ تب جائیں —

ارشاد نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"اتنے بڑے ملک میں ایک گمنام شخص کا تلاش کرنا کچھ آسان سمجھ رکھا ہے تم نے؟"

وہ طنز کا تیر چلاتی ہوئی بولی ۔

آسان سمجھا ہوتا تو خود ہی یہ کام کر لیتی، آپ کو کیوں زحمت دیتی ۔

ارشاد کچھ جھینپ سا گیا، کہنے لگا ۔

ایک ترکیب سمجھ میں آتی ہے ۔ اگر کارگر ہو سکتی ہے تو صرف وہی ورنہ ۔

اضطراب کی تصویر بن کر زلیخا نے پوچھا ۔

وہ ترکیب بتایئے، دوسری باتیں پھر دیکھی جائیں گی !"

" ارشاد نے کہا:" وہ ترکیب یہ ہے کہ اخبارات میں اپنی طرف سے ایک اشتہار دیتا ہوں، اگر اعجاز کی نظر پڑ گئی تو انشاءاللہ بھاگا بھاگا آئے گا ۔"

لیکن ابا جی جو دیکھ لیں گے ؟ پھر تو آپ کی شامت آجائے گی ۔

ان سے چھپ کر یہ کام کرنا ہے !"

ہمارے گھر میں صرف "صداقت" آتا ہے، اس میں نہیں دیں گے اشتہار باقی اخبارات میں دیں گے ۔

" وہ خوش ہو گئی ۔" اچھا یہی سہی لیکن جلد !"

زلزلہ

(۱)

امتیاز کی حالت روز بروز مایوس کن ہوتی جاتی تھی۔

بیماری کا پہلا حملہ وہ جھیل لے گیا۔ اس کے بعد بارہا دورے پڑے لیکن اس کی خود اعتمادی نے ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ اس نے ہار نہیں مانی اب گزشتہ چند ہفتوں سے مسلسل دورے پڑ رہے تھے۔ اور وہ بستر سے لگ گیا تھا۔ گھر والے بھی نا امید ہو چکے تھے اور ڈاکٹروں نے بھی جواب دے دیا تھا۔ انہوں نے صاف صاف کہہ دیا تھا۔ جڑ اکھڑ چکی ہے کسی دن ہوا کا ایک معمولی جھونکا بھی اس تناور اور چھتنار درخت کو زمین پر گرا دے گا۔ جہاں تک امتیاز کا تعلق تھا۔ وہ تو ایک عرصہ سے موت کے لئے چشم براہ تھا۔ اسے یقین ہو گیا تھا۔ کہ اب وہ نہیں بچ سکے گا لیکن کسی طرح دہشت یا سراسیمگی موت کے تصور سے نہیں تھی۔ وہ ہنسی خوشی مرنے کے لئے تیار تھا۔

ایک روز اس نے رابعہ کو بلایا اور پوچھا۔

" ارشاد اور زلیخا کی شادی کی تاریخ تو مقرر ہو چکی ہے اور دن بدن وہ تاریخ بھی آتی جا رہی ہے۔ میرے خیال میں اب مشکل سے آٹھ دس دن رہ گئے ہیں، سوال یہ ہے کہ تم نے تیاریاں بھی مکمل کر لیں۔ اچھی طرح سے ؟

رابعہ خود کئی دن سے اسی کشمکش و پیچ میں تھی۔

بے شک شادی کی تاریخ آتی جا رہی تھی۔ اور خود اس کی بھی دلی خواہش تھی۔ کہ یہ تقریب بڑی خوبی کے ساتھ جلد از جلد تمام کو پہنچ جائے اسے اندیشہ تھا۔ کہ اگر خدانخواستہ شادی سے پہلے بھائی صاحب چل بسے تو احراز میاں راستہ کا پتھر بن جائیں گے اور ہرگز یہ رشتہ نہیں ہونے دیں گے لیکن ایک مصیبت یہ تھی۔ کہ کلثوم اور نسیم وغیرہ نے علی الاعلان اور احراز نے دبے دبے لفظوں میں طنز و تعریض کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ کہ واہ بھئی، یہ بھی خوب رہی باپ بستر مرگ پر دراز ہے اور لڑکی کو بیاہنے کے سامان ہو رہے ہیں۔ اتنا نہیں ہو سکتا کہ ذرا اس کی صحت کا انتظار کر لیں، ان طنز و تعریض کی باتوں سے اس کا ارادہ ڈانواں ڈول ہو جاتا تھا۔ اور سوچنے لگتی تھی، بہتر یہی ہے کہ کچھ روز کے لئے یہ تقریب ملتوی کر دی جائے۔ لیکن اپنے میں اتنی بھی ہمت نہ تھی۔ کہ کھل کر یہ بات امتیاز کو کہہ سکے، کیوں کہ وہ بضد تھا کہ اس تقریب کو تاریخ مقررہ پر بہر حال انجام پانا چاہیے۔ لیکن آج جب خود امتیاز نے یہ سوال اُٹھایا تو اسے آغاز گفتگو کا بڑا اچھا موقع مل گیا۔ اس نے کہا۔

بھائی صاحب میرا جہاں تک تعلق ہے۔ میں تو چاہتی ہوں۔ کل کا ہوتا، آج یہ رشتہ ہو جائے، لیکن —

امتیاز نے کڑے تیوروں سے رابعہ کو دیکھا اور سوال کیا۔

"لیکن کے بعد کیا کہنا چاہتی ہو تم؟"

" وہ بولی " کچھ نہیں میرا مطلب یہ تھا کہ آپ کی صحت تک اگر یہ تقریب ملتوی ہو جائے تو کیا حرج ہے؟"

امتیاز سے اُٹھا تو نہیں جاتا تھا۔ لیکن ہمت کر کے وہ گاؤ تکیہ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اس نے کہا۔

یہ کیوں نہیں کہتیں کہ تم میری موت کی منتظر ہو۔ تمہاری خواہش ہے کہ میں مر جاؤں، تب یہ تقریب انجام پائے تاکہ یہ آخری مسرت اپنی آنکھوں

سے نہ دیکھ سکوں۔

رابعہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

بھائی صاحب کیا واقعی میرے بارے میں آپ کا یہی خیال ہے

امتیاز نے اس تیکھے لہجہ میں جواب دیا۔

" اگر یہ بات نہیں ہے تو پھر پرلے درجے کی بیوقوف ہو تم ؟"

" وہ بولی بھائی صاحب اس میں بیوقوفی کی کیا بات ہے ؟"

امتیاز نے تیوری چڑھا کر جواب دیا۔

اس سے بڑھ کر بے وقوفی اور کیا ہو گی کہ تم میری صحت کی منتظر ہو خدا کی بندی، میں اب نہیں اچھا ہو سکتا، کسی طرح بھی۔

وہ کانپ کر رہ گئی اور کہنے لگی۔

" خدا کے لئے بھائی صاحب ایسا نہ کہیے آپ ضرور تندرست ہو جائیں گے ایسی بیماری ہی کون سی ہے ؟"

" وہ بولا۔" نہ ہو گی، یہ بھی مان لیتا ہوں کہ تندرست ہو جاؤں گا مگر سوال یہ ہے اس تقریب کے ملتوی کر دینے کا خیال تمہارے دل میں کیسے آیا ؟"

وہ کہنے لگی" بھائی صاحب میرے لئے تو آپ کی ہر بات فرمان کی حیثیت رکھتی ہے۔" کیونکر ممکن ہے کہ آپ کچھ کہیں اور میں اسے ٹال جاؤں ——

پھر یہ کیا سوجی تھی۔

گھر میں سب لوگ یہی کہہ رہے ہیں ؟"

مثلاً کون لوگ ؟ ذرا میں بھی تو ان کا نام نامی سن لوں ؟" کلثوم، نسیم احراز میاں، کون ہے جو اس تقریب کا ملتوی ہونا نہیں چاہتا میں تو نکو بن کر رہ گئی ہوں، بھائی صاحب ایسے ایسے طعنے دیتے ہیں، یہ لوگ کہ کلیجہ منہ کو آجاتا ہے ؟

" طعنے دیتے ہیں ؟"

" جی — بڑے دل شکن ہیں اور ناقابل برداشت قسم کے۔

"کیا کہتے ہیں ؟"

اب چھوڑ دیئے یہ ذکر۔ آپ کی جو مرضی ہوگی، وہی کیا جائے گا

گڑے مردے اکھاڑنے سے حاصل ؟

نہیں میں سننا چاہتا ہوں، تمہیں بتانا پڑے گا، ورنہ مجھے صدمہ ہوگا۔

بھائی صاحب میں ان باتوں کو پسند نہیں کرتی !"

یہ تم اس بھائی سے کہہ رہی ہو، جس سے ابھی کہہ چکی ہو کہ اس کی ہر بات کو فرمان سمجھتی ہو، کیوں ؟

میری حیثیت اس گھر میں جو ہے آپ کو معلوم ہے میں نہیں چاہتی کہ میری وجہ سے کسی قسم کی تلخی اور بدمزگی پیدا ہو آپ کے مزاج سے بھی واقف ہوں، آپ کو غصہ آجائے گا، بات بڑھے گی۔ نہ میں یہ چاہتی ہوں کہ بات بڑھے نہ یہ منظور ہے کہ آپ مشتعل ہوں اس کا اثر آپ کی صحت پر بہت برا پڑتا ہے۔ مختصر یہ کہ اگر آپ کا حکم ہے تو تاریخ مقررہ پر ضرور شادی ہو جائے گی۔

امتیاز رابعہ کی طبیعت اور مزاج سے واقف تھا۔ پھر اس نے اصرار نہیں کیا، لیکن اسے اچھی طرح اندازہ ہوگیا، کہ اس شادی میں رخنے ڈالنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔"

اور اس احساس نے اس کے ارادے کو زیادہ پختہ کر دیا۔ اس نے فیصلہ کر لیا۔ کہ کسی قیمت پر بھی یہ شادی ملتوی نہیں ہو سکتی۔ اس نے رابعہ سے کہا۔

ہاں میرا یہ اٹل فیصلہ ہے کہ شادی کی تاریخ میں تبدیلی نہیں ہو سکتی !"

"بہت اچھا بھائی صاحب ایسا ہی ہوگا۔؟"

دعوت نامے بھیج دیئے تم نے ؟

ابھی تو نہیں ایک آدھ دن میں روانہ کر دوں گی فہرست بن رہی ہے۔

"میں چاہتا ہوں اس موقعہ پر میرے ہر دوست احباب، عزیز، ہر رشتے دار اور شناسا کو مدعو کیا جائے۔"

ایسا ہی ہوگا۔ بالکل مطمئن رہیے۔"

میں چاہتا ہوں یہ شادی خوب دھوم دھام سے ہو اہل خاندان اور اہل خاندان ہی نہیں، اہل شہر بھی یاد کریں کہ ہاں یہ شادی ایسی دھوم دھام سے ہم نے اور کہیں نہیں دیکھی۔

(مسکراتے ہوئے) لیکن بھائی صاحب اس کی کیا ضرورت ہے

"کیوں نہیں ہے؟ میرے پاس روپے کی کمی نہیں ہے، میری ایک ہی لڑکی ہے۔

ایسا نہ کہیے، خدا رکھے لڑکا بھی ہے۔

ہاں وہ بھی ہے، لیکن نہ جانے کہاں ہے، اس کا ذکر نہ کرو میں اپنی لڑکی کو بہت چاہتا ہوں میری تمنا ہے کہ شادی ایسی دھوم دھام اور تزک و احتشام کے ساتھ ہو کہ عرصۂ دراز تک لوگ یاد رکھیں کہ بھئی امتیاز نے اپنی لڑکی کی شادی میں کمال کر دیا۔ کوئی حسرت باقی نہ رہ جائے۔"

" (زیر لب تبسم کے ساتھ) بہت اچھا بھائی صاحب ایسا ہی ہوگا میں اپنی طرف سے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھوں گی۔"

شاباش، اس طرح کی باتیں کرو تاکہ طبیعت خوش ہو، میں تم سے یہی توقع رکھتا تھا۔ میری دلی آرزو یہی ہے۔"

تو بالکل مطمئن رہیے، چاہے کوئی جلے یا بھنے شادی ہوگی اور دھوم دھام سے ہوگی؟

(خوش ہو کر) یہ آواز ہے رابعہ کی، پہلے تو وہ نہ جانے کون سی چڑیل بول رہی تھی!"

وہ ہنس پڑی اس نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔

" واہ بھائی صاحب، یہ بھی اچھی رہی، آپ نے مجھے چڑیل بنا دیا۔"

چڑیل نہ بناتا تو راہ راست پر کبھی نہ آتیں۔ مجھے غصہ اور صدمہ اس بات پر تھا کہ رابعہ جیسی رستم دوراں اور ایسی بزدل لیکن اب تم نے طبیعت خوش کر دی، جاؤ معاف کر دیا۔

(۲)

آج ارشاد اور زلیخا کی شادی تھی!

کتنا مبارک اور نشاط افروز دن تھا یہ!

ارشاد تو خیر سراپا سرور و طرب تھا ہی لیکن زلیخا بھی کچھ کم خوش نہ تھی۔ اگر یہ کہا جائے کہ بہت زیادہ خوش تھی تو مبالغہ نہ ہوگا۔

اور خوش ہونا چاہیئے تھا۔

زندگی بھر کا پیمان وفا اس شخص سے باندھا جا رہا تھا جو دل کے آشیانے میں ایک عرصہ سے متمکن تھا، بچپن ہی سے جس کی محبت دل کے گوشہ گوشہ میں پیوست ہو گئی تھی۔

لیکن خوشی کے ساتھ ساتھ غم کا کانٹا بھی کھٹک رہا تھا دل میں اعجاز کی یاد!

مفقود الخبر لیکن چہیتے بھائی کی یاد!

آج اگر وہ موجود ہوتا تو اس گھر میں بہار آجاتی، یہاں کی رونق گہما گہمی کا عالم ہی کچھ اور ہوتا۔ لیکن ——

لیکن اس گھر میں شادیانے بج رہے ہیں اور غریب الدیار نہ جانے کہاں ہے؟ نہ جانے کس طرح جہد حیات میں مصروف ہے۔

کاش وہ آجاتا۔

ایک ہی دن کے لئے ایک ہی ساعت کے لئے۔

لیکن وہ نہیں آیا نہ جانے کہاں ہے وہ ؟ ارشاد نے اس کی تلاش و جستجو میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا، بے چارے نے اخبارات میں اشتہار دیا۔ گم گشتہ نہ ملنا تھا نہ ملا۔

آج رہ رہ کے اعجاز کا خیال آرہا تھا۔ اس کی یاد ستا رہی تھی اور جب وہ یاد آجاتا، جب اس کا خیال آجاتا، تو دل کے اندر سے اٹھتی ہوئی خوشی کی لہریں سرد پڑ جاتیں، جی چاہتا۔ اس مسرت کدہ میں آج جتنے لوگ جمع ہیں، ہنس رہے ہیں، قہقہے لگا رہے ہیں۔ ان کے منہ نوچ لے انہیں گھر سے باہر کر دے۔ ان سے کہہ دے میرا دل خون کے آنسو رو رہا ہے اور تم ہنس رہے ہو، جاؤ چلے جاؤ۔

اب اس گھر میں قدم نہ رکھنا۔

لیکن نہ وہ کسی کا منہ نوچ سکی، نہ کسی کو گھر سے نکال سکی۔

خاندان اور محلہ کی عورتیں اور لڑکیاں جمع تھیں یہ سب آرہی تھیں اسے دولہن بنا دیکھ رہی تھیں۔ اس کی تعریف میں رطب اللسان تھیں کوئی اس کے ناک نقشے کی تعریف کرتا کوئی رنگ و روپ کی کوئی گدگداتا کوئی لطیفے سنا کر ہنسانے کی کوشش کرتا اور بے بسی کے ساتھ ان سب کی یہ زیادتیاں برداشت کرتی، وہ دولہن تھی، انتہائی خاموشی کے ساتھ اسے سب کچھ برداشت کرنا تھا۔ اسے جنبش لب کی بھی اجازت نہ تھی۔

امتیاز کا نام بڑا تھا۔ اپنے حلقے میں اس کی شخصیت بہت اونچی تھی۔ اس کے پاس مال و دولت کی بھی کمی نہ تھی اس کی طرف سے دعوت نامہ پائے اور کوئی رد کر دے، ایسا ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ دعوت نامہ پاتے ہی مہمان ٹوٹ پڑے جیسے وہ اس دن کے، اس تقریب مسرت کے نہ جانے کب سے منتظر تھے۔

سارا گھر مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ مردانے میں مرد اور زنان خانے میں عورتیں اور نوجوان لڑکیاں۔ ان میں سے شاید ہی زلیخا نے کسی کو دیکھا

ہو، کسی سے ملاقات کی نوبت آئی ہو، لیکن یہ سب اس طرح صدقے قربان اور داری ہو رہی تھیں جیسے ہمیشہ سے اس گھر میں ان کا آنا جانا ہے جیسے یہ ہمیشہ سے زلیخا کو جانتی اور چاہتی، چلی آئی ہیں سب میں وہ اپنایت نظر آ رہی تھی جیسے نسلوں اور پشتوں سے تعلقات چلے آ رہے ہوں، یہ ثبوت تھا۔ امتیاز کی شخصیت اور اس کی دلعزیزی کا۔

رابعہ بیگم کا تو کہنا ہی کیا۔

وہ پاؤں رکھتی کہیں تھیں، پڑتا کہیں تھا، جوش مسرت سے مدہوش ہوئی جا رہی تھیں یہ تپاک یہ گرمجوشی یہ اپنایت جو ان، نئے اور اجنبی مہمانوں میں دیکھ رہی تھیں، یہ ان کے لئے بالکل نئی اور قطعاً غیر متوقع چیز تھی، امتیاز کا اب سے پہلے جو طرز عمل رہا تھا۔ اس نے تو گھر کو جیل خانہ بنا دیا تھا۔ نہ کوئی آتا تھا نہ جاتا تھا نہ کسی سے راہ و رسم نہ ضبط و ربط، لیکن آج سب اس طرح ٹوٹ پڑے جیسے نہ جانے کب سے شناسائی چلی آ رہی ہے۔ اس واقعہ نے رابعہ کا حوصلہ بڑھا دیا اور کہیں زیادہ جوش و خروش کے ساتھ اس تقریب کو کامیاب بنانے کی جد وجہد کرنے لگیں۔

لیکن اس گھر میں جہاں ہر طرف غلغلہ، نشاط اور ہنگامہ، طرب برپا تھا۔ اگر کہیں خاموشی تھی تو وہ کلثوم کا گوشہ احزان تھا۔ احراز کو دفعتہً سرکاری کام سے باہر جانا پڑا لہٰذا وہ شرکت ہی نہ کر سکا۔

کلثوم عین موقعہ پر ایسے شدید درد سر اور سینہ میں مبتلا ہوئی کہ بستر سے اٹھنا دوبھر ہو گیا، نسیم البتہ تندرست تھی اسے اس تقریب میں شرکت کا حصہ لینے کا موقعہ ہی نہ مل سکا۔

نادرہ نے اس طرز عمل کو بائیکاٹ کا نام دیا تھا۔ رابعہ کی رائے بھی یہی تھی لیکن اس نے خاموشی کو ترجیح دی، زلیخا سب کچھ سمجھ رہی تھی۔ لیکن اس کے لئے زبان کا ہلانا بھی ممکن نہ تھا۔

باہر مردانے میں ارشاد دولہا بنا بیٹھا تھا۔ ارد گرد حاشیہ نشین موجود

تھے، سب نئے، سب اجنبی، لیکن سب مہر و محبت کے پیکر، سب کی باتوں میں اپنایت اور تپاک وگرم جوشی کے جلوے!

امتیاز بدستور بستر علالت پر دراز تھا۔ ڈاکٹروں نے سختی سے ہدایت کر رکھی تھی کہ وہ بستر سے اترنے کا ارادہ بھی نہیں کر سکتا اور اس ہدایت پر دوست احباب نے عمل کرنے پر اسے مجبور کر دیا تھا۔ لیکن اس کا کمرہ بزم بے تکلف بنا ہوا تھا۔ اس کے محکمہ کے لوگ، اس کے دوست، اس کے ہم نشین، ہمدم، دمساز، سب بکثرت موجود تھے اور طرح طرح سے اسے خوش کرنے اور دل بہلانے کی کوشش کر رہے تھے۔

احراز چونکہ موقع واردات پر موجود ہی نہیں تھا۔ اور کلثوم بیمار تھی اور نسیم ٹھہری خود "لڑکی" وہ کیا جانے ایسے موقعوں پر کیا کیا جاتا ہے لہذا چچا چچی اور چچازاد بہن کی طرف سے تو زلیخا کو کچھ نہ ملا۔ لیکن امتیاز کے جو دوست احباب اور ان کی بیویاں، اور لڑکیاں آئی تھیں۔ انہوں نے قیمتی تحائف کی صورت میں ارشاد اور زلیخا کے جیب و دامن بھر دیئے اس موقعہ پر تحائف کی صورت میں ارشاد اور زلیخا کو جو کچھ ملا اس کی مالیت کسی طرح ۲۵ — ۳۰ ہزار سے کم نہ ہوگی، امتیاز نے لاکھ لاکھ منع کیا رابعہ نے ہزار ہزار نہیں نہیں کی۔ لیکن سنتا کون تھا۔ جو شخص بھی اپنے ساتھ تحائف لایا تھا۔ وہ زبردستی امتیاز کے سر منڈھ کر واپس گیا۔

اور ایسا ہونا بھی چاہیے تھا۔ آخر زندگی بھر امتیاز کی آمدنی — اور وہ بہر حال معمولی نہ تھی۔ کہاں صرف ہوئی؟۔ انہی دوستوں پر۔ پھر اگر آج اس کی اکلوتی لڑکی کی شادی ہو رہی تھی۔ تو وہ لوگ جن کے ہاں معمولی سے معمولی تقریب وہ زر و گوہر نثار کیا کرتا تھا۔ کس طرح خاموش رہ سکتے تھے کچھ نہ کچھ تو انہیں کرنا ہی چاہیے تھا۔ منع کرنے اور رد کرنے کے باوجود نہ وہ باز آ سکتے تھے نہ انہیں باز آنا چاہیے تھا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

احراز کی غیر حاضری اور کلثوم و نسیم کی عدم شرکت، امتیاز کو بہت کو بہت کھلی۔ لیکن اس نے الفاظ کے ذریعہ اپنے تاثرات و خیالات کا اظہار نہیں کیا۔ مگر اس تقریب کے اختتام پر رابعہ سے یہ پوچھے بغیر نہ رہ سکا

"کیا احراز نے یا کلثوم نے بھی کوئی تحفہ دیا ہے ؟"

"دیا ہو تو لاؤ۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں !"

رابعہ نے جواب دیا۔ احراز میاں تو سرکاری کام سے باہر گئے ہوئے ہیں۔ اور کلثوم کی کچھ طبیعت خراب ہے لہٰذا۔

"لہٰذا وہ کوئی تحفہ اپنی بھتیجی کو نہ دے سکے۔ یہی کچھ کہنا چاہتی ہو۔؟"

وہ چپ رہی لیکن نادرہ جو پاس ہی کھڑی تھی۔ خاموش نہ رہ سکی کہنے لگی۔

گئے تھے تو جاتے وقت دیتے جاتے۔ اور بیگم صاحبہ (کلثوم) اللہ رکھے کچھ بے ہوش تو ہیں نہیں، اچھی خاصی لیٹی ہیں۔ کیا بیٹا (نسیم) کے ہاتھ بھی کچھ نہیں بھیج سکتی تھیں۔

امتیاز نے خشونت کے ساتھ کہا۔

"ہاں جی وہی بات ہے۔ تیرا ہی جی نہ چاہے تو باتیں ہزار ہیں۔"

وہ ہاں میں ہاں ملاتی ہوئی بولی۔

"جی اور کیا !"

امتیاز نے کہا۔ "خیر میں بھی سمجھ لوں گا۔"

رابعہ لرز گئی۔ اس نے سوچا۔ اگر انہیں غصہ آگیا۔ تو غضب ہو جائے گا۔ اس نے کہا۔

بھائی صاحب آپ ایسی معمولی باتیں کیوں سوچتے ہیں۔ خدا کے فضل سے ارشاد اور زلیخا کو آپ کے دوستوں اور ان کی بیویوں کی طرف سے اتنا کچھ مل گیا ہے کہ مجھے حیرت ہوتی ہے، سچ کہتی ہوں۔ میری توقع سے کہیں زیادہ ہے۔

امتیاز نے اسی انداز اور لب و لہجہ میں جواب دیا۔

ہاں چاہیے تو نہیں تھا۔ رابعہ نے کہا۔

اب میں نے بھی فیصلہ کر لیا ہے کہ نسیم کو جو کچھ اس کی شادی پر دینے والا تھا۔ ہرگز نہیں دوں گا۔ یہ چیزیں بھی زلیخا کے کام آئیں گی۔ سچ

رابعہ، میں نسیم کو زلیخا سے اور احراز کو اعجاز سے کم نہیں چاہتا تھا۔
"میں جانتی ہوں بھائی صاحب!
"مجھے حیرت اس پر ہے کہ اس طرز کا آخر مطلب کیا ہے؟"
"یہی تو میں بھی سوچتی ہوں"
نادرہ نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔
"میں جانتی ہوں!"
امتیاز نے زبان سے کچھ نہ کہا، لیکن سوالیہ نظروں سے اس طرف دیکھنے لگا۔ وہ بولی۔

"اگر آپ زلیخا کی شادی وہاں کر دیتے جہاں یہ لوگ چاہتے تھے تو نہ چھوٹے میاں کو سرکاری کام پیش آتا نہ چھوٹی بیگم اب کی دفعہ بیمار پڑتیں چونکہ آپ نے اس کی شادی اپنی سالی کے لڑکے سے کر دی۔ اس لئے یہ خفگی ہے۔!"
"وہ برہم ہو کر بولا،" لیکن احراز کی یہ مجال کہ وہ مجھ سے خفا ہو؟"
"لیکن میاں یہ زمانہ ہی ایسا ہے!"
"سمجھ لوں گا۔" پھر آہستہ آہستہ اُس نے کہا۔
میں اس سے زندگی بھر کے لئے تعلقات منقطع کر لوں گا جس نے میری اس پہلی اور آخری خوشی میں شرکت گوارا نہیں کی۔ اس سے میرا کیا تعلق میرا کیا اس کا کیا ناطہ؟"
رابعہ نے گویا دونوں بھائیوں میں صلح کرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔
"لیکن بھائی صاحب گوشت سے ناخن جدا نہیں ہوتا۔ خون کا رشتہ بھی عجیب ہوتا ہے وہ کسی طرح نہیں ٹوٹتا!"
امتیاز نے ایک آہ سرد کے ساتھ کہا۔
لیکن وہ ٹوٹ گیا۔ اب اس کا ذکر بیکار ہے۔
کیا۔ نہیں بھائی صاحب ایسا نہ کہیئے۔

امتیاز نے گھور کر رابعہ کو دیکھا اور پوچھا۔
کیا مطلب ہے تمہارا؟ کیا کہنا چاہتی ہو تم؟
وہ بولی" ممکن ہے واپس آکر اس بھول چوک کی تلافی کر دیں۔
امتیاز نے برہمی کے ساتھ کہا۔
خبردار، اب اگر احراز یا کلثوم کچھ دینا چاہیں تو ہرگز قبول نہ کرنا اگر تم نے قبول کر لیا تو مجھے صدمہ ہوگا۔ اور میں قطعاً اسے واپس کر دوں گا۔
رابعہ نے امتیاز کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔
آپ کی یہی مرضی ہے تو یہی سہی۔ اس طرح ٹال دوں گی کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔
امتیاز کو اور زیادہ غصہ آگیا۔
میں دکھاوے اور منافقت کی باتیں پسند نہیں کرتا۔ ٹالنے کا کیا سوال صاف صاف کہہ دینا چاہیے کہ نہ تم ہمارے، نہ ہم تمہارے، تم ہماری خوشی میں شریک نہیں ہوئے، ہمیں تمہاری خوشی سے سروکار نہیں۔
احراز تو سرکاری کام کا بہانہ کر کے بھاگا تھا۔ اس لئے کہ اس میں یہاں رہ کر شریک نہ ہونے کی اخلاقی جرأت نہیں تھی لیکن مجھ میں ہے۔ میں یہیں رہوں گا اور نسیم کی شادی میں شریک نہیں ہوں گا؟"
رابعہ نے سوچا یہ بحث جتنی زیادہ طویل ہوتی جائے گی، اتنی ہی زیادہ فیصلہ کن اور نازک صورت اختیار کرتی جائے گی، لہٰذا مصلحت اسی میں ہے کہ بات گول کر دی جائے، چنانچہ اس نے موضوع بدلنے کے لئے دوسری باتیں شروع کر دیں جن کا احراز یا کلثوم سے کوئی تعلق نہ تھا۔

(۳)

سعادت گنج میں حالات کچھ ایسے پیش آئے کہ ارشاد کو شادی کے چند ہی روز بعد وہاں جانا پڑا۔ ویسے بھی رابعہ بیگم کو آئے ہوئے یہاں کافی مدت ہو گئی تھی۔ اگر امتیاز کی صحت درست ہوتی تو کب کی زلیخا کو اپنے ساتھ لے کر چلی گئی ہوتیں، لیکن یہ مجبوری ایسی تھی، جس نے ان کے پاؤں پکڑ رکھے تھے۔

ارشاد کو گئے ہوئے ابھی مشکل سے تین دن ہوئے ہوں گے کہ امتیاز کی حالت اور زیادہ خراب ہو گئی اور ڈاکٹروں کے مشورہ سے اسے ہسپتال میں داخل کرنا پڑا۔

زلیخا مستقل طور پر باپ کی خدمت اور دیکھ بھال کے لئے وہیں تھی۔ رابعہ بھی دن میں ایک چکر ضرور لگا لیا کرتی تھی۔ زلیخا کا کھانا اور ناشتہ گھر سے جاتا تھا۔ اور یہ ڈیوٹی نادرہ کی تھی۔ اور کوئی شبہ نہیں۔ بڑے خلوص اور مستعدی کے ساتھ وہ اس فرض کو انجام دے رہی تھی۔

امتیاز کا حال یہ تھا۔ کہ کبھی حالت سنبھل جاتی، کبھی تشویش انگیز صورت اختیار کر لیتی۔ کبھی آس بندھ جاتی، کبھی یاس طاری ہو جاتی زلیخا کا یہ حال تھا۔ کہ ہر وقت باپ کی پٹی سے لگی رہتی اور خود امتیاز کی یہ کیفیت تھی کہ ذرا غوطہ سے آنکھ کھلی اور اس نے

آواز دی۔

"زلیخا — زلیخا بیٹی!"

اور جب تک وہ بالکل پٹی سے لگ کر بیٹھ نہ جاتی اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ نہ لے لیتا قرار نہ آتا، اس کی حالت بالکل بچوں کی سی ہوتی۔ صرف زلیخا اس کے زخم دل کو بہلا سکتی تھی، نہ نرس، نہ ڈاکٹر، نہ رابعہ سب ہی بیکار تھے۔ زلیخا اس کے زخم دل کا مرہم بھی تھی، پھایا بھی، سکون بھی اس کے سہارے وہ اپنی زندگی کے دن پورے کر رہا تھا۔

نماز پڑھ پڑھ کر، قرآن کی تلاوت کر کر کے، رات کو پچھلے پہر جاگ جاگ کر اور رو رو کر گڑگڑا، وہ اپنے باپ کی صحت و تندرستی کی دعائیں مانگتی۔ ان دعاؤں سے کچھ وقتی سکون حاصل ہو جاتا۔ مگر جب اس پر بیہوشی کے دورے پڑتے، جب وہ کراہتا، جب اس پر بے چینی اور اضطراب کی کیفیت طاری ہوتی تو وہ بچوں کی طرح بلبلا کر رونے لگتی، اس کے سوا اور کر بھی کیا سکتی تھی۔

ایک روز بے ہوشی کے دورے سے امتیاز کی آنکھ کھلی اور اس نے زلیخا کو پکارا، وہ پاس ہی بیٹھی تھی، کہنے لگی۔

"اباجی"، میں یہ رہی آپ کے پاس!"

امتیاز نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا، محبت سے دبایا پیار بھری نظروں سے دیکھا اور پوچھا۔

"کیا اعجاز آگیا!"

یہ تین لفظ تھے، لیکن ان تین لفظوں میں محبت، حسرت، اضطراب اور قلق کی دنیا سمٹ آئی تھی۔ زلیخا نے محسوس کر لیا۔ اس آن بان اور ان والے، خوددار اور خود پرست باپ کے دل میں بیٹے کی یاد چٹکیاں لے رہی تھی۔ یہ چاہتا ہے کہ بیٹے کو دیکھے، اسے کلیجہ سے لگائے، پیار کرے اور اپنا کلیجہ ٹھنڈا کرے لیکن وہ کہاں؟

آج زندگی میں پہلی مرتبہ اسے اعجاز پر غصہ آیا۔

آج زندگی میں پہلی مرتبہ اس کے دل میں اعجاز سے بیزاری پیدا ہوئی وہ دل ہی دل میں اعجاز کو ملامت کررہی تھی کہ اس نازک گھڑی پر بھی وہ یہاں موجود نہیں ہے۔ آخری وقت بھی باپ کی دعایئں لینے کے لئے وہ یہاں موجود نہیں ہے کاش وہ اس وقت یہاں موجود ہوتا۔

(۴)

اس سوال کا جواب زلیخا کے پاس کیا تھا اور جو تھا وہ حد درجہ دل شکن اور مایوس کن۔

وہ خاموش رہی، اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

امتیاز نے پھر سوال کیا۔ "بیٹی کیا اعجاز آ گیا۔ میں نے ابھی اسے دیکھا تھا، اسے بلاؤ، لے آؤ میرے پاس میں تو اس سے ذرا بھی خفا نہیں تھا اور اگر تھا بھی تو معاف کر دیا۔ وہ مجھ سے بجا طور پر خفا تھا۔ اس کی یہ خفگی بھی سعادت مندی تھی وہ اس لیے خفا نہیں تھا۔ کہ مجھ سے نفرت کرتا تھا۔ اس لیے خفا تھا۔ کہ اپنی ماں سے محبت کرتا تھا۔ اسے خفا ہونا ہی چاہیئے تھا۔ ماں کے لیئے مجھ سے خفا ہو کر روٹھ کر اس نے میرے دل میں اپنی محبت پیدا کر لی۔ لیکن بیٹی تو میرا منہ کیوں تک رہی ہے؟ اسے بلاتی کیوں نہیں؟ کتنا یاد کیا کرتی تھی، تو اسے، مگر اب ایسا محسوس ہوتا ہے، جیسے اس کے آنے سے تجھے خوشی نہیں ہوئی کہیں تو اس سے لڑ تو نہیں پڑی، کہیں تو نے اُسے پھر تو خفا نہیں کر دیا ہے۔ بیٹی یہ تو نے کیا کیا۔؟"

اور یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ لیکن اس کی آنکھوں سے آنسو ڈھلکنے لگے۔ زلیخا یہ دلدوز منظر دیکھ کر کانپ گئی، تڑپ اٹھی اس کا دل بن کے آنسو رونے لگا۔ اس کا بس چلتا تو جہاں بھی اعجاز کا

سراغ ملتا خود پہنچتی اور اسے لاکر باپ کے قدموں پر جھکا دیتی لیکن مشکل تو یہی تھی کہ اب تک اس کا سراغ نہیں چل سکا تھا کہ وہ کہاں ہے کس شہر میں ہے ؟"

اس نے دوپٹہ کے دامن سے باپ کے آنسو پونچھتے ہوئے اور لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

" اباجی، بھیا سے بھلا میں خفا ہو سکتی ہوں، آپ کو یاد نہیں کتنی دفعہ میں نے آپ سے اُن کی سفارش کی ہے؟

وہ بولا" ہاں خوب یاد ہے۔ مگر وہ کہاں ہے ؟ تو اُسے میرے پاس کیوں نہیں لاتی ؟

بار رجہ مجبوری زلیخا کو جھوٹ سے کام لینا پڑا، کہنے لگی۔

ڈاکٹر صاحب نے ایک دوا آپ کے لئے لکھی ہے، بہت ڈھنڈوائی کہیں نہیں ملی۔ بھیا نے کہا، میں لے کر آتا ہوں۔ ملے گی کیسے نہیں۔ اس کی تلاش میں گئے ہیں ؟"

" کاش اسے معلوم ہوتا وہ دوا میرے لئے اتنی مفید نہیں ہے جتنا اس کا وجود۔"

" بہت جلد آجایئں گے!"

کتنی دیر میں

بس گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ میں۔

گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ میں — اخوہ کتنی لمبی مدت ہے یہ ؟ کیوں بیٹی، وہ دُبلا تو نہیں ہو گیا ہے ؟

نہیں آباجی، وہ بہت تندرست ہیں، ماشا اللہ۔"

" اور میرے متعلق کیا خیال ہے اس کا ؟"

" آپ کے متعلق کیا خیال ہوتا ؟ وہ تو رو رہے تھے۔!"

(بے قرار ہو کر) رو رہا تھا ؟ کیوں ؟

" آپ کو بیمار دیکھ کر ؟"

بے وقوف ہے، میری حالت ایسی کون سی نازک ہے اور اب تو آ گیا ہے۔ اب تو میں ہرگز مرنا نہیں چاہتا۔

ریحانہ کی آنکھیں بدستور آب گوں تھیں، کہنے لگی۔

" آبا جی، آپ بہت جلد اچھے ہو جائیں گے، ڈاکٹر۔

" چھوڑو ڈاکٹر، ڈاکٹر، اب تو میرا مسیحا آ گیا۔ اعجاز۔"

ابا جی آپ تو انہیں بہت چاہتے لگے ہیں؟

ہاں بیٹی! کیا تو اسے پسند نہیں کرتی؟ اپنی خوشی کس طرح بیان کروں؟ پھر اس نے سوال کیا۔

" اب ڈیڑھ گھنٹہ میں، یعنی اس کے آنے میں کتنی دیر باقی ہے؟"

ابھی تو صرف پندراں منٹ ہوئے ہیں۔

پندرہ منٹ۔ کیوں بیٹی وہ پھر تو نہیں چلا جائے گا۔

نہیں ابا جی، اب وہ نہیں جائیں گے، اب وہ ہمیشہ آپ کے پاس رہیں گے، کہہ رہے تھے اب ساری زندگی ابا جان کی خدمت میں گزار دوں گا۔"

" واقعی یہ کہہ رہا تھا؟"

" جی ابا جی یہی کہہ رہے تھے، یہ بھی کہہ رہے تھے، ابا جی کی صحت یہاں ٹھیک نہ ہوئی تو کسی دوسرے شہر میں لے جائیں گے۔

علاج کے لئے۔

(۵)

وہ تو کہیئے، امتیاز کو بیہوشی کے دورے کثرت سے پڑ رہے تھے اور اس کی یادداشت بھی اسی وجہ سے کمزور ہو گئی تھی، اس لئے اعجاز کی عدم موجودگی کسی نئے طوفان کا پیش خیمہ نہیں بن سکی، اول تو ہر مرتبہ جب وہ ہوش میں آتا تھا۔ اعجاز یاد نہیں آتا تھا، اور اگر آتا بھی تھا تو زلیخا بڑی ہوشیاری سے اس کی توجہ کسی طرف مبذول کر دیتی تھی۔ یا کوئی بہانہ تراش دیتی تھی جسے چار و ناچار ماننا پڑتا تھا۔ یا اگر رٹ لگتی تو بار بار اسی کا ذکر کرتا، اور جب بھول جاتا تو ذکر تک نہ کرتا۔ زلیخا خود بھی اکثر یہ ذکر چھیڑتی وہ سنی کی ان سنی کر دیتا۔ اس کی یہ ذہنی و دماغی کیفیت اور تبدیلی اس حقیقت کی غماز تھی، کہ حالت روز بروز کیا لحہ بہ لحہ نازک تر ہوتی جا رہی ہے یہ محسوس کر کے وہ رونے لگتی یا دعا مانگنے لگتی۔ بس اپنا تو اتنا ہی مقدور ہے۔

ایک روز امتیاز نے زلیخا سے بچوں کی طرح اصرار کرتے ہوئے کہا:

"آج کھیر کھاؤں گا۔"

وہ دوڑی دوڑی نرس کے پاس گئی اور اس کے واسطے، ڈاکٹر کی ہدایت طلب کی، ڈاکٹر نے تھوڑے سے تامل کے بعد اجازت دے دی لیکن یہ تاکید کر دی کہ شکر کم ڈالی جائے اور دودھ زیادہ استعمال کیا

جائے جس کی چکنائی جا چکی ہو اور چاولوں کی بیچ بھی نکال دی جائے۔

ان کڑی شرطوں کے باوجود زلیخا خوش تھی۔ کہ اجازت مل تو گئی نہ ملتی تو شاید ابا جی کھانا ہی کھانے سے انکار کر دیتے بیماری میں آدمی ویسے ہی چڑچڑا ہو جاتا ہے اور یہ تو ہمیشہ کے ضدی ہیں۔

دوپہر کو جب نادرہ کھانا لے کر آئی۔ تو اس سے کہا۔

آج ابا جی کا کھیر کھانے کو جی چاہ رہا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اجازت بھی دے دی ہے۔ وہ آٹھ بجے کھانا کھاتے ہیں۔ تم وقت سے پندرہ منٹ پہلے آ جانا۔ چونکہ شکر کم ڈالنی ہے اور دودھ بھی بالائی دار نہیں ہوگا۔ لہٰذا ایسی مزے کی پکاؤ کہ انگلیاں چاٹتے رہ جائیں اگر کہیں ناپسند ہوگئی تو پوری سینی بمعہ برتنوں کے تمہارے سر سے ٹکرائے گی۔"

" نادرہ نے اطمینان دلاتے ہوئے کہا " بے فکر رہو۔ ایسی مزے کی پکاؤں گی، کہ لطف آ جائے۔"

جب وہ گھر سے واپس پہنچی تو رابعہ کو اس نے یہ فرمائش سنا دی اس بچاری نے اس وقت سے تیاریاں شروع کر دیں، چاول نکالے۔ انہیں صاف کیا۔ اُبالا۔ ان کی بیچ نکال کر پھینکی۔

اب دودھ کا سوال پیدا ہوا، جو گوالا ہر روز دودھ دے جاتا تھا وہ وہی ہوتا تھا جو عام طور پہ استعمال ہوتا ہے گھر میں یعنے چکنائی سے بھرپور جب اس مشکل کا حل سمجھ میں نہ آیا۔ تو رابعہ نے بے بسی ساتھ گویا۔ ہتھیار ڈالتے ہوئے پوچھا۔

کیوں ری نادرہ کا کیا ہوگا؟

وہ کچھ سوچتی ہوئی بولی، قاضی ٹولے میں ایک دوکان ہے۔ وہاں اس طرح کا دودھ مل جاتا ہے، کہیے تو وہاں سے لے آؤں لیکن دور ہے

رابعہ نے بٹوے سے پیسے نکال کر اسے دیتے ہوئے کہا۔

کالے کوسوں دور کیوں نہ ہو جاؤ۔ بھائی صاحب کی فرمائش اور خواہش ہر حالت میں اور ہر قیمت پر پوری کرنی ہے۔ لیکن جلدی آنے کی کوشش

کرنا۔ تاکہ وقت پر انہیں پہنچ جائے۔

وہ مسکراتی ہوئی بولی،، ہاں بی بی جلد لے آؤں گی بیٹا (زلیخا) بھی کہہ رہی تھیں، اگر دیر سے آئی تو سینی معہ برتنوں کے تیرے سر سے ٹکرائے گی؟"

رابعہ نے ہنستے ہوئے کہا ہاں اور کیا ان کا مزاج جانتی ہی ہے؟"

(۶)

گو نادرہ جلدی آنے کا وعدہ کر گئی تھی لیکن واپس آنے میں کافی دیر لگی۔ اس عرصہ میں کئی مرتبہ نسیم نے اسے چائے کے لئے پکارا مگر وہ تھی کہاں جو کسی طرح کا جواب دیتی، شام کی چائے وہی روز احراز، کلثوم اور نسیم کی خدمت میں پیش کیا کرتی تھی۔ جتنی جتنی دیر ہوتی جارہی تھی ان لوگوں کا پارہ چڑھتا جارہا تھا۔

آخر نسیم ضبط نہ کر سکی وہ اپنے کمرہ سے نکل کر سیدھی رابعہ کے کمرے میں پہنچی اور اس کے پیچھے پیچھے حسب ضرورت مدد کے کلثوم۔

نسیم نے پوچھا۔

کیا وہ حرام زادی نادرہ مر گئی۔

رابعہ نے چونک کر اسے دیکھا اور جواب دیا " اے خدا نہ کرے مرتی کیوں؟ کام سے گئی ہے آتی ہوگی۔

کلثوم نے آگے بڑھ کر مداخلت کی " آخر وہ کون سا کام ہے جس کے لئے وہ زمین کا گز بنی ہوئی ہے؟"

رابعہ نے سادگی کے ساتھ سارا واقعہ بتا دیا۔ نسیم نے کہا۔ ہسپتال میں پڑے ہیں، لیکن زبان کی چاٹ نے وہاں بھی ساتھ نہیں چھوڑا!"

رابعہ کو غصہ تو بہت آیا لیکن ضبط کر گئی، لیکن اتنا کہے بغیر نہ رہ سکی ۔

بیٹی ۔ یہ تم اپنے تایا کو کہہ رہی ہو وہ تمہارے باپ کے بڑے بھائی ہیں اس لئے ان سے زیادہ احترام کے مستحق ہیں :

نسیم کچھ جھینپ سی گئی لیکن کلثوم نے اس کی پشت پناہی کرتے ہوئے کہا ۔

سچی بات جو ہو گی ضرور کہی جائے گی ، چاہے کسی کے خلاف پڑے نہ جانے وہ موا ڈاکٹر کیسا ہے جس نے اس حالت میں کہ دم لبوں پر ہے کھر جانے کی اجازت دے دی !"

اب رابعہ ضبط نہ کر سکی ، اس نے کہا ، شرم کرو ، کلثوم خدا سے ڈرو ، ہر کوئی بیمار ہو سکتا ہے ، ہر شخص پر یہ دن آ سکتے ہیں ، آج وہ کل تمہاری باری ہے ۔ ایسی باتیں منہ سے نہ نکالو جو خدا کو بری لگیں ۔ کوئی نہیں جانتا کہ کل کیا ہونے والا ہے ۔ اتنی فرعونیت بھی اچھی نہیں ہوتی یہ الفاظ بارود میں آگ ثابت ہوئے ۔ کلثوم بھڑک اُٹھی کمر پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگی ۔

میں کہتی ہوں زبان سنبھال کے بات کر !"

رابعہ نے حقارت کی نظر سے دیکھا اور بولی ۔

اب خیر تو تڑاق پر اتر آئیں ۔ زبان بگڑی تو بگڑی تھی ، خیر لیجئے دہن بگڑا ۔

کلثوم نے اور زیادہ درشت لہجہ میں جواب دیا ۔

آخر تو اپنی کھال میں کیوں نہیں رہتی ، آخر تجھے حق کیا تھا ایسی باتیں کرنے کا ؟ کوسنے کا ؟ گالیاں دینے کا ؟ تو اپنے آپ کو سمجھتی کیا ہے بات اگر مردوں (احرار) تک پہنچی ، تو ابھی آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جائے گا ۔ ان کا غصہ بہت بُرا ہے ۔ پھر وہ نہ میر کے نہ پیر کے ۔

"رابعہ نے پوچھا" کیا کر لیں گے وہ ؟"

کلثوم کی بجائے نسیم نے جواب دیا۔ دن میں تارے نظر آجائیں گے ان کا ہاتھ بڑی جلدی اٹھتا ہے۔ اس دن نادرہ کو ایسی چار چوٹ کی مار ماری تھی۔ کہ ہفتوں یاد کی ہوگی۔"

"تو کیا مجھے بھی ماریں گے، مجھ پر بھی ہاتھ اٹھائیں گے؟"

نہیں ہر میجسٹی، ملکہ معظمہ کے ساتھ ایسی گستاخی کیسے سرزد ہو سکتی ہے ان سے؛

یہ کہنے کے بعد وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی، لیکن اس ہنسی میں کتنی حقارت تھی، کتنی برہمی تھی، اسے رابعہ نے اچھی طرح محسوس کر لیا تھا۔ اتنے میں کلثوم بولی، چاہے کوئی بھی ہو، ہم کسی سے نہیں ڈرتے؟"

"رابعہ میں ڈرتی ہوں!"

نسیم نے بناتے ہوئے پوچھا، ارے آپ بھی ڈرتی ہیں؟" وہ بولی ہاں ہر ننگ آدمی سے!"

(۷)

رابعہ کے یہ الفاظ سن کر کلثوم اور نسیم دونوں سناٹے میں آگئیں ذرا دیر تک گم سم کھڑی رہیں، پھر جب حواس بجا ہوئے تو کلثوم نے کہا۔

ہم ننگ ہیں؟ ہم کمینے ہیں، ہم رذیل ہیں؟ ہم پچھے ہیں؟

جواب میں رابعہ نے کہا۔ تم خود بہتر جانتی ہو کہ کیا ہو۔

"لیکن بی بی اب مجھے معاف کرو، جاؤ اپنے کمرے میں بیٹھو میرا سر خواہ مخواہ کیوں کھا رہی ہو؟"

نسیم اچھل کر بولی۔

کیوں جائیں اپنے کمرے میں؟ کیوں یہ گھر ہمارا نہیں ہے؟

ہمارے سوا اس کا مالک کون ہے؟

مالک تو ہے۔ میں نہیں ہوں اور میں نے اس کا دعویٰ بھی نہیں کیا!

"کلثوم نے لقمہ دیا،" دعوے کرو گی کس منہ سے؟ تمہاری حیثیت کیا ہے؟ بھائی صاحب (امتیازنہ) کو دعا دو کہ انہوں نے ٹکڑوں سے لگا دیا۔ لیکن بھائی۔ ایسی روٹی پر جو لاج گنوا کر حاصل کی جائے تف ہے شریف عورت تو مر رہنا گوارا کرے گی۔ لیکن اپنی لاج کا سودا نہیں کرے گی۔

"نسیم ہنسنے لگی، پھر گویا ہوئی" وہ بھی اس عمر میں۔ آپ کی صورت کو دیکھنا چاہیئے!"

اور یہ کہہ کر وہ پھر ہنس پڑی۔ ان باتوں نے رابعہ کو حد درجہ برہم کر دیا۔ اس کا جی چاہا نسیم کا اور کلثوم کا منہ نوچ لے۔ لیکن امتیاز بیمار تھا ارشاد باہر تھا۔ زلیخا ہسپتال میں تھی، نادرہ موجود نہیں تھی، وہ تنہا تھی اور محسوس کر رہی تھی۔ کہ اگر بات نے زیادہ طول کھینچا۔ تو نوبت مار پیٹ تک پہنچ جائے۔ لہٰذا خون کا گھونٹ پی کر رہ گئی۔ کہنے لگی۔

آج تو ایسا معلوم ہوتا ہے تم دونوں ماں بیٹی مار پیٹ کرنے کے لئے آئی ہو۔ لیکن سوچو تو سہی، شریف خاندانوں میں ایسا ہوتا ہے۔؟"

"شریف؟ شریف کون ہے شریف؟

تم؟" میں نہیں تو نہ سہی تم تو ہو، تم تو شرافت کا پاس کرو۔"

ایک زہر خندہ کے ساتھ نسیم بولی۔ اسی لئے تو اب تک سر اور ہاتھ پاؤں سلامت ہیں، ورنہ کب کی خود بھی ہسپتال پہنچ چکی ہوتیں۔ پھر دہاں مزے آتے جب دونوں ایک ساتھ جمع ہو جاتے ——

"تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل!"

رابعہ نے بہت زیادہ نرم لہجہ میں کہا، بی بی واقعی میں بہت بری ہوں معاف کر دو مجھے!"

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ ہانپتی کانپتی نادرہ دودھ لئے ہوئے آموجود ہوئی۔ نادرہ کو دیکھتے ہی نسیم اور کلثوم کا پارہ اور چڑھ گیا۔ پہلے کلثوم نے سوال کیا۔

کیوں ری مردار کہاں تھی اب تک؟"

وہ بولی بڑے صاحب کے لئے دودھ لینے گئی تھی۔ بڑی دور جانا پڑا سواری بھی کوئی نہیں ملی، پیدل گئی اور پیدل آگئی نہ جانے تانگے کہاں مر گئے سارے۔

نسیم نے قہر کی نگاہوں سے اُسے گھورا اور پھر اس سے پوچھا۔

"اور ہماری چائے؟"

وہ معذرت کرتی ہوئی کہنے لگی۔

ہاں بٹیا آج بہت دیر ہو گئی۔ لیکن کچھ اپنے کام سے تو گئی نہیں تھی۔ اللہ سلامت رکھے تمہارے تایا کے کام سے گئی تھی۔ کتنے دنوں سے وہ بیمار ہیں، نہ کچھ کھاتے ہیں۔ نہ کچھ پیتے ہیں، آج انہوں نے خود اپنے منہ سے کھیر کی فرمائش کی تھی۔ زلیخا نے اصرار کیا تھا۔ ٹھیک وقت پر سے آنا چکنائی نکلا ہوا دودھ یہاں کہیں ملتا نہیں، اس لئے قاضی ٹولے جانا پڑا اور نہ کب کی چائے دے چکی ہوتی،

"تاہم اب چٹکی بجاتے میں بنائے دیتی ہوں"

پھر وہ رابعہ سے مخاطب ہوئی۔

بی بی چاول تیار کر لئے ہوں تو کام شروع کر دو، میں بٹیا کے لئے چائے بنا دوں ذرا۔ پھر اس سے فارغ ہو کر آتی ہوں۔

جو کسر رہ جائے گی ساری پوری کر دوں گی۔

نسیم آگے بڑھی اس نے دودھ کا برتن نادرہ کے ہاتھ سے چھین لیا اور تڑ سے صحن میں پھینک دیا اور کہا، دیکھنا ابا جی کیسی خبر لیتے ہیں آج تمہاری؟"

اور پھر سیدھی تیر کی طرح اپنے کمرے میں چلی گئی!

(۸)

نادرہ کو جلال آگیا۔

وہ اس گھر کی پرانی خادمہ تھی، اس نے یہاں کا نمک کھایا تھا اور چھوٹے بڑے ہر ایک کی دل و جان سے خدمت کی تھی۔ اس گھر میں اس نے بہت سے منظر دیکھے تھے، اچھے بھی اور برُے بھی، اس نے مریم کو دلہن بن کر آتے بھی دیکھا تھا اور کلثوم کو بھی وہ نسیم کی احسان شناس بھی تھی اور زلیخا کی بھی، اس نے رابعہ کا بھی
روپ دیکھا تھا اور صفدر، ارشاد اور اعجاز کا بھی اس نے احمد کی چاکری بھی کی تھی اور امتیاز کی بھی۔ ان سب کے اوضاع و اطوار، عادات و خصائص اور حرکات و سکنات شب و روز اس کی نظر میں تھے، ایک زمانہ تھا۔ کہ دل امتیاز سے نفرت کرتا تھا۔ اور مریم کے لئے خون کے آنسو روتا تھا۔ زلیخا کے لئے پھٹا جاتا تھا اور اعجاز کے لئے تڑپا کرتا تھا۔ پھر جب مریم مرگئی تو وہ اور زیادہ زلیخا کی طرف مائل ہوگئی اور جب امتیاز نے اپنی روش بدلی اور اعجاز کی چاکری بھی دلوں جان سے کرنے لگی، اس سے ہمدردی پیدا ہوگئی۔ اس کی تکلیف پر کڑھنے لگی، جب وہ بیمار تھا۔ اس کا صرف ایک کام رہ گیا تھا۔ وہ دل و جان سے اپنے آقا کی خدمت میں لگی ہوئی تھی۔ نہ اسے اپنا ہوش تھا۔ نہ کسی دوسرے کا پھر بھی جہاں تک ہوتا وہ اپنی ذمہ داریاں انجام دینے کی کوشش

کرتی رہتی۔ لیکن آج کے واقعہ نے اُسے حواس باختہ کر دیا اس کے لئے ضبط کرنا دشوار ہو گیا۔ اس نے بغیر کسی جھجک کے کلثوم سے کہا۔

"بی بی سلام ہے ایسی نوکری کو، میں باز آئی!"

کلثوم کا پارہ چڑھ گیا۔ اور ساتھ ہی ساتھ پاؤں کے نیچے سے زمین بھی نکل گئی۔ اتنی کارگزار، فرض شناس اور محنتی ساتھ ہی ساتھ سستی ملازمہ کہاں مل سکتی تھی۔ یہ چلی گئی تو کیا ہوگا۔ گھر کا کام کس طرح چلے گا، کچھ خجالت اور کچھ برہمی کے لہجہ میں کہا۔

"کچھ دیوانی ہوئی ہے؟"

وہ بولی۔ "ہاں میں دیوانی ہو گئی ہوں۔ اب مجھے نہ یہاں رہنا ہے نہ کام کرنا ہے۔ میں نے آج تک کی تنخواہ معاف کی۔ میرا کہا سنا معاف کرنا۔

پھر وہ رابعہ سے مخاطب ہوئی اور کہنے لگی۔

لیکن جب تک بڑے صاحب (امتیاز) اچھے ہو کر نہیں آجاتے یہاں کا کام برابر کرتی رہوں گی۔

کلثوم نے کہا۔" اگر تو نے نوکری چھوڑ دی ہے، تو اس گھر میں قدم بھی نہیں رکھ سکتی۔"

وہ بولی۔" آپ کی طرف قدم نہیں رکھوں گی، لیکن بڑے صاحب کی طرف آنے سے اور وہاں کا کام کرنے سے مجھے کون روک سکتا ہے

کلثوم نے سینہ ٹھونک کر کہا، ہم روکیں گے۔

رابعہ نے ان دونوں کی جنگ میں کوئی حصہ اب تک نہیں لیا تھا اب وہ بولی۔

خدا کے لئے رحم کرو۔ ان باتوں کا کیا فائدہ ہوگا۔

وہ ہسپتال میں بیمار پڑے ہیں، کتنے شرم کی بات ہے کہ ان کے لئے یہاں سے کھانا بھی نہیں جا سکتا۔ ذرا سی چائے کے لئے!"

نادرہ بولی۔ وہ تو جائے گا۔ ابھی الٹے پاؤں بھاگی ہوئی جاتی ہوں

اور دودھ لے کر آتی ہوں۔ دیکھ لینا پلک جھپکنے میں کھیر تیار ہوگی اور خدا نے چاہا تو ٹھیک وقت پر انہیں پہنچا آؤں گی۔ تم ذرا بھی فکر نہ کرو۔

رابعہ کو حوصلہ مل گیا، کہنے لگی "ہاں میری بہن۔ جلدی سے دودھ لے آ کافی دیر ہو گئی ہے۔

"ابھی لائی۔" یہ کہہ کر نادرہ نے زمین پر گرا ہوا برتن اٹھایا، اسے جلدی جلدی دھویا اور چلی گئی، اس کے جانے کے بعد کلثوم نے کہا: "بھئی تم تو بڑی سبز قدم بن کر آئی ہو اس گھر میں جب سے قدم رکھا ہے آفتیں نازل ہو رہی ہیں، آخر اپنے گھر کب جاؤ گی!"

"وہ بولی یہ بھی تو میرا گھر ہے، کیا کسی غیر کا ہے؟"

کلثوم نے جواب دیا، نہیں کسی غیر کا کیوں ہوتا۔ ماشاءاللہ جب بھائی صاحب تمہارے ہیں تو یہ گھر کیسے تمہارا نہیں ہے؟"

وہ جل کر بولی۔ اچھا یہی سہی۔ یہ نہ بھولو کہ آسمان کا تھوکا منہ پر آتا ہے تمہیں میرے منہ سے بھی کوئی ایسا لفظ نکل گیا تو روتی پھرو گی۔

○

(۹)

نہ جانے کیا نسیم نے باپ سے جا کر لگایا. کہ احراز جواب تک کمرہ میں بیٹھا تھا. باہر آیا۔ اس نے نفرت اور حقارت سے بھری ہوئی ایک نظر رابعہ پر ڈالی پھر کلثوم سے کہا۔

کیا ہو رہا ہے یہاں اتنی دیر سے ؟

" وہ بولی ،، شامت آئی تھی. جو اس طرف نکل آئی ـــ نادرہ بھی ہاتھ سے گئی۔

(چونک کر) نادرہ کو کیا ہوا ؟"

" اس نے نوکری چھوڑ دی۔"

" یہ کیوں ؟ اس کی یہ جرأت ؟

" جرأت دلائی گئی تو پڑی ، اس کا کیا قصور ؟"

جرأت کس نے جرأت دلائی

" (رابعہ کی طرف اشارہ کر کے)" گھڑی تو ہیں تمہارے سامنے ۔ ہمارے ہاں کام نہیں کرے گی۔ صرف یہاں کا کام کیا کرے گی ؟ مارے ہنٹر کے کھال ادھیڑ دوں گا حرامزادی کی ۔ وہ ہے کہاں دودھ خریدنے کے لئے بھیجی گئی !

اب تک کلثوم اور احراز میں باتیں ہو رہی تھیں. اب احراز نے رابعہ سے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

آپ کو اس طرح کی باتیں کرتے ہوئے شرم آنی چاہیے آپ تو اس گھر میں ایک زندہ ـ ہنگامہ، ایک طوفان بن کر آئی ہو۔

رابعہ نے کہا، تمہاری بیٹی مجھے گالیاں دے کر گئی ہے، تمہاری بیوی جتنی صلواتیں سنا سکتی تھیں جی بھر کے سنالیں، جو رہی سہی کسر ہو وہ تم پوری کر لو۔ وہ بھی سن لوں گی، لیکن بات کیا ہے یہ بھی تو سن لو!"

اور پھر رابعہ نے ساری کہانی از اول تا آخر سنا دی۔ اس کے بعد گویا ہوئی۔

ذرا کلیجہ پر ہاتھ رکھ کر جواب دو۔ کیا میری یا نادرہ کی کوئی خطا ہے کوئی غلطی ہے۔

لیکن رابعہ کی باتوں سے احراز مطمئن نہیں ہوا۔ اس نے کہا۔

نادرہ کی خطا تو یہ ہے کہ اس نے بدزبانی کیوں کی؛ اور آپ کی خطا یہ ہے کہ اسے شہ کیوں دی، اور یہ دونوں خطائیں ناقابل معافی ہیں۔

لیکن بیچ میں بھائی صاحب ہیں، وہ جب تک ہسپتال سے نہیں آجاتے میں خاموش رہوں گی۔ اس کے بعد انہی سے بات ہو گی۔ خواہ اس کا نتیجہ کچھ کیوں نہ نکلے۔

پھر اس نے کلثوم سے کہا۔

بھائی صاحب کے ہسپتال سے آنے کے بعد نادرہ کو سزا بھی ملے گی اور یہاں رہنے بھی نہیں پائے گی اور اگر اسے رکھنے پر اصرار کیا گیا۔ تو اس وقت فیصلہ بھی ہو جائے گا، تم کسی اور ملازمہ کا انتظام کر لو۔

وہ بولی!

"ہاں بس آج کی تکلیف ہے کل کوئی ملازمہ ضرور آجائے گی۔"

احراز چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی زلیخا آگئی۔ رابعہ نے بیقرار ہو کر پوچھا

خیر تو ہے میری بچی۔ تو کیسے آگئی اس وقت؛ بھائی صاحب تو اچھے ہیں۔

وہ سنجیدگی اور افسردگی کے ساتھ بولی۔

"جیسے تھے ویسے ہی ہیں۔ اس وقت سو رہے ہیں، ڈاکٹر نے خواب آور دوا دی ہے میرے کپڑے بڑے چکٹ ہو گئے ہیں۔ سوچا بدل لوں جا کر۔"

وہ مستعدی اور آمادگی کے ساتھ گویا ہوئیں۔

ابھی پانی گرم کئے دیتی ہوں۔

وہ بولی:" آپ کیوں یہ تکلیف کریں۔ میں خود کر لوں گی۔

"لیکن خالہ اماں، ابا جی کی کھیر؟"

"نادرہ دودھ لینے گئی ہے؟"

"اب؟"

بس آتی ہی ہوگی، وہ تو کب دودھ لے کر آ گئی تھی۔ لیکن دیکھ!

رابعہ نے جدھر اشارہ کیا تھا۔ زلیخا نے اس طرف دیکھا، لیکن کچھ سمجھ نہ سکی، کہنے لگی۔

"کیا بات ہے خالہ جان؟ یہاں تو کچھ پانی سا بہا ہوا نظر آتا ہے!"

نہیں بیٹی، پانی نہیں دودھ ہے!

زلیخا کے استفسار پر آخر انہیں ساری داستان سنانا پڑی وہ رابعہ سے زیادہ بے بس تھی۔ صبر کر کے خاموش ہو رہی اور باورچی خانے کے میں نہانے کے لئے پانی گرم کرنے چلی گئی۔

(۱۰)

نہا دھو کر کپڑے بدل کر جب غسل خانے سے باہر آئی تو نادرہ کھیر تیار کر چکی تھی۔ اس کی اس مستعدی اور کارگزاری سے بہت خوش ہوئی کہنے لگی۔

تمہارا نام نادرہ کی بجائے بجلی ہونا چاہیئے تھا۔ کتنی جلدی سارا کام کر ڈالا۔

کوئی اور وقت ہوتا تو اس خراج تحسین پر نادرہ کی باچھیں کھل جاتیں لیکن نسیم اور کلثوم کی باتوں نے اس کے دل میں زخم ڈال دیا تھا۔ چپ رہی کچھ نہیں کہا۔

زلیخا نے کہا۔

میں ابھی ہسپتال جا رہی ہوں، اگر کوئی کام نہ ہو تو چلو ساتھ چلے چلیں گے۔

زلیخا کا مقصد یہ تھا کہ راستہ میں اور ہسپتال میں اس کی کچھ دلجوئی کرے گی، نادرہ راضی ہو گئی کہنے لگی۔

ہاں ٹھیک ہے۔ میں بھی چلتی ہوں، یہاں تو اب کوئی کام ہے نہیں

زلیخا اور نادرہ ہسپتال جانے کے لئے تیار ہو گئیں۔ زلیخا آگے آگے اور نادرہ پیچھے پیچھے زلیخا کے ہاتھ میں کچھ کتابیں، نادرہ کے سر پر سینی۔

یہ دونوں کمرہ سے نکل کر صحن میں آئیں، اور باہر کے دروازہ کی طرف

بڑھی ہی تھیں کہ نسیم تیز تیز چلتی ہوئی آئی۔ اور راستہ روک کر کھڑی ہو گئی۔

زلیخا نے پوچھا۔

"کیا بات ہے نسیم؟"

وہ بولی "بات کیا ہوتی۔ یہ حرامزادی نادرہ نہ اس گھر میں رہ سکتی ہے نہ یہاں کسی کا کام کر سکتی ہے۔ اس نے ہماری نوکری چھوڑ دی۔ ہم نے اسے گھر سے نکال دیا۔

، زلیخا نے جواب دیا "بہت اچھا کیا نکال دیا۔ اب وہ صرف ہمارے ہاں کام کرے گی۔"

" نسیم بولی۔" یہ بھی نہیں ہو سکتا۔ ہمارا باغی اس گھر کے کسی گوشہ میں پناہ نہیں پا سکتا۔

"تو تمہارا مطلب ہے میں نکال دوں اسے؟"

"ہاں یہی مطلب ہے!"

اس کی خطا؟ اس کا قصور؟ اس کا جرم؟

" اس نے ہمارے لئے چائے نہیں بنائی اور دودھ کے لئے بازار کے پھیرے پر پھیرے کرتی رہی۔"

لیکن وہ تو آباجی کے لئے کھیر ——————

نہ ہمیں تم سے مطلب ہے، نہ تمہارے اباجی سے، نہ کھیر سے، نہ پلاؤ زردے سے نہ متنجن مزعفر سے!"

"کیا میرے اباجی تمہارے کوئی نہیں ہیں۔"

"یہی سمجھ لو۔"

"پھر تمہارا مطلب کیا ہے؟"

چاہتی کیا ہو؟

نادرہ کی صورت دیکھنا نہیں چاہتی وہ یہاں اس گھر میں نہیں رہے گی!"

اچھا اس وقت تو جانے دو اسے، یہ فیصلہ واپسی پر کر لینا۔

جب تک یہ فیصلہ نہ ہو جائے کہ یہ واپس نہیں آئے گا۔ میں نہیں

بانے دوگی۔ اس کے سر پر جو کچھ ہے پھینک دوں گی، تبابٹے دیتی ہوں!
اس کے سر پر تو اباجی کا کھاتا ہے، کیا اسے بھی پھینک دوگی؟
ہاں اسے بھی پھینک دیں گے۔

"مجرم میں ہوں، خالہ اماں ہیں، نادرہ ہے، ان بیچارے نے کیا ہے۔ وہ تو ہسپتال میں بیمار پڑے ہیں؟"

ہاں اور کیا بیچارے ہسپتال میں بیمار پڑے ہیں۔ لیکن کھیر کے شوق میں مرے جارہے ہیں۔ بیچارے بیمار پڑے ہیں۔ لیکن صاحبزادی صاحبہ سولہ سنگار کر کے گشت کو نکلی ہیں۔ بے چارے مرے جارہے ہیں۔ لیکن صاحبزادی کی ساس صاحبہ، اور اس بیچارے کی محبوبہ تر مال پکا رہی ہیں۔ کھا رہی ہیں، کھلا رہی ہیں۔

کیا خوب ہیں وہ بیچارے اور کیا خوب ہے ان بیچارے کی بیماری!
اپیل کے انداز میں زلیخا نے کہا" نسیم یہ تم کہہ رہی ہو؟" یہ الفاظ تو ایسے موقعہ پر کسی دشمن کے منہ سے بھی نہیں نکل سکتے!"

"یہاں دوستی کا دعویٰ کسے ہے، دشمن ہی سمجھ لو!" قیامت قریب آگئی ہے
ہاں بہت قریب آگئی ہے اور بہت جلد نمودار ہونے والی ہے؟"
اگر نادرہ نے بوریا بستر نہ اُٹھایا!

زلیخا کچھ دیر خاموش رہی، پھر اس نے نادرہ سے کہا۔
اپنا بستر ساتھ لے لو۔ تم ہسپتال رہنا، میں یہاں رہوں گی۔ خدا باجی کو تندرست کر دے۔ اگر وہ اپنے ساتھ لائیں تو چلی آنا، نہ لائیں تو جہاں جی چاہے سدھار جانا۔

خدا کی چکی

دیر میں پیستی ہے لیکن بہت
باریک پیستی ہے

(۱)

نادرہ اپنا بستر اور کپڑے لیتے سینی وہیں رکھ کر چلی گئی نسیم اب تک پیکر قہر و جلال اور مجسمۂ خشم و عتاب بنی کھڑی تھی جیسے بس چلے تو نادرہ کو ابھی قتل کر دے اور زلیخا کو کچا چبا جائے اور رابعہ کے تکے بوٹی کر دے، لیکن زلیخا نے اس کی بات مان لی تھی، فیصلہ کر لیا تھا کہ نادرہ ہسپتال میں رہے گی۔ اور وہ گھر میں اب کس بات پر لڑتی؟

اسی اثنا میں یکایک دروازہ کھلا۔ اور اعجاز نمودار ہو گیا۔ اعجاز کو دیکھتے ہی زلیخا بیتابی کے ساتھ اس کی طرف لپکی۔

بھیا آپ آ گئے۔

اعجاز نے اس کا سر اپنے سینہ سے لگا کر اور محبت سے پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

ہاں میں، میں کافی دیر کا آیا ہوا ہوں دروازہ میں قدم رکھا تو دنگے اور فساد کی آوازیں کانوں میں آئیں، وہیں ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا اور دروازے کی اوٹ سے مہابھارت کا تماشہ دیکھنے لگا۔

یہ کیسی لڑائی تھی زلیخا۔ زلیخا نے بات ٹالنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

" کچھ بھی نہیں، گھروں میں یہ ہوتا ہی رہتا ہے کہا۔

لیکن اعجاز کی تسلی نہیں ہوئی۔ اس نے کہا۔

مگر ابا جی کا نام بھی بیچ میں کئی بار آیا: وہ کہاں ہیں، کیسے ہیں،"

زلیخا کو بات کے پلٹنے کا موقعہ مل گیا۔ آنکھوں میں آنسو بھر کر بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

"وہ ہسپتال میں موت سے لڑ رہے ہیں بھیا؟"

اور پھر وہ اس کے سینہ سے لگی سسکیاں لے لے کر رونے لگی اعجاز کی حالت بھی متغیر ہو گئی۔ اس نے کہا۔

"خدا کے لئے بتاؤ کیا بات ہے؟"

زلیخا نے مختصر طور پر ساری داستان سنادی اور کہا۔

بھیا وہ ہوش وحواس کھو بیٹھے ہیں۔ انہیں کوئی بات یاد نہیں رہتی وہ سب کو بھول چکے ہیں۔ لیکن اعجاز کی یاد میں ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہے ہیں۔

"وہ یاد کرتے ہیں؟"

"ہاں۔ بہت زیادہ ہر وقت"

وہ بالکل نہیں۔ بھیا انہوں نے آپ کو معاف کر دیا۔

"انہوں نے مجھے معاف کر دیا؟"

ہاں بھیا۔ بالکل معاف کر دیا۔ وہ کہتے ہیں۔ اعجاز کی کوئی خطا ہی نہیں تھی۔ وہ کہتے ہیں میرا لڑکا بڑا خود دار ہے بڑا باغیرت ہے مجھے اس پر فخر ہے۔ ناز ہے، وہ مجھ سے اس نہیں روٹھا کہ مجھے سے نفرت کرتا تھا، اس لئے خفا ہوا کہ اپنی ماں سے محبت میں مجھ سے خفا ہوا مجھے اپنے جرم کا اقرار ہے اس جرم پر میں شرمسار ہوں۔ خود مجھے اپنے آپ سے نفرت ہونے لگتی ہے۔

سلسلۂ گفتگو جاری رکھتے ہوئے اس نے کہا۔ بھیا میں غلط نہیں کہتی وہ آپ ہی غم میں بیمار پڑے ہیں۔ آپ کی فرقت نے انہیں زندہ درگور کر دیا ہے، وہ بھی تو آخر آپ کے باپ ہیں۔ ان کی خودداری نے اس کی اجازت نہ دی کہ آپ کا تعاقب کریں۔ آپ کو بلائیں۔ لیکن وہ برابر آپ کو یاد کرتے رہے اور یاد کر کے روتے رہے۔

زلیخا۔ یہ میں کیا سن رہا ہوں ؟"

" بھیا میں غلط نہیں کہتی !"

" لیکن سچ بھی کس طرح مان لوں ؟

ماننا ہی پڑے گا، وہ اب بالکل بدل گئے ہیں سچ مچ بدل گئے ہیں

" بدل گئے ہیں ؟

ہاں ۔ بہت زیادہ، اب وہ ہر وقت امی کو یاد کیا کرتے ہیں ۔ ان کی یاد میں آہیں بھرتے ہیں ۔ ان سے ملنے کے لئے مرنے کی دعائیں کرتے رہتے ہیں ۔

کیا واقعی زلیخا ؟

جی بھیا، اب وہ مجھے بھی بہت چاہنے لگے ہیں۔ بہت۔ میری جتنی دلجوئی انہوں نے کی ہے جس محبت، پیار اور شفقت کا برتاؤ کرتے رہے ہیں۔ اگر امی زندہ ہوتیں تو وہ بھی اس سے زیادہ نہیں کر سکتی تھیں "

وہ تجھے چاہتے ہیں اب — واقعی ؟

" چاہنے کی کوئی حد نہیں بھیا۔ وہ میرے باپ نہیں ماں بھی ہیں — صرف میرے ہی نہیں، آپ کے بھی !"

" میرا نام نہ لو، میں بہت نالائق ہوں "

یہی اکثر میں بھی سوچا کرتی تھی ۔ جیسے جیسے ابا جی کی محبت بڑھتی گئی میں آپ سے خفا ہوتی گئی ۔ لیکن ان کے دل کو دیکھئے ۔ وہ آپ سے ایک لمحہ کے لئے بھی خفا نہیں ہوئے ۔"

" زلیخا یہ میں سن رہا ہوں !؟"

کئی دن سے انہیں رٹ لگی ہوئی ہے کہ اعجاز آ گیا ہے ۔ میں نے خود اُسے دیکھا ہے لیکن وہ چلا گیا۔ کہیں وہ مجھ سے پھر تو خفا نہیں ہو گیا کہیں تو نے اس سے لڑائی تو نہیں کی ۔ میں جھوٹ بول کر انھیں سمجھاتی ہوں، بہلاتی ہوں، دھوکا دیتی ہوں ۔ کبھی کہتی ہوں دوا لینے گئے ہیں وہ کبھی بتاتی ہوں ۔ آ رہے ہیں ۔ کبھی کہتی ہوں، ڈاکٹر سے حال کہنے گئے ہیں وہ

دروازے کی طرف تکتے رہے ہیں کہ میرا بیٹا آکر پھر کہاں چلا گیا۔
زلیخا چلو، مجھے ان کے پاس لے چلو؟"
چلیے "آپ کو دیکھ کتنے خوش ہوں گے۔ آپ اندازہ بھی نہیں کر سکتے آپ کو دیکھ کر ان کی آدھی بیماری چلی جائے گی۔ آپ کو دیکھ وہ اچھے ہو جائیں گے بھیا؟
تم تو تقریر کئے جا رہی ہو، چلتیں کیوں نہیں"
نادرہ کو تو آ لینے دیجئے۔
اتنے میں نادرہ آگئی۔ اعجاز کو دیکھ کر پھول کی طرح کھل گئی۔ رابعہ بیگم اپنے کمرہ میں رونق افروز تھیں نسیم اور زلیخا کی باتیں سن سن کر ہول رہی تھیں۔ نادرہ نے انہیں آواز دی، ہڑبڑا کر اٹھیں کہ خدا جانے کیا حادثہ رونما ہو گیا۔ اب تو وہ ہر وقت کسی خوفناک حادثہ کے انتظار میں رہتی تھیں۔ لیکن صحن میں آکر ان کی نظریں اعجاز پر پڑیں، اسے دیکھتے ہی رابعہ شفقت کے ساتھ آگے بڑھیں اور کلیجہ سے لگا لیا۔ پھر پھکوں پھکوں رونے لگیں۔ کہنے لگیں۔
میرے لال تو کہاں چلا گیا تھا۔ تو نے روپوش ہو کر اپنے باپ کو نیم جان کر دیا۔ تو آپا کے لئے ان سے خفا ہوا۔ لیکن یاد رکھ اگر تو نہ آتا اور خدانخواستہ بھائی صاحب کی آنکھیں بند ہو جاتیں تو ہر گز آپا تجھے معاف نہ کرتیں کیا تو بھول گیا، وہ ان کی عزت و احترام کی کتنی تاکید کرتی رہتی تھیں تم بھائی بہن کو۔
اعجاز نے آشفتہ خیالی کے ساتھ یہ جواب دیا۔
سب یاد ہے خالہ اماں واقعی میں بڑا نالائق ہوں۔ میں ابھی جاتا ہوں میں نے جو کیا اس پر حد درجہ نادم ہوں میں ابھی جاتا ہوں اور ان سے معافی مانگوں گا۔ ان کے قدموں پر سر رکھ دوں گا۔ جب تک وہ معاف نہیں کریں گے۔ میرا جھکا ہوا سر نہیں اٹھے گا۔
نادرہ نے ٹوکا۔ اچھا یہ باتیں پھر ہوتی رہیں گی، دیر ہوتی جا رہی ہے چلتے ہو تو چلو، ورنہ میں چلی؟"

تینوں ہسپتال روانہ ہو گئے، نسیم ابھی تک اس جگہ کھڑی تھی لیکن گُم سم، حیران اور ششدر

○

(۲)

نادرہ اور زلیخا کے ساتھ اعجاز ہسپتال کی طرف روانہ ہوا
لیکن اس وقت اس کی عجیب کیفیت تھی؟
آج وہ اپنی پچھلی زندگی کا جائزہ لے رہا تھا۔

آج اسے بہت سی بھولی بسری باتیں یاد آرہی تھیں۔ ماں کی محبت باپ کی سفاکی، بہن کی مظلومیت اور خاندان کی بے حسی اور بے تعلقی پھر ماں کا انتقال، جذبۂ نفرت کی نشو ونما پھر اس کی دھنسی ہوئی قبر دیکھ کر اشتعال، باپ سے بے انتہا نفرت، پھر زلیخا کی باتیں، نسیم کا زیور چچا سے صاف صاف باتیں، تلخی، بدمزگی، پھر چوری کی تہمت، باپ کی شعلہ سامانی، جلاوطنی، بلا ٹکٹ سفر، ایک نئے شہر میں ورود، ایک عجیب انسان کے دامن میں پناہ کالج میں داخلہ، محنت، کامیابی، پھر خود ہی اپنے مربی اور محسن کے فیض صحبت سے فکر و نظر کی اصلاح اپنے گذشتہ طرز عمل پر ندامت، باپ سے معافی مانگنے، اس کی خدمت کرنے اور اس کے قدموں کے تلے رہنے کا فیصلہ کر کے کئی سال کے بعد واپسی وطن اور یہاں آکر زلیخا اور نسیم کی جنگ کا نظارہ۔

یہ ساری باتیں اس کے دماغ کو پریشان کر رہی تھیں آخر اس سے ضبط نہ ہو سکا، زلیخا سے پوچھا۔

کیوں زلیخا، یہ نسیم کچھ بدلی بدلی سی معلوم ہوتی ہے، ہے نا؟

وہ بولی "کچھ؟" بھیا وہ تو نہ جانے اپنے آپ کو کیا سمجھنے لگی ہے۔ ہم لوگوں کو تو اس قدر ذلیل کرتی ہے کہ بعض وقت خودکشی کو جی چاہنے لگتا ہے۔ اور میں تو سب کچھ سہہ بھی لوں لیکن جب وہ خالہ اماں بیچاری کی سات پشتیں کھنگالنے لگتی ہے تو اتنا دکھ ہوتا ہے کہ کیا کہوں؟ بڑی شرم آتی ہے اور ان غریب کی حالت دیکھ کر تو کلیجہ مونہہ کو آنے لگتا ہے۔"

"وہ کچھ سوچتا ہوا بولا۔ سخت تعجب ہے؟

"تعجب کیوں ہے بھیا؟"

جب میں گیا تھا، تب تو وہ ایسی نہیں تھی!"

لیکن آپ کے جانے اور آنے کی مدت میں زمانہ بہت آگے بڑھ چکا ہے۔ بہت سی تبدیلیاں ہو چکی ہیں۔ بہت سے تغیرات عمل میں آ چکے ہیں۔"

"ہو گا بھئی؟"

تو کیا آپ کو یقین آتا؟

نہ بھئی آئے تو آنکھوں کو اور کانوں کو کہاں تک جھٹلا سکتا ہوں۔

صفدر پر تو اسے اتنا غرہ ہے کہ بس کچھ نہ پوچھئے؟

"صفدر — ؟"

"ہاں اس کا ماموں زاد بھائی سے تو منگنی ہوئی ہے۔"

"آپ جانتے تو ہیں صفدر کو!"

ہاں بہت اچھی طرح۔ لیکن کیا چچا بھی اسے نہیں سمجھاتے کہ تم سے اور نادرہ سے ایسا برتاؤ نہ کیا کرے؟"

وہ ان سب سے بھی دو ہاتھ آگے ہیں؟"

پھر چچی تو دو گز آگے ہوں گی؟

(ہنستے ہوئے)۔ جی ہاں اور کیا۔ بلکہ دو سو گز۔"

تو یہ گھر چھوڑ کیوں نہیں دیتیں تم"؟

کیوں چھوڑ دوں! کیا صرف ان کا ہے؟ ہمارا نہیں ہے؟"

(مسکراتے ہوئے) معلوم ہوتا ہے تم بھی فسادی ہو گئی ہو؟

"تھی تو نہیں، لیکن جیسے کو تیسا بننا ہی پڑتا ہے!"

"لیکن یہ کوئی اچھی بات تو نہیں ہے؟"

بہت چپ رہی، بہت ظلم سہے۔ مجھ پر ان لوگوں نے جو ظلم توڑے ہیں، آپ سنیں تو رونے لگیں۔"

"واقعی!"

"ہاں بھیا! یہ جان کر اباجی میری خبر نہیں لیتے اس گھر میں میرا کوئی ہمدم اور دمساز نہیں۔ ان ماں بیٹی نے ناکوں چنے چبوائے ہیں، کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا تھا۔ وہ تو میں ہی اتنی سخت جان تھی کہ بچ گئی۔"

"خالہ اماں کب آئیں ۔؟"

کافی دن ہو گئے انہیں آئے ہوئے۔

لیکن وہ اکیلی ہی آئی ہیں۔ ارشاد نہیں آیا ان کے ساتھ؟"

زلیخا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ذرا دیر انتظار کے بعد اعجاز نے پھر وہی سوال دوہرایا۔ لیکن اس دفعہ بھی زلیخا نے چپ سادھے رکھی نادرہ نے حقیقت کے چہرے سے پردہ اٹھاتے ہوئے کہا۔

آئے تھے، ابھی گئے ہیں چند دن ہوئے۔ کچھ خبر بھی ہے تمہیں؟"

"اخبار تو تم ہو، کوئی نئی بات اور تازہ خبر سناتی ہو۔؟"

"ہاں بڑے مزے کی!"

"تو انتظار کا ہے کا ہے؟"

"منہ میٹھا کرنے کا وعدہ کرو پہلے!"

وعدہ کرنے میں کیا بگڑتا ہے ——— کر لیا وعدہ

"ارشاد سے زلیخا کی شادی ہو گئی؟"

"(حیرت سے) واقعی؟" پھر تعجب پر غالب آتا ہوا گویا ہوا۔ نہیں منگنی ہوئی ہو گی، اتنی جلدی شادی کیسے ہو سکتی ہے؟"

وہ تو ہو بھی گئی۔ بڑے صاحب کو بڑی جلدی تھی، وہ بضد تھے کہ یہ رشتہ جلد از جلد ہو جائے۔

اچھا تو یہ بات ہے۔ یہ بات ہے اس لئے یہ میرے سوال کا جواب نہیں دے رہی تھی!

"ہاں اور کیا شرماتی ہے!" اتنے میں ہسپتال آگیا۔

نادرہ نے سبق پڑھایا۔

"بس جاتے ہی قدموں پر گر جانا، سارے گلے، شکوے آن کی آن میں ختم ہو جائیں گے۔"

(۳)

ہسپتال آگیا۔

اعجاز باپ کے کمرے میں پہنچا، بہت سی آرزوؤں اور تمناؤں کا پشتارہ لے کر لیکن باپ سے نہ مل سکا۔

دو گھنٹے سے امتیاز بے ہوش پڑا تھا۔ ڈاکٹروں کی تشخیص، یہ تھی کہ ہمیرج ہوگیا ہے۔ یعنی دماغ کی رگ پھٹ گئی ہے وہ پہلے بھی اس کی زندگی سے مایوس تھے۔ اب تو انہوں نے صاف جواب دے دیا اور کہہ دیا، بس اب منٹوں، یا بہت سے بہت گھنٹوں کا معاملہ ہے۔"

امتیاز بستر علالت پر اس طرح دراز تھا جیسے سو رہا ہو۔

آج کتنے دنوں کے بعد اعجاز نے باپ کی صورت دیکھی تھی۔

وہ پُر جلال چہرہ جس کی ہیبت سے سارا گھر اور خاص کر اس کے متعلقین بید لرزاں کی طرح کانپا کرتے تھے، بے کسی اور بے بسی کی تصویر بنا ہوا تھا۔ نہ وہ اپنے ہاتھوں کو جنبش دے سکتا تھا نہ پیروں کو، نہ آنکھ کھول سکتا تھا۔ نہ بات کر سکتا تھا۔ نہ کسی کو پہچان سکتا تھا۔ نہ کسی طرح کی ہدایت دے سکتا تھا۔ مردے سے بھی بدتر۔

یہ منظر دیکھ کر اعجاز کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔

جب وہ یہاں سے گیا تھا باپ کے خلاف نفرت کا طوفان لے کر گیا تھا۔ اب آیا تھا تو باپ کے لئے عقیدت اور محبت کی پونجی لے کر آیا تھا۔ جب وہ گیا تھا تو باپ زندہ تھا۔ اب آیا تھا تو وہ لب گور اور جاں بلب تھا۔

اس کا جی چاہا، اپنے باپ سے معافی مانگے، اس کے قدموں پر سر ڈال دے، اس کی پیشانی کو بوسہ دے، اس کے ہاتھوں کو آنکھوں سے لگائے، اس سے عہد کرے کہ اب زندگی بھر وہ صرف اس کی خدمت کرے گا۔

اس سے کہے کہ جس نفرت کا پشتارہ میں اپنے ساتھ لے کر گیا تھا اسے ایک گہرے اور اندھے کنوئیں میں دفن کر آیا ہوں۔ اب میرے پاس نفرت نہیں ہے صرف محبت ہے۔

لیکن کس سے کہتا، جس سے کہنے کی حسرت اور آرزو تھی وہ تو بستر مرگ پر دراز تھا۔

کاش وہ اسے دیکھ لیتا چند ہی لمحے سہی، اس سے باتیں کر لیتا، اپنی کہہ لیتا اس کی سن لیتا، لیکن قضا و قدر کا فیصلہ اٹل ہوتا ہے، وہ آیا، لیکن اس وقت جب ہر موقع ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ اب کون تھا جو اس کی معذرت قبول کرتا؟ کون تھا جو اس کی غلطی کو معاف کرتا۔ کون تھا جو اس کی ندامت سے متاثر ہوتا؟

کوئی نہیں۔ وہ جو یہ سب کچھ کر سکتا تھا۔ اب اس عالم فانی سے عالم بالا کی طرف کوچ کر رہا تھا۔

دفعتہً وہ باپ کے قدموں پر گرا اور اس کے تلوؤں سے آنکھیں ملنے لگا۔ وہ بے تحاشا رو رہا تھا۔ لیکن پھوٹ پھوٹ کر نہیں آنکھوں سے جوئے اشک رواں تھا لیکن لب خاموش تھے۔

زلیخا کی حالت اعجاز سے بھی زیادہ ابتر تھی۔

اس پر سکتہ کی سی کیفیت طاری تھی نہ وہ رو سکتی تھی نہ اپنی جنبش

کر سکتی تھی۔ مگر باپ کی طرف دیکھے جارہی تھی اور بالکل یہی کیفیت نادرہ کی تھی۔ بینی اس کے سر پہ رکھی تھی اور وہ دیوانوں کی طرح کبھی ادھر دیکھنے لگتی، کبھی ادھر۔

تھوڑے تھوڑے وقفہ سے ڈاکٹر آتے، نبض دیکھتے، انجیکشن لگاتے اور مایوسی کے عالم میں سر کو جھٹکا دیتے ہوئے چلے جاتے اسی طرح دو گھنٹے گزر گئے۔

جس طرح امتیاز موت وزیست کی کش مکش میں گرفتار تھا۔ اسی طرح اعجاز، زلیخا اور نادرہ پر بھی نزع کا عالم طاری تھا!

آخر اعجاز نے اپنے حواس بجا کئے، اس نے اپنے اندر استقامت اور حوصلہ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اس نے زلیخا سے کہا۔

تقدیر کا فیصلہ اٹل ہے۔ ڈاکٹر بھی کہہ گیا ہے جو کچھ ہونے والا ہے وہ اب ہوا ہی چاہتا ہے۔ تم اور نادرہ یہیں رہو۔ میں جاتا ہوں، چچا اور چچی اور خالہ اماں کو اطلاع دے دوں۔ یہ ہمارا فرض ہے ان سب کو اس موقع پر یہاں موجود رہنا چاہیئے۔

اور پھر جواب کا انتظار کئے بغیر چلا گیا۔

اس کے سارے بدن پر رعشہ کی کیفیت طاری تھی۔ وہ دوڑتا، کانپتا ہانپتا گھر پہنچا۔

کلثوم اور نسیم صحن میں بیٹھی تھیں۔ کلثوم کچھ باتیں کر رہی تھی۔ نسیم جواب بھی دے رہی تھی اور کنگھی بھی کرتی جارہی تھی۔ ان دونوں نے سینما جانے کا پروگرام بنایا تھا۔ صرف احراز کا انتظار تھا وہ آئے اور چلیں۔

اعجاز کو دیکھتے ہی نسیم نے کنگھی ایک طرف رکھ کر ہاتھوں سے بال درست کرنا شروع کر دیئے اور ماں سے مخاطب ہو کر کہا۔

لوگوں کو اتنا بھی نہیں معلوم کہ یوں دراندا آتے ہوئے گھر میں نہ گھس آنا چاہیے۔ نہ جانے کوئی کیسے بیٹھا ہے اور دیسے بڑے باتمیز اور

با ادب ہیں۔

کلثوم نے بیٹی سے مخاطب ہو کر کہا۔

" ہاں بیٹی، یہ اندھیر تو اس وقت تک ہوتا رہے گا جب تک دیوار نہیں کھنچ جاتی۔

" چڑتے ہوئے نسیم نے کہا " وہ تو نہ جانے کب کھنچے گی " ؟

دلاسا دیتے ہوئے ماں نے بیٹی کو جواب دیا۔

بس بیٹے اب چند ہی دن میں یہ کام بھی ہو جائے گا۔ تیرے باپ کہہ رہے تھے۔ اس جمعہ کو دیوار کا کام شروع ہو جائے گا۔

اعجاز نے یہ باتیں سنیں اس کے سینہ پر ایک گھونسہ سا لگا غصہ بھی آیا۔ اگر وہی اعجاز ہوتا جو یہاں سے جاتے وقت تھا تو شاید جواب میں کوئی سخت بات کہہ دیتا لیکن اب وہ بالکل تبدیل ہو کر آیا تھا وہ اعجاز مر چکا تھا جو یہاں سے گیا تھا۔ وہ اعجاز جو یہ تلخ اور ترش باتیں سن رہا تھا دوسرا اعجاز تھا۔ شاید بالکل نیا۔

اس نے ان باتوں کا کوئی اثر نہیں لیا۔ بڑی سنجیدگی کے ساتھ گویا ہوا۔

" جی میں یہ کہنے آیا ہوں کہ کئی گھنٹے سے ابا جی بے ہوش پڑے ہیں ڈاکٹروں نے جواب دے دیا ہے اب گھڑی اور پل کا معاملہ رہ گیا ہے وہ میرے باپ ہیں۔ لیکن آپ کے نسیم کے اور چچا جان کے بھی کچھ ہیں اگر آپ چاہیں تو میرے ساتھ چل سکتی ہیں، کسی کو بھیج کر چچا کو بھی اطلاع کر دیجیئے " ۔

کلثوم سے پہلے نسیم نے جواب دیا۔

عورتیں ہسپتال تو جا کر کیا کریں گی۔ وہاں تو مردوں ہی کا کام ہے ابا جی کو فون کر لیا ہوتا۔ یا وہ آئیں گے تو ہم بھیج دیں گے انہیں ؟

اعجاز کو جواب مل گیا۔ پھر اس نے کچھ نہیں کہا۔ خاموشی سے رالعبہ کے کمرے میں پہنچا اور انہیں اپنے ساتھ لے کر ہسپتال روانہ ہو گیا۔

✪

(۴)

اعجاز رابعہ کو لے کر ہسپتال روانہ ہوا۔

دونوں خاموش تھے اور دونوں کے دل میں ایک ہل چل سی برپا تھی — ہل چل نہیں، طوفان؟

نہ جانے ہوئے ہسپتال پہنچ کر سننے میں آئے گا۔ نہ جانے زندگی پر موت غالب آ چکی ہوگی۔ یا اب تک زندگی موت سے لڑے جا رہی ہو گی؟

اعجاز کو سب سے زیادہ صدمہ اس کا تھا کہ وہ ایک دن پہلے کیوں نہ آ گیا؟ کتنے دنوں سے آنے کا پروگرام بنا رہا تھا، لیکن وہ جو ایک جھجک سی تھی۔ پاؤں پکڑ لیتی تھی۔ بندھا ہوا بستر کھول دینے پہ مجبور کر دیتی تھی لیکن جب یہ جھجک دور ہوئی اور واپس آیا تو باپ سے ملاقات نہ کر سکا۔ اس سے باتیں نہ کر سکا۔ اس کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ سن سکا اس نے اپنے باپ کو نیم جان پایا اور اب اس کی موت کی خبر سننے جا رہا تھا۔

لیکن موت خبر سننے کیوں؟

کتنے ایسے مریض ہیں جو موت کے منہ سے بچ کر نکل آتے ہیں۔ کتنے ایسے مایوس العلاج بیمار ہیں جو بالکل تندرست اور چنگے ہو جاتے ہیں۔

کیا یہ بات امتیاز کے ساتھ نہیں ہو سکتی وہ موت کے منہ سے بچ کر نہیں آ سکتا؟

اے کاش —

وہ ہسپتال کی پہلی منزل پر پہنچا۔ ایک ایک سیڑھی کنچن چنگا اور ایورسٹ کی چڑھائی معلوم ہو رہی تھی۔ پھر وہ اسپیشل وارڈ کے اس کمرے کی طرف بڑھا جو اس کے باپ کا مسکن تھا؟

چند قدم کا فاصلہ تھا لیکن یہ ذرا سی مسافت ہفت خواں طے کرنے کے برابر ہو گئی تھی۔

وہ اس کمرے میں پہنچا۔

امتیاز ایک سفید چادر میں لپٹا پڑا تھا۔ زلیخا نیم بے ہوش تھی اور نادرہ اس کے حلق میں پانی ٹپکا رہی تھی۔ ایک نرس جس نے ساری مدت میں بڑی فرض شناسی اور مستعدی کے ساتھ اپنی ڈیوٹی دی تھی خاموش اور مہر بہ لب مریض کی چارپائی کے پاس کھڑی تھی۔

رابعہ تو مچھلی کی طرح تڑپتی ہوئی نادرہ کے پاس پہنچی اور زلیخا کا سر اپنی گود میں رکھ کر نادرہ سے پوچھا۔

"میری بچی کو کیا ہو گیا؟"

لیکن اعجاز نرس کے پاس گیا۔ مگر سب کچھ سمجھ چکنے کے بعد سوال کرنے کے بعد سوال کرنے کی جرأت نہیں ہوئی۔

نرس کو بہر حال اپنا فرض ادا کرنا تھا۔ اس نے کہا۔

افسوس مریض چل بسا۔

اس سے زیادہ سننے کی ضرورت بھی کیا تھی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ ماتم کرے۔ سینہ کوبی کرنے لگے۔ گریبان پھاڑ ڈالے اور خوب چیخ چیخ کر رو دے لیکن وہ مرد تھا اسے دوسرے گرتے ہوؤں کو سہارا دینا تھا۔ اس چھوٹے سے خاندان کا وہی سربراہ تھا۔ اسے عزم و استقلال کے ساتھ قدرت کے اس وار کو سہنا چاہیئے تھا۔ رونے کے لئے ساری

زندگی پڑی ہے لیکن یہ وقت کام کا ہے ؟

وہ رابعہ کے پاس پہنچا اس سے کہا ۔

خالہ اماں آپ کے بھائی صاحب اس دنیا سے رخصت ہو گئے آپ کا بھانجا یتیم ہو گیا ۔ آپ کی بھانجی کے سر پر اب کوئی ہاتھ رکھنے والا نہیں ہے ۔ یہ بہت بڑا غم ہے بہت بڑا صدمہ ہے ۔ لیکن اسے برداشت ہی کرنا پڑے گا ؟ زلیخا کو سنبھالئے میں ضروری انتظامات کے لیئے جاتا ہوں !"

تھوڑی دیر میں اس نے ایمبولینس کا بندوبست کر لیا ۔ اسی ایمبولینس میں زلیخا نادرہ رابعہ اور اعجاز امتیاز کی لاش لے کر گھر پہنچے ، معلوم نہیں احراز کو اطلاع دی گئی تھی یا نہیں ؟

بہر حال وہ گھر میں موجود نہیں تھا ۔ کلثوم اور نسیم صحن میں بیٹھی تبادلۂ خیال میں مصروف تھیں ۔ ان دونوں میں کیا باتیں ہو رہی تھیں ۔ یہ تو اعجاز نہیں سن سکا " دیلار " اور صفدر کے الفاظ ضرور اس کے پردۂ گوش سے ٹکرائے ۔

باپ کی لاش لے کر وہ گھر آیا ، جس کمرہ میں امتیاز با ہزاراں جاہ و تجمل نشست رکھا کرتا تھا ۔ جہاں ہر وقت بزم احباب برپا رہتی تھی جہاں قہقہوں کا شور شب و روز کا پابند نہیں تھا ۔ آج وہاں اس کی لاش ایک سفید چادر میں لپٹی پڑی تھی ۔

اعجاز نے اس مرتبہ کلثوم یا نسیم سے کچھ نہیں کہا ۔ باپ کی لاش لانے کے بعد وہ تجہیز و تکفین کا انتظام کرنے چلا گیا ۔ غسل دینا تھا کفن لانا تھا ۔ سلوانا تھا ۔ قبر کا بندوبست کرنا تھا اور یہ سارے کام جلد از جلد انجام دینے تھے ۔

اعجاز کے جانے کے بعد کلثوم اور نسیم اٹھیں اور امتیاز کے کمرے میں پہنچیں ۔

زلیخا نیم جان ، رابعہ نیم بے ہوش !

کلثوم نے رابعہ اور زلیخا کو گلے لگا کر بہ آواز بلند رونا شروع کیا اب تک زلیخا اور رابعہ ضبط سے کام لے رہی تھیں۔ اب ان کا بند ضبط ٹوٹ گیا اور یہ بھی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ تنہا نادرہ ایسی جو رونے کی مصروفیت میں بھی اور رات کا وقت ہوتے بھی یہ محسوس کیے بغیر نہ رہ سکی کہ کلثوم اور نسیم گو سر پیٹ کر رو رہی تھیں لیکن دونوں کی آنکھوں میں آنسو کا ایک قطرہ بھی نہ تھا۔

(۵)

کئی روز تک گھر پر غم کا سکوت چھایا رہا۔ پھر حالات معمول پر آگئے امتیاز کی وفات کا سب سے زیادہ صدمہ اعجاز کو تھا۔ رہ رہ کر دل میں کھٹک ہوتی تھی کہ اباجی مجھ سے خفا ہو کر دنیا سے رخصت ہوئے ہیں۔ اب میرا انجام کیا ہوگا۔ خدائی بارگاہ سے میری خطا معاف ہوگی۔ یا نہیں، اب وہ خدا سے محبت کرنے لگا تھا۔ اب وہ بالکل نیا انسان بن گیا تھا۔ جس کے دل میں خدا کا خوف تھا۔ بندوں کی محبت تھی۔ اپنوں کی چاہت تھی اور دشمنوں تک کے لئے نفرت نہ تھی۔ یہ سبق اس نے اپنے اس محسن اور مربی سے سیکھا تھا۔ جس نے اپنے گھر میں اسے پناہ دے کر کچھ سے کچھ بنا دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ رہ رہ کر دل میں ہوک اٹھتی تھی اور سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ اپنے مرے ہوئے باپ کو کس طرح خوش کرے۔

ایک روز وہ قبرستان گیا۔ مریم کی قبر کے ساتھ ہی امتیاز کی بھی قبر تھی، زندگی میں میاں بیوی ایک دوسرے سے دور دور رہے، لیکن موت نے انہیں ایسی رفاقت عطا کر دی تھی۔ جیسے یہ دونوں اب کبھی جدا نہیں ہوں گے۔ یہاں یعنی مریم کے پہلو میں دفن ہونے کے لئے امتیاز نے وصیت کی تھی اور اس وصیت کی تھی اور اس وصیت کی تعمیل اعجاز کے ہاتھوں ہوئی تھی۔ وہ یہاں صرف فاتحہ پڑھنے آیا تھا اور یہ اس

کا روز کا معمول تھا۔ لیکن آج فاتحہ پڑھ کر رخصت ہو جانے پر طبیعت آمادہ نہیں ہوئی۔ فاتحہ پڑھ کر وہیں بیٹھ گیا اور جتنی چھوٹی بڑی سورتیں زبانی یاد تھیں۔ سب پڑھ ڈالیں، اس کے لئے صدق دل سے ماں باپ کے لئے دعائے مغفرت کی اور بڑی دیر تک باپ کی قبر پر بیٹھا روتا رہا یہ ندامت اور معذرت کے آنسو تھے۔

دل کا بوجھ ہلکا ہوا تو گھر واپس پہنچا، گھر کے جس مردانہ حصہ میں امتیاز کی نشست رہا کرتی تھی۔ اب احراز اس کی آرام کرسی و بیٹھک کا کام دیتا دیتا تھا۔ اعجاز جب واپس ہوا تو احراز اس آرام کرسی پر نیم دراز جو نہ جانے کتنا عرصہ امتیاز کا گہوارۂ راحت رہ چکی تھی حقہ کے کش لگا رہا تھا اعجاز کی آہٹ پاکر اس نے آنکھیں کھولیں اور سنجیدگی کے ساتھ گویا ہوا۔

"اگر فرصت ہو تو بیٹھو، کچھ ضروری باتیں کرنا ہیں۔

اعجاز خموشی کے ساتھ سامنے پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا معمولی اور رسمی تعزیت کے سوا اب تک احراز اور اعجاز میں کوئی بات نہیں ہوئی تھی، اس التفات پر اعجاز کو حیرت تو ضرور ہوئی، لیکن وہ صورت سوال

احباب، عزیز، رشتے دار، دور اور نزدیک کے ملنے والے۔

"بے شک ہوں گے۔"

"یہ گھر ویسے بھی ناکافی ہے، اب تو زیادہ ناکافی ثابت ہوگا۔"

اعجاز مدعا سمجھ گیا کہنے لگا۔

چند روز کے لئے ہم لوگ کہیں اور چلے جائیں اور یہ مکان مہمانوں کے لئے خالی کر دیا جائے۔؟"

"میری دو تجویزیں ہیں!"

آپ کی جو تجویز بھی ہوگی۔ مجھے منظور ہے

"ایک تجویز تو کلثوم کی ہے یعنی دیوار کھینچ دی جائے، اس طرح گھر کے دو حصے ہو جائیں گے۔"

یہ تجویز سنی تو میں نے بھی ہے لیکن اگر بے ادبی نہ ہو تو عرض

کروں، دیوار کھینچنے کی کیا ضرورت ہے؟"
احراز نے جیسے یہ بات سنی ہی نہیں کہنے لگا۔
اور دوسری تجویز جو پہلی تجویز سے کہیں زیادہ بہتر ہے یہ ہے کہ یا تم میرا حصہ خرید لو یا میں تمہارا حصہ خریدے لیتا ہوں، قیمت کیا ہو؟ اس کا فیصلہ میں تم پر ہی چھوڑتا ہوں۔ البتہ یہ طے ہے کہ جو بھی وہ قیمت نقد ادا کرے گا؟"
"لیکن چچا جان ایک تیسری تجویز میری ہے"!
یہ کہہ کر احراز کی طرف تکنے لگا۔ کہ دیکھئے کیا ارشاد ہوتا ہے اور پردۂ غیب سے کیا ظاہر ہوتا ہے۔
احراز نے حقہ کا ایک زوردار کش لگاتے ہوئے کہا۔
نسیم کی شادی بہت جلد ہونے والی ہے صفدر کے والدین جلدی کر رہے ہیں اور خود صفدر کا بھی شدید اصرار ہے کہ یہ رسم جلد از جلد انجام پا جانی چاہیئے۔
احراز یہ کہہ کر رہا تھا اور اعجاز سوچ رہا تھا کہ دنیا اسی کا نام ہے جس گھر سے کل تک نوحہ و ماتم کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں، اب وہاں جشن طرب بر پا ہو گا، شہنائیوں کی آواز گونجے گی! رقص و سرود اور نغمہ و موسیقی کی محفل ترتیب پائے گی؟ اور یہ سب کچھ وہ شخص کرے گا، جس کے سگے بڑے بھائی کو مرے ہوئے ابھی کچھ زیادہ مدت بھی نہیں گزری۔

لیکن یہ باتیں دل ہی دل میں رہیں، زبان تک نہ آسکیں، نہ اسے اعتراض کرنے کا حق تھا، نہ وہ کسی قسم کا اعتراض کرنا چاہتا تھا۔ اس نے کہا۔
بجا ارشاد ہوا، اصرار ٹھیک بھی ہے، منگنی کو اتنے دن ہو چکے اب یہ رسم انجام پا ہی جانی چاہیئے۔
یہی سوال میرا بھی ہے۔

پھر کچھ دیر خاموش رہ کر اس نے کہا۔
اس تقریب میں بہت سے لوگ شریک ہوں گے، دوست بھی۔ تمہاری کیا تجویز ہے؟ ۔ کہو!"
میری تجویز یہ ہے کہ ابا جان کے چالیسویں کے بعد زلیخا خالہ جان کے ساتھ چلی جائے گی اور مستقل طور پر وہیں رہے گی، رہا میں سو مجھے اس مکان کی ضرورت نہیں، کیونکہ میرا ارادہ اس شہر میں رہنے کا نہیں ہے۔ جہاں ملازمت یا روزگار کا بندوبست ہوا میں ڈیرہ ڈال دوں گا۔ کبھی آیا بھی تو چند گھنٹوں کے لئے آؤں گا۔ اور میری آمد بھی صرف قبرستان تک محدود ہو گی، فاتحہ پڑھا اور چلا گیا۔ لہذا کیوں نہ باقاعدہ رجسٹری کے ذریعے اپنے حصہ کا مکان میں نسیم کے نام منتقل کر دوں، آخر وہ میری بہن ہے۔
احراز کا خیال تھا، اعجاز کوئی ایسی جوابی تجویز پیش کرے گا جو اس سودے کو ناممکن اور اس تجویز کو ناکارہ بنا دے گی، لیکن اس نے ایسی تجویز پیش کر دی جس نے اسے غرق حیرت کر دیا، کچھ دیر تک ٹکٹکی باندھے اعجاز کو دیکھتا رہا۔ پھر اس نے کہا۔
" یہ تو بڑی عجیب تجویز ہے؟"
اور واقعی یہ بڑی عجیب تجویز تھی، اعجاز کے ساتھ اس کا، کلثوم کا اور نسیم کا جو برتاؤ رہا تھا۔ اس کے بعد بھی یہ انوکھی تجویز یا تو کسی ولی اللہ کی طرف سے پیش ہو سکتی تھی یا شیطان کی طرف سے۔ اعجاز کی پچھلی زندگی اس کے سامنے تھی، وہ اس کو ولی اللہ ماننے کو تیار نہیں تھا لہذا یہ رائے قائم کرنے پر اسے مجبور ہونا پڑا کہ یہ شیطانی تجویز تھی۔ لیکن وہ محسوس کر رہا تھا کہ جوتے اس طرح کپڑے میں لپیٹ کر لگائے گئے ہیں کہ جوابی حملہ آسان نہیں ہے اور وہ اسی حیص بیص میں بیٹھا تھا کہ اعجاز نے کہا۔
چچا جان، میری تجویز انوکھی اور عجیب تو نہیں ہے۔ اگر آپ باپ کی حیثیت سے نسیم کو بہت کچھ دینے کا حق رکھتے ہیں، کیا میں ایک بھائی کی حیثیت سے اتنا معمولی سا ایثار بھی نہیں کر سکتا؟

احراز نے ابھی کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ میدان خالی دیکھ کر کلثوم آ ٹپکی، اسے دیکھ کر اعجاز کھڑا ہو گیا۔ لیکن وہ نہ اس کی طرف ملتفت ہوئی نہ اس سے مخاطب ہوئی۔ اس نے احراز سے کہا۔

لڑکی کی شادی میں اب دن ہی کتنے رہ گئے ہیں۔ لیکن تم کسی طرح مکان کا معاملہ ہی نہیں طے کر چکتے۔ یا ادھر یا اُدھر ہو جانا چاہیے تاکہ معاملہ یکسو تو ہو۔ یا ہم کسی نئے مکان کا انتظام کر لیں۔ یا یہ لوگ، کہیں اپنا بند و بست کر لیں گو مگو کی پالیسی مجھے ذرا بھی پسند نہیں آتی۔

احراز نے جواب دیا" یہی بات طے کر رہا تھا اس وقت لیکن تم بلّم اور تلوار لے کر آن موجود ہوئیں۔"

اس طنز لطیف سے وہ ذرا بھی محظوظ نہیں ہوئی، کہنے لگی" تو پھر کیا طے ہوا؟ یہ بھی تو معلوم ہو؟

قبل اس کے کہ احراز کچھ بتائے، خود اعجاز ہی نے وہ تجویز دہرا دی جو ابھی اس نے پیش کی تھی۔ کلثوم نے کہا۔

نہیں بھیا، اس کی ضرورت نہیں، خدا کا دیا نسیم کے پاس بہت کچھ ہے وہ تمہارے ذرا سے حصہ کی محتاج نہیں ہے، اس احسان سے بخشو سیدھی سادھی بات یہ ہے یا تم اپنا حصہ بیچ دو یا ہمارا حصہ خرید لو، اللہ اللہ خیر صلا!

اعجاز نے اندر جانے کے لیے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

پہلے مجھے مکان خالی کر لینے دیجیے، پھر یہ معاملہ بھی طے ہو جائے گا۔

(۶)

انسان اپنے حال کو سنوارنے اور مستقبل کو بنانے کے لئے کیا کیا جتن نہیں کرتا؟ بے ایمانی، فریب کاری، دغا، جھوٹ، مکر ریا۔ نہ جانے کیا کیا جتن کرتا ہے، لیکن قدرت کے ایک جھٹکے سے اس کی ساری اسکیمیں غارت ہو کر رہ جاتی ہیں۔ وہ حیرت کے اور بے بسی کے ساتھ اپنی تعمیر کو منہدم ہوتے دیکھتا رہتا ہے لیکن کچھ نہیں کر سکتا۔

نسیم کی شادی کی تیاریاں زور شور سے جاری تھیں، اعجاز نے ارشاد کو تار دے دیا تھا کہ آئے زلیخا اور رابعہ کو اپنے ساتھ لے جائے خود اپنے لئے اس نے طے کر لیا تھا کہ دوسرے شہر میں قسمت آزمائی کے لئے جائے گا۔ اور ملازمت یا روزگار کی کوئی صورت پیدا کرے گا۔ اور بغیر پائی لئے اس مکان سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دستبردار ہو جائے گا۔ اس کے اس فیصلہ سے نہ رابعہ خوش تھی نہ زلیخا لیکن اتنے دنوں بعد کی گمشدگی کے بعد واپس آیا تھا۔ دونوں ڈرتی بھی تھیں کہیں پھر ہاتھ سے نہ نکل جائے، لہٰذا چاروں ناچار اس فیصلہ کے سامنے سر تسلیم خم کرنا پڑا۔ ارشاد نے تار ہی سے جواب دیا تھا۔ کہ حالات

کچھ ایسے تھے کہ پندرہ دن سے پہلے وہ کسی طرح بھی نہیں آسکتا اور پندرہ روز تک انتظار کرلینا۔ اعجاز کے لئے کچھ ایسا گراں نہ تھا کیونکہ نسیم کی شادی میں ابھی کم و بیش ۲۰ - ۲۵ دن باقی تھے۔

لیکن یہ بات نہ احراز کو معلوم تھی۔ نہ اعجاز کو نہ کلثوم کو، نہ نسیم کو پندرہ دن سے بھی کم مدت میں ایسا ہولناک انقلاب آرہا ہے جو قیامت بن کر نمودار ہوگا" یعنی" نہ نادر بجا ماند نے نادری!" والا معاملہ صادق آئے گا۔

اعجاز اور کلثوم میں جو گفتگو احراز کے سامنے ہوئی تھی اس کے ٹھیک تین دن کے بعد رشوت اور غبن کے الزام میں احراز کی گرفتاری عمل میں آگئی اور وہ حوالات میں پہنچ گیا۔ ضمانت کی بڑی کوشش کی گئی لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ الزام اتنا سنگین تھا کہ ضمانت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا اور ثبوت اتنے واضح تھے کہ بھاری جرمانے اور لمبی سزائے قید سے بچنے کی کوئی تدبیر اور صورت نظر نہیں آتی تھی۔

یہ تو گھر والے اور باہر والے سب جانتے تھے کہ احراز رشوت لیتا اور گلچھرے اڑاتا ہے پولیس کے لوگ اس سلسلہ میں بدنام ہی ہیں۔ یہ کوئی ایسی بات نہ تھی۔ جس پر لوگ چونکتے یا انگشت نمائی کرتے لیکن یہ اس وقت تک تھا۔ جب تک گرفتاری عمل میں نہیں آئی تھی۔ گرفتار ہو جانے کے بعد یہ جرم جس کی طرف کبھی لوگوں نے توجہ بھی نہیں کی تھی۔ نہ جسے کوئی اہمیت دی تھی۔ نہایت سنگین، ناقابل معافی اور نفرت انگیز جرم بن گیا۔

اب ہر شخص اس کے سایہ سے پناہ مانگتا تھا۔ دوست احباب جو پسینہ پر خون بہانے کو تیار رہتے تھے۔ بات پوچھنے کے روادار بھی نہ تھے۔ مزید ستم یہ ہوا کہ گھر کی تلاشی بھی لی گئی۔ اور بہت سی قیمتی چیزیں جو نسیم کی شادی کے لئے مخصوص تھیں، رشوت کا مال ثابت ہوئیں اور ضبط کرلی گئیں۔ گرفتاری سے چند منٹ پہلے تک جو شخص سارے شہر

میں اعزاز و اکرام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ اب مقہور و مردود قرار دے دیا گیا۔ جاننے والے سب اس کے نام پر لاحول پڑھتے، کوئی امداد و اعانت کے لئے تیار نہیں تھا۔ ساتھ دینا تو بڑی چیز ہے۔

احراز نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ وہ گرفتار ہو سکتا ہے اس کے گھر کی تلاشی لی جا سکتی ہے۔ اس کی شہرت، عزت، وقعت ہر چیز آن کی آن میں ختم ہو سکتی ہے لیکن جس چیز کو وہ سوچنے کا بھی روادار نہ تھا وہ ایک ٹھوس حقیقت کی صورت میں اس کے سامنے تھی۔

کل تک وہ خود دوسروں کو حوالات میں بھیجا کرتا تھا اقرار جرم کے لئے دوسروں پر تشدد کیا کرتا تھا۔ آج وہ خود حوالاتی تھا آج خود اس سے اقرار جرم کرایا جا رہا تھا۔

جن حوالاتیوں اور قیدیوں کو وہ ہمیشہ نفرت اور حقارت کی نظر سے دیکھا کرتا تھا۔ آج انہیں کے درمیان وہ زندگی کے لمحات بسر کر رہا تھا اور یہ حوالاتی اور قیدی اس کا مذاق اڑا رہے تھے اسے چھیڑ رہے تھے۔ اسے ستا رہے تھے۔ اس کے دستر خوان پر ہمیشہ کئی کئی قسم کے لذیذ اور مرغن کھانے ہوا کرتے تھے۔ لیکن اب وہ دستر خوان قصۂ ماضی بن چکا تھا۔ اب تو اسے وہی کھانا مل رہا تھا جو عام حوالاتی کو دیا جاتا تھا۔ وہ آرام دہ بستر پر گرمی میں خس کی ٹٹیوں کے اندر اور جاڑوں میں دہکتی ہوئی انگیٹھی کے سامنے آرام کیا کرتا تھا مگر اب شدید گرمی کے اس موسم میں لو کے تھپیڑے کھا رہا تھا۔ خس کی ٹٹی کا کیا ذکر، پنکھا تک میسر نہ تھا۔

(۷)

اعجاز کے لئے یہ بڑا نازک اور کٹھن وقت تھا۔

جس طرح اسے باپ سے کبھی محبت نہیں ملی تھی۔ چچا نے بھی شروع کے کچھ عرصہ کے علاوہ اسے کبھی مستحق شفقت و محبت نہ سمجھا تھا۔ بلکہ گھر چھوڑنے کا ایک سبب چچا کا طرزِ عمل ہی تھا اور جب طویل غیر حاضری کے بعد وہ واپس آیا چچا نے وہ سلوک کیا جو دشمن بھی نہیں کر سکتا تھا اس کے باپ کی بیمارداری میں کوئی حصہ نہیں لیا تھا۔ اس کے انتقال پر شرکتِ غم کا مظاہرہ نہیں کیا اور انتقال کے چند ہی روز بعد نسیم کی شادی کی تاریخ مقرر کر دی اور اس سے مطالبہ شروع کر دیا کہ مکان خالی کر دے۔ یہ ساری باتیں ایسی نہ تھیں جنہیں وہ معاف کر سکتا یا بھول سکتا، لیکن اتنے دنوں کی غیر حاضری میں، پردیس کی زندگی میں اور ایک انسان کامل کے سایۂ عاطفت میں اس نے جو سبق سیکھا تھا وہ یہی تھا کہ دشمنی دشمن سے بھی نہیں کرنی چاہیئے سب کے کام آنا چاہیے۔ اپنا "حق" کیا ہے۔ اسے بھول جانا چاہیئے۔ اپنا فرض کیا ہے۔ صرف اس کو یاد رکھنا چاہیئے۔

چنانچہ اعزاز کی گرفتاری کے بعد اس نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا کہ کسی طرح بھی ضمانت پر اسے رہا کرائے۔ اس سلسلہ میں اسے

کافی روپیہ خرچ کرنا پڑا اور سارا روپیہ اس نے اپنے پاس سے خرچ کیا۔ وکیل کی فیس بھی اور دوسرے مصارف بھی۔

دو مرتبہ ضمانت کی درخواست مسترد ہوئی۔ لیکن تیسری مرتبہ اس نے ہائی کورٹ سے منظور کرالی، عدالت عالیہ تک جانے میں کافی زیر بار ہونا پڑا۔ لیکن اس نے کوئی پرواہ نہ کی اور بالآخر کامیاب ہوا۔

احراز حوالات سے جب باہر نکلا تو یہ معلوم ہوتا تھا مہینوں سے بیمار چلا آرہا ہے صرف ایک ہفتہ کے اندر اس کی کایا پلٹ گئی تھی۔ جب حوالات گیا تھا۔ تو توانا، تندرست اور سرخ سفید تھا۔ واپس آیا تو مرجھایا ہوا جیسے کئی سال کا بیمار چہرے سے بڑھاپا عیاں۔ آنکھیں حلقوں میں دھنسی ہوئی حوالات کے دروازے پر اس کا استقبال کرنے والا، اعجاز کے سوا کوئی نہ تھا۔

اعجاز اسے لے کر گھر آیا، راستے بھر لوگوں کی نظریں اس پر پڑتی رہیں اور وہ سر جھکائے ایک مجرم کی طرح راستہ طے کرتا رہا۔ آخر گھر پہنچا، یہاں کلثوم، نسیم اور زلیخا اس کے استقبال کو موجود تھیں۔ لیکن تینوں کے چہرے اترے ہوئے۔ تینوں کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ کن الفاظ میں اور کیسے اس کی پذیرائی کرے۔

خود احراز بھی خاموش اور گم سم تھا۔ برآمدے میں آرام کرسی پر لیٹ گیا۔ نسیم جلدی سے شربت بنا لائی۔ زلیخا نے حقہ بھر دیا۔ اور پیش کیا۔ کلثوم خاموشی سے پاس آکر بیٹھ گئی۔ زبان خاموش تھی۔ لیکن دل میں طوفان اٹھ رہا تھا۔ اور اس طوفان کی غمازی ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں بھی کر رہی تھیں۔

احراز نے شربت کے دو گھونٹ مشکل سے پیئے تھے پھر گلاس الگ رکھ دیا تھا۔ گویا یہ کوئی کڑوی سی دوا ہو۔ جس کے پینے پر طبیعت مائل نہ تھی۔ حقہ کے دو کش لگائے اور اسے بھی الگ کر دیا اب وہ حوالات سے نکل کر گھر آگیا تھا۔ یہاں وہ آزاد تھا۔ نہ وہ

قیدی تھے جو گالیاں دیتے اور چھیڑتے رہتے تھے، نہ وہ ماحول تھا جو ایک شریف انسان کو خود کشی پر آمادہ کر دیتا ہے۔ نہ وہ پھیکا اور میٹھا کھانا تھا جس کے تصور سے ابکائی آتی ہے۔

پھر بھی دل بجھا بجھا سا تھا اور شرم و ندامت کی یہ کیفیت تھی کہ کلثوم تک سے جو اس کی ہمراز تھی۔ آنکھیں چار کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتا تھا۔ اس نے شربت کا گلاس تپائی پر رکھ کر اور حقہ کو ایک طرف سرکا کر پاؤں پھیلا لیے اور آنکھیں بند کر کے لیٹ رہا۔

اتنے میں پوسٹ مین آیا۔ صرف ایک ہی خط تھا اور وہ احراز کے نام تھا۔

کلثوم نے خط بڑھاتے ہوئے کہا۔

دیکھو یہ کس کا خط ہے؟"

لفافہ پر پتہ دیکھنے کے لئے نسیم جھکی اور مسرت اور کچھ شرم سے اس کی لویں سرخ ہو گئیں۔ یہ صفدر کا خط تھا۔

احراز نے اشتیاق، بیقراری اور اضطراب کے ساتھ لفافہ چاک کیا اور پڑھنا شروع کر دیا۔ صفدر نے لکھا تھا۔

آپ کی گرفتاری کی خبر پڑھ کر ہم سب کو بہت صدمہ ہوا لیکن جس جرم میں آپ گرفتار کئے گئے۔ وہ بہت شرمناک ہے ممکن ہے اس گرفتاری اور بعد میں سزا یابی کے بعد بھی آپ لوگوں سے آنکھیں چار نہ کر سکیں اور کسی طرح کی شرم و غیرت محسوس نہ کریں۔ لیکن میں اس اس شخص کا داماد بننے میں شرم محسوس کرتا ہوں۔ جو ایسے شرمناک اقدام کے تحت گرفتار ہوا ہو۔ اگر ان حالات میں بھی آپ کا داماد بننا منظور کروں، تو پھر نہ میری کوئی عزت رہ جائے گی، نہ عزیز و اقارب میں منہ دکھا سکوں گا۔

احراز نے دو مرتبہ یہ خط پڑھا اور پھر اسے تہہ کر کے جیب میں رکھ لیا۔ کلثوم نسیم کا رنگ رخ دیکھ کر سمجھ گئی تھی کہ صفدر کا خط ہے اس

نے سوال کیا :
" کیا لکھا ہے ؟ ۔ سب خیریت تو ہے ۔"
احراز نے مسکرانے کی ناکام کوشش کرتے اور خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے جواب دیا ۔
" ہاں بالکل !"

(۸)

اعجاز اپنے کمرے میں بیٹھا تھا۔ کچھ چپ چپ، کچھ اُداس اُداس سا۔ احراز کی ذلت اور رسوائی نے اسے بہت زیادہ مغموم اور افسردہ کر رکھا تھا اور اب کہ وہ حوالات سے ضمانت پر رہا ہو کر آگیا تھا۔ اس فکر نے پریشان کر رکھا تھا کہ بالآخر انجام کیا ہو گا؟

اسی سوچ میں بیٹھا تھا کہ زلیخا اور رابعہ آگئیں۔ رابعہ نے کہا۔
"تم اتنے چپ چاپ کیوں نظر آرہے ہو؟"
زلیخا بولی "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بھیا کو کسی خاص فکر نے پریشان کر رکھا ہے؟"
وہ ایک افسردہ سے تبسم کے ساتھ گویا ہوا۔
"ہاں زلیخا، بات کچھ ایسی ہی ہے"؟
"اس نے پوچھا "لیکن معلوم بھی ہو، کیا بات ہے"؟
وہ کہنے لگا۔" سوچتا ہوں اگر خدا نخواستہ چچا کو سزا ہو گئی تو کیا ہو گا؟"
رابعہ نے حیرت سے اعجاز کو دیکھا اور بولی:
لیکن بیٹے، یہ تو کیے کا پھل ہے جیسے کرے گا ویسا بھرے گا

زیبا نے بحث میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔

واقعی بات فکر کی ہے، لیکن بھیا ہم کیا کر سکتے ہیں اگر وہ رشوت نہ لیتے اور غبن نہ کرتے، تو آج یہ دن کیوں دیکھنا پڑتا۔

اعجاز نے سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا۔" میں تو یہ سوچ کر اور زیادہ پریشان ہو جاتا ہوں کہ اگر یہ فرض محال — بہ فرض محال اس لئے کہہ رہا ہوں کہ وکیل کا خیال ہے۔ سزا ضرور ہو گی۔ رہا بھی ہو گئے تو بھی نوکری گئی، آمدنی گئی، آخر وہ کیا کریں گے کیا۔ زندگی کس طرح بسر کریں گے؛

رابعہ نے ذرا چڑتے ہوئے کہا:" یہ تو خود انہیں سوچنا چاہیے تم کیوں سر کھپا رہے ہو۔ اس بے بات کی بات ہیں۔

وہ بولا" خالہ اماں اتنی بے درد نہ بنیئے، وہ بہر حال میرے چچا ہیں۔ میرے مرحوم باپ کے بھائی"۔

وہ اور زیادہ چڑتی ہوئی بولی۔" ہاں ہیں تو سہی لیکن چچا کی سی کوئی بات تو ہے نہیں ان میں؟ کبھی انہوں نے تمہارے یا زلیخا کے سر پر ہاتھ رکھا؟ کبھی دکھ بٹایا؟ کبھی کسی موقع پر کام آئے؟ بلکہ انہوں نے میرا ذکر تو خیر چھوڑ دیں ان کی کون ہوتی ہوں۔ زلیخا تک معاف نہیں کیا۔ اس غریب کے ساتھ جو سلوک کیا۔ یا میاں بیوی نے روا رکھا ہے اسے سوچتی ہوں تو خون کھولنے لگتا ہے!"

خالہ اماں ایسی باتیں نہ سوچا کیجیے۔

"کیا نہ سوچا کروں لڑکے؟"

ایسی ہی، اس طرح کی تلخ اور ناگوار باتیں۔

"بھول جاؤ انہیں"؟

"ہاں بالکل!"

"میں تو نہیں بھول سکتی مرتے دم تک!"

"لیکن یاد رکھنے سے کیا فائدہ ہو گا؟"

"میں کہتی ہوں تجھے کیا ہو گیا آج؟"

"خالہ اماں آپ تو خفا ہوئی جارہی ہیں خواہ مخواہ!"
کیسے خفا نہ ہوں، یوں معلوم ہوتا ہے بڑا ولی اللہ بن کر آیا ہے۔ نہ بابا ہم ٹھہرے دنیادار ہم سے جو جیسا سلوک ہم ویسا ہی کریں گے۔"
خالہ اماں بعض واقعات ایسے ہوتے ہیں کہ ان سے سبق حاصل کرنا کرنا چاہیے، عبرت حاصل کرنی چاہیے۔ ان پر خوش نہ ہونا چاہیے۔ یہ واقعہ بھی اسی طرح کا ہے۔"
تم تو اپنا فرض ادا کر رہے ہو ہمیں چھوڑو، یہ بہت ہے۔ اگر تم نہ ہوتے تو وہ حوالات سے چھوٹ کر نہ آتے؟ وہیں سے سیدھے جیل بھیج دیئے جاتے۔ شرافت، ہو تو زندگی بھر تمہارے اس احسان کو یاد رکھیں۔"
"میں نے جو کچھ کیا ہے اپنا فرض سمجھ کر کیا ہے، اس لئے نہیں کہ وہ مجھے اپنا محسن سمجھیں اور میرے گن گائیں!"
زلیخا بیچ میں بول پڑی لیکن بھیا آپ کی اس خدمت اور محبت کے باوجود نہ چچی کا رویہ بدلا ہے نہ نسیم کا آخر تالی ایک ہاتھ سے کب تک بجتی رہے گی؟"
جب تک میں زندہ ہوں! نسیم اور چچی کا رویہ ان کے ساتھ! میرا میرے ساتھ!"
آج بھی ایسے ایسے طعنے دیئے ہیں نسیم نے کہ کلیجہ کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے اور بات کچھ بھی نہیں۔"
آدمی جب پریشان ہوتا ہے تو چڑچڑا ہو جاتا ہے معاف کر دو ے اور یہ بھی تو سوچو بہت جلد اس کی شادی ہونے والی ہے۔ صفدر کا آج ہی خط آیا ہے اور شادی سے پہلے پہلے ہمیں یہ گھر خالی کر دینا ہے جب ایک ساتھ رہنا ہی نہیں ہوگا تو طعنے کون دے گا؟ اور کلیجہ کس کا پھٹے گا؟
"وہ مسکراتی ہوئی بولی" بھیا تو نہ جانے کیا ہو گئے ہیں"۔
ابھی اعجاز نے کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ دھماکہ کی آواز آئی اور اس کے ساتھ دردناک چیخ۔

(۹)

زلیخا نے ہمگین انداز میں کہا" یہ دھماکہ کیسا؟"
رابعہ دہشت زدہ ہو کر بولی" یہ چیخ — ؟"
اعجاز تیزی کے ساتھ اُٹھا، اس نے بھڑے ہوئے دروازے عجلت کے ساتھ کھولے اور باہر نکل گیا۔ زلیخا اور رابعہ بھی پیچھے پیچھے چلیں۔
وہ سیدھا مکان کے اس حصہ میں گیا تھا جہاں احراز رہتا تھا۔ اس کے کانوں میں کلثوم کی آواز آئی۔
" ہائے یہ کیا ہو گیا ؟"
پھر نسیم کی لرزتی ہوئی آواز فضا میں گونجی" ابا جی —"
اعجاز اور زیادہ تیزی کے ساتھ بلکہ کہنا چاہیے دوڑتا ہوا احراز کے کمرہ میں پہنچا۔
احراز نے کنپٹی پر گولی مار کر خودکشی کر لی تھی۔
کلثوم پیکرِ بے جان کی طرح لاش کے پاس کھڑی تھی۔ نسیم اس کے پہلو میں کھڑی سسکیاں لے رہی تھی۔
بڑا دردناک، اور ہولناک منظر تھا۔ رابعہ اور زلیخا جو ابھی احراز کے خلاف نہ جانے کیا کیا کچھ کہہ رہی تھی اس منظر کو دیکھ کر لرز گئیں زلیخا کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ رابعہ کا حال یہ تھا کہ سارے بدن سے لرز رہی تھی!

اعجاز نے اس موقع پر بھی حاضر دماغی سے کام لیا۔ اس نے فوراً فوراً فون کے ذریعہ پولیس کو حادثہ کی اطلاع دی۔ فوراً انسپکٹر، سب انسپکٹر، سپرنٹنڈنٹ اور بہت سے کانسٹیبل آموجود ہوئے۔

یہ سب لوگ جب سے احراز ماخوذ ہوا تھا اس سے الگ تھلگ رہنے لگے تھے لیکن اب کہ وہ مر چکا تھا۔ جرم و سزا کی حد سے آگے نکل چکا تھا۔ ان کی ہمدردی پھر عود کر آئی، بڑی ہمدردی کے ساتھ انہوں نے کلثوم اور نسیم سے تعزیت کی رسم ادا کی۔ اصولاً لاش کو پوسٹ مارٹم کے لئے ہسپتال بھیجنا چاہیئے تھا۔ مگر ان لوگوں نے ایسا نہیں کیا اور اعجاز کی استدعا قبول کر کے دفن کرنے کی اجازت دے دی یہ بات شک و شبہ سے بالا تھی کہ احراز نے خودکشی کی تھی۔ تکیہ کے نیچے ایک مختصر سی تحریر بھی اس کے ہاتھ کی لکھی ہوئی مل گئی جس میں لکھا تھا۔

"ذلت کی زندگی میرے لئے ناقابل
برداشت ہے، میں خودکشی کر رہا
ہوں اور اس فعل کا تنہا ذمہ دار
ہوں۔"

اس تحریر نے افسران بالا پولیس کی مشکل اور آسان کر دی اور انہوں نے پوسٹ مارٹم کے بغیر دفن کرنے کی اجازت دے دی۔

تدفین کے سلسلہ میں سارے انتظامات اعجاز ہی کو کرنا پڑے اور اس نے بڑی خوبی اور مختصر سے وقفہ میں یہ انتظامات مکمل کر لئے۔

احراز کا جنازہ جب اٹھا تو قیامت کا منظر تھا۔ کلثوم کی حالت دیکھی نہیں جاتی تھی، روتے روتے اس کی آنکھیں سوج گئی تھیں۔ آواز بیٹھ گئی تھی۔ بار بار بیہوشی اور غشی کے دورے پڑتے تھے۔

نسیم شروع میں بہت روئی، اب بالکل خاموش تھی، پھٹی پھٹی آنکھوں سے کبھی باپ کی لاش کو دیکھتی۔ کبھی بے ہوش ماں کو، کبھی اعجاز کو، کبھی زلیخا کو، کبھی رابعہ کو کبھی نادرہ کو۔

زلیخا نے بہن ہونے کا حق ادا کر دیا۔ وہ نسیم کے گلے لگ کر خوب روئی اور اس کے بعد اعجاز کی حسب ہدایت اسے وہاں سے ہٹا لے گئی۔ اس کمرے میں جو اعجاز کا تھا اور جہاں کبھی دونوں گھنٹوں اور پہروں اکھٹے کھیلا کرتے تھے۔ باتیں کیا کرتے تھے داستان طرازی کیا کرتے تھے،

رابعہ کلثوم کو اپنے کمرے میں نادرہ کی مدد سے لے گئی اور بستر پر آرام سے لٹا دیا۔ وہ جب ہوش میں آتی احراز کے کمرے کی طرف لپکتی۔ لیکن زلیخا اور نادرہ اسے روک لیتیں۔ ایک مرتبہ جب ایسا ہی واقعہ پیش آیا تو بڑی بے بسی کے ساتھ اس نے کہا۔

کیا میں ان کا آخری دیدار بھی نہیں کر سکتی،" یا اللہ۔

اور پھر کچھ نہ کہہ سکی، آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے اور پھر وہ بے ہوش ہو گئی۔

اس حادثہ کی خبر آناً فاناً سارے شہر میں مشتہر ہو گئی، دوست، عزیز رشتے دار، جان پہچان والے سب ہی آموجود ہوئے۔ یہ ایسا وقت تھا کہ اب نہ کوئی اختلاف باقی رہ گیا تھا۔ نہ کوئی تلخ یاد، آنے والے آتے تھے لاش پر ایک نظر ڈالتے تھے اور کانپ کر رہ جاتے تھے، کوئی آدمی مر جائے یا پھانسی پا جائے یا کسی اور طرح ہلاک کر دیا جائے تو افسوس اس کا بھی قدرتی طور پر ہوتا ہے۔ دل اس سے بھی قدرتی طور پر متاثر ہوتا ہے لیکن ایک آدمی حالات سے بے بس ہو کر خود اپنا قاتل بن جائے اپنی جان لے لے، اپنے گولی مارے تو صورت ہی دوسری ہوتی ہے پھر ہمدردیاں اور زیادہ بڑھ جاتی ہیں۔

جو لوگ تعزیت اور تجہیز و تکفین کے لئے جمع تھے۔ ان میں بہت سے ایسے تھے جو احراز سے خفا تھے، اس کے مخالف تھے، دشمن تھے اسے زک دینے کی کوشش کرتے رہتے تھے اور جب وہ ان سازشوں اور دراندازیوں کے باعث ماخوذ ہوا۔ حوالات بھیجا گیا تو یہ خوش بھی ہوئے

تھے، انھوں نے ایک طرح کا سکون بھی محسوس کیا تھا۔ اپنی نجی محفلوں اور صحبتوں میں اس کی ذلت ورسوائی اور زیادہ سے زیادہ سزائے قید کے تصور پر جوش نشاط کا اظہار بھی کرتے تھے لیکن اب، اس نے خودکشی کر لی تھی، اپنے ہاتھوں ہی زندگی کا خاتمہ کر لیا تھا۔ کم ازکم اس وقت ان میں سے کوئی بھی خوش نہیں تھا۔ ہر شخص غمزدہ اور افسردہ نظر آرہا تھا۔

" اجرانہ کے جنازے میں ایک خلقت شریک تھی یہ جیسے ہیرو کا جنازہ ہو۔"

(۱۰)

احراز کے تکیہ کے نیچے جہاں وہ تحریر تھی جس میں اس نے خودکشی کا اپنے آپ کو ذمہ دار قرار دیا۔ وہاں صفدر کا وہ خط تھا جو ٹھیک اسی روز ملا تھا۔ اس خط نے یہ راز فاش کر دیا کہ جہاں خودکشی کا ایک سبب وہ ذلت و رسوائی تھی جس سے رشوت اور غبن کے مقدمہ میں ماخوذ ہونے کے باعث اسے دوچار ہونا پڑا۔ وہاں سب سے بڑا سبب یہ خط تھا۔

صفدر سے احراز کو بہت سی توقعات تھیں وہ اسے اپنا ہونے والا داماد ہی نہیں بیٹا بھی سمجھتا تھا۔ اس تیر نے اس کا دل چھید دیا۔ اور پھر پھڑا کر ختم ہو گیا۔

لیکن اس خط کا سب سے بڑا اور گہرا ردعمل کلثوم پر ہوا صفدر کلثوم کے بھائی کا لڑکا تھا۔ وہ اسے دل و جان سے چاہتی تھی، اس لئے بھی کہ وہ دولت مند تھا اور اس لئے بھی کہ وہ اس کے چہیتے بھائی کا فرزند دلبند تھا۔ صفدر نے اپنے خلوص، اپنایت اور محبت کا جو سکہ بٹھا لیا تھا اس سے وہ اور زیادہ متاثر تھی۔ لیکن جب اس نے ایسے نازک وقت اور کٹھن پر دغابازی تو اس کا دماغی توازن جاتا رہا۔

اس نے اپنے بھائی پر اس کے دولت مند ہونے کے باوجود بڑے احسانات کیے تھے اعزاز کی آمدنی کا معقول حصہ وہ اس کنبہ پر صرف کر دیا کرتی تھی اسے اپنے بھائی سے غیر معمولی محبت تھی اور اس کا خیال تھا کہ وہ بھی اسے دل و جان سے چاہتا ہے۔ لیکن اس موقع پر نہ بھائی نے ساتھ دیا نہ بھتیجے نے۔

یہ ایسا دل دوز سانحہ تھا کہ وہ برداشت نہ کر سکی۔ پاگل ہو گئی چند روز تک تو گھر والے یہی سمجھتے رہے کہ وفورِ غم اور شدتِ الم کے باعث بہکی بہکی باتیں کرتی ہے کبھی ہنسنے لگتی ہے۔ کبھی کپڑے پھاڑ ڈالتی ہے کبھی فرنیچر توڑ ڈالتی ہے۔ کبھی برتنوں کی شامت آ جاتی ہے۔ لیکن جب یہ کیفیت بڑھتی گئی اور چند روز کے بعد وہ جارحانہ حرکتوں پر اتر آئی تو باور کرنا پڑا شدتِ غم نے اسے حواس باختہ نہیں۔ دیوانہ بنا دیا ہے۔ نادرہ تو اس کا ہدفِ ستم تھی ہی رابعہ اور زلیخا بھی اس کے دستِ ستم سے محفوظ نہیں تھیں اور خود اعجاز بھی جب زد میں آ جاتا تو نہ بچتا۔ گرم گرم چائے کی پیالی ہاتھ میں لئے ایک روز وہ صحن میں ٹہل رہی تھی کہ زلیخا ادھر سے گزری پوری پیالی اس کے سر پر کھینچ ماری۔ وہ تو خیریت کہ وار اوچھا پڑا ورنہ لہولہان ہونے میں کوئی کسر رہ نہیں گئی تھی کہ اسی طرح ایک مرتبہ وہ برآمدے میں ایک آرام دہ کرسی پر دراز تھی کہ رابعہ باورچی خانے سے نکل پڑی۔ محبت سے اسے بلایا اور شکایت آمیز لہجہ میں کہا۔

رابعہ تم تو کبھی دو گھڑی بھی ہمارے پاس آ کر نہیں بیٹھتیں۔ ایسی بھی کیا مغائرت۔

رابعہ پاس آ کر بیٹھ گئی۔ کرسی کے پاس آبنوس کی ایک تپائی رکھی تھی۔ دفعتاً وہ تپائی اٹھائی اور کھینچ ماری۔ اگر رابعہ سر نہ ہٹا لے تو ہسپتال جائے بغیر کام نہ بنتا۔ لیکن اس واقعہ سے وہ اتنی دہشت زدہ ہوئی کہ پھر ایک سیکنڈ نہ ٹھہر سکی۔ بھاگوں بھاگ اپنے کمرے میں جا کر پناہ لی رابعہ کو گئے ہوئے چند منٹ ہوئے تھے کہ اعجاز باہر سے آیا اور اپنے

ہال کمانے کی طرف جانے لگا. کلثوم نے آواز دی -

"بیٹے ذرا سننا؟"

وہ چند سیڑھیاں چڑھا تھا. یہ آواز سن کر نیچے اتر آیا- کلثوم نے کہا
تمہارے چچا تمہارے لئے ایک تحفہ چھوڑ گئے ہیں!"

اعجاز کو اس انکشاف پر حیرت ہوئی، اس نے کہا، "میرے لئے تحفہ چھوڑ گئے ہیں؟"

وہ بولی -

"ہاں اور وصیت کی تھی کہ مجھے کہ ان کے مرتے ہی تم تک اسے پہنچا دوں؟"

"اعجاز نے پوچھا "کیا آپ کو معلوم تھا کہ وہ خودکشی کر کے مرنے والے ہیں؟"

وہ کہنے لگی -

"معلوم تو نہیں تھا لیکن انہوں نے کہا تھا کہ جب بھی وہ مریں تو یہ تحفہ تمہیں دے دیا جائے!"

پہلے تو اعجاز کو شبہ تھا کہ یہ بہکی بہکی باتیں ہیں لیکن اب ان کی صداقت پر یقین آ گیا - اس نے کہا -

"تو پھر دے دیجئے؟"

وہ اٹھ کھڑی ہوئی پیار سے اس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھا اور آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا -

"کاش وہ زندہ ہوتا اور میں مر گئی ہوتی - کاش یہ تحفہ انہوں نے خود تجھے اپنے ہاتھ سے دیا ہو؟"

اعجاز کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے اس نے کہا -

"لیکن خدا کی مرضی ہر حالت میں پوری ہو کر رہتی ہے - اس کی مرضی یہی تھی؟"

گویا ان الفاظ نے اس پر بڑا اثر کیا کہنے لگی -

"ہاں بیٹے! خدا کی مرضی میں کون دم مار سکتا ہے"؟

اعجاز نے اور زیادہ تسلی اور دلاسا دیتے ہوئے کہا۔
"چچی جان، زیادہ غم نہ کیجئے۔ موت پر کسی کا بس نہیں چلتا آج وہ کل ہماری باری ہے۔ آپ کی یہ غمزدہ حالت مجھ سے نہیں دیکھی جاتی، آپ کو زندہ رہنا ہے۔
کلثوم نے تیوری چڑھا کر سوال کیا۔
"کیوں زندہ رہنا ہے؟ ان کے بعد زندہ رہ کر کیا کروں گی؟"
"اعجاز نے جواب دیا" اپنے لئے نہیں، نسیم کے لئے۔ نسیم کو ضرورت ہے آپ کی!"
کلثوم نے اسے کلیجہ سے لگایا اور کہا۔
بیٹے تو نے سچ کہا۔ میں زندہ رہوں گی، نسیم کے لئے مجھے زندہ رہنا چاہیے۔ وہ عمر ہی پکنے میں تھی اگر مر گئی تو نسیم زندہ نہیں رہے گی۔ پھر اس کی کون خبر لے گا؟ کون اس کی دیکھ بھال کرے گا؟ کون اسے پھولوں کی طرح رکھے گا؟ بیٹے تو نے سچ کہا۔ میں زندہ رہوں گی۔ مجھے زندہ رہنا چاہیے تو اندھیرے میں روشنی بن کر نمودار ہوا ہے۔ بات راز کی ہے لیکن تجھے بتانے میں حرج نہیں میں نے خودکشی کا فیصلہ کر لیا تھا۔ شاید دو چار روز میں کر ہی لیتی، لیکن اب توبہ ہے۔ کان پکڑے ہیں نے خودکشی کے نام سے خودکشی کرے میرے دشمن۔ میں کیوں کرنے لگی۔ کیا خودکشی کر کے اپنی جان سے زیادہ پیاری بچی کو زندہ درگور کر دوں؟"
اعجاز نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔
"خود ہی سوچئے چچی جان۔ خدا کا شکر ہے اس ارادہ سے آپ باز آگئیں!"
وہ مسکراتی ہوئی کہنے لگی "ہاں باز آگئی بیٹا۔ چل تجھے وہ تحفہ دے دوں!"
آگے آگے کلثوم، پیچھے پیچھے اعجاز۔ دونوں اس کمرے میں پہنچے جو زندگی میں احراز کا مسکن تھا۔ کلثوم نے آہنی الماری کھولی اور اس میں سے

ایک پستول نکالا۔ پستول دیکھ کر اعجاز ذرا گھبرا گیا۔ لیکن اس نے اپنے حواس بجا رکھے، دریافت کیا۔

"کیا یہی وہ تحفہ ہے؟"

وہ کہنے لگی "ہاں بیٹے یہی وہ تحفہ ہے جس طرح ان کے بہت سے دشمن ہیں، تیرے بھی ہیں۔ حفاظت کے لئے ہر وقت اپنے پاس رکھا کر۔"

کلثوم کے ہاتھ میں زیادہ دیر تک پستول کا رہنا خطرناک سمجھتے ہوئے اس نے اسے لینے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ لیکن لبلبی پر کلثوم کی انگلی تھی وہ اس کے سینہ کا نشانہ تاک چکی تھی اور مسکرا رہی تھی، اس نے بجلی کی سی تیزی سے ایک سکینڈ سے بھی بہت کم مدت میں پوری قوت کے ساتھ اس کی کلائی پر گھونسہ مارا جس سے پستول چھٹ کر گر پڑا، اسے اٹھایا تو وہ بھرا ہوا تھا۔ اس نے پستول جیب میں رکھا اور کلثوم سے کہا۔

اطمینان رکھئے، یہ ہر وقت حفاظت خود اختیاری کے لئے میرے پاس رہیگا۔
کلثوم نے پھٹی پھٹی سے دیکھا اور ایک کھوکھلا قہقہہ لگایا۔ اور دیر تک ہنستی رہی۔

انسان

(۱)

کلثوم کی حالت دن بدن ابتر ہی ہوتی چلی گئی، اس کی دیوانگی نے احراز کا غم بھلا دیا تھا۔ شروع شروع میں اس کی دیوانگی، ہوشیاری کا پہلو لئے ہوئے تھی۔ یعنی سب کے ساتھ وہ مار دھاڑ کرتی تھی، لیکن نسیم کو کلیجہ سے لگائے رکھتی تھی، مگر کچھ ہی دن بعد وہ نسیم کی بھی اسی طرح دشمن ہوگئی، جس طرح اعجاز، زلیخا اور رابعہ وغیرہ کی تھی، آخر تنگ آکر اعجازنہ نے اسے مینٹل ہسپتال میں داخل کرادیا۔

سارے گھر میں سب سے زیادہ قابل رحم حالت نسیم کی تھی ایک طرف باپ کی مرگ بے ہنگام کا غم۔ دوسری طرف ماں کی دیوانگی، تیسری طرف صفدر کی بے وفائی۔ چوتھی طرف گھر کی ابتری اور بربادی۔ ان سب غموں نے مل کر ایک ساتھ اس تن نازک پر دھاوا کیا تھا۔ اس کے اوقات کا بیشتر حصہ روتے کٹتا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ کیا کرے کہاں جائے۔

کل تک وہ ایک شہزادی کی سی زندگی بسر کر رہی تھی۔ سارا گھر اس کی ایڑی کے نیچے تھا۔ ماں جان و دل سے قربان۔ باپ سراپا محبت و شفقت، صفدر یکسر مہر و محبت، لیکن یک لخت گردش چرخ نیلی فام کی بساط الٹ گئی۔ احراز نے خودکشی کرلی۔ ماں پاگل خانے پہنچ گئی، صفدر

نے ناطہ توڑ لیا۔

اب اس دنیا میں کون تھا۔ اس کا؟

جدھر نظر ڈالتی تھی مایوسی ہی مایوسی نظر آتی تھی۔

کوئی ایسا نہ تھا۔ جس پہ بھروسہ کر سکے، جسے اپنا کہہ سکے جس کے سامنے دل کے جلے پھپھولے پھوڑ سکے، جس کی ہمدردی پر بھروسہ کر کے خوب جی بھر کے رو سکے، رابعہ کا برتاؤ اس کے ساتھ بہت اچھا تھا۔ لیکن اس نے اپنی رعونت سے انہیں دشمن بنا لیا تھا۔ زلیخا بہن سے زیادہ چاہتی تھی۔ لیکن مریم کے انتقال کے بعد سے اب تک اس نے جو رویہ اس کے ساتھ رکھا تھا۔ وہ ایک بدترین دشمن کے ساتھ بھی نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ پھر کس برتے پر وہ اس سے دوستی کی لو لگائی؟ اعجاز سے اس کی خوب بنتی تھی۔ لیکن وہی تو تھی جو اس کی خانہ بربادی اور جلا وطنی کا سبب بنی تھی۔ جس نے اس کے ساتھ نفرت اور حقارت کا برتاؤ کیا تھا۔ جس نے اتنے دنوں کے بعد اس کی واپسی پر بات تک نہ پوچھی بلکہ اسے اور زیادہ ذلیل کیا۔ ان حالات میں کیسے ممکن تھا۔ کہ وہ اس سے بھلائی کی توقع کرتی۔

اور جس کے لئے اس نے اپنے کنبہ کو اپنے قریبی عزیزوں کو اپنے چچازاد بھائی اور بہن کو دشمن بنا لیا تھا۔ اس نے اس نازک وقت پر دغا دی اور ساتھ چھوڑ دیا!

اگر صفدر نے بے وفائی نہ کی ہوتی تو شاید اس غم کو وہ جھیل جاتی باپ کی موت اور ماں کی دیوانگی کا دھچکا سہہ لیتی۔ لیکن صفدر نے ساتھ چھوڑ کر اور آنکھ پھیر کر اسے دنیا میں کہیں کا نہ رکھا تھا۔ اب وہ کس سے ہمدردی کی بھیک مانگے کون ہے جو اس کے زخم دل پر مرہم رکھے اس کے آنسو پونچھے اور اس کے قلب ناصبور کو تسکین و تسلی دے؟

صفدر نے اور ماموں اور ممانی نے تو اتنا تک نہیں کیا کہ اس حادثہ پہ دو لفظ ہمدردی اور تعزیت کے لکھ بھیجتے ہوتے اور کوئی

پڑھنے کے لئے آگے آتا عملی طور پر نہ سہی، زبانی ہی، ہمدردی اور محبت کا اظہار کر دیا ہوتا۔

ان سب کے مقابلہ میں اعجاز پھر غنیمت نکلا۔ اگر وہ نہ ہوتا، تو کیا ہوتا۔؟ اس مرحلہ پر جب ساری دنیا نے ساتھ چھوڑ دیا تھا وہی وکیل کے ہاں چکر کاٹ رہا تھا۔ عدالت کے پھیرے کر رہا تھا۔ وہی تھا جو حوالات کی سلاخوں سے اعزاز کو نکال کر باہر لایا وہی تھا جس نے اس کی خودکشی کے بعد گھر سے قبرستان تک کے سارے مراحل طے کئے وہی تھا جس نے کلثوم کی دیوانگی کے بعد اسے سنبھالا اس کے علاج کی کوشش کی۔ اسے ہسپتال میں داخل کرایا۔ حالانکہ اسے نفرت، حقارت اور ذلت کے سوا نہ کلثوم سے کچھ ملا تھا، نہ اعزاز سے۔ نہ خود اس سے۔

جب وہ یہ سوچتی تو اعجاز کے لئے اس کے دل میں ممنونیت کے جذبات پیدا ہو جاتے۔ جی چاہتا۔ شکریہ ادا کرے۔ لیکن ندامت زبان پکڑ لیتی۔

(۲)

مصائب و آلام کی یہ یورش اگر آہنی اعصاب کے انسان پر ہوتی تو وہ بھی لب گور ہو جاتا۔ نسیم تو بہر حال ایک کمزور لڑکی تھی۔ وہ کب تک اس بلائے بے درماں کا مقابلہ کر سکتی۔ آخر وہ بستر پر دراز ہو گئی۔ اعجاز کی وجہ سے زلیخا اور رابعہ کو اس سے بہت ہمدردی تھی لیکن یہ ہمدردی ایسی نہیں تھی جو اس کے زخم دل کو مندمل کر سکتی، جو اس کے آلام و مصائب کو کم کر سکتی۔ اعجاز اس کی دلجوئی کی زیادہ سے زیادہ کوشش کرتا تھا۔ اور اس کے سامنے وہ آنسو پی بھی جاتی۔ لیکن جہاں تنہائی میسر آئی اور وہ کب میسر نہیں آتی تھی اس نے رونا شروع کر دیا۔ اس طرح کہ کوئی سن نہ لے اس طرح کہ دل کے ٹکڑے ہو جائیں۔

کرنل شمسی شہر کے نہایت کامیاب ڈاکٹر تھے۔ اعجاز انہی سے نسیم کا علاج کرا رہا تھا۔ وہ پوری ہمدردی اور دل سوزی کے ساتھ علاج کر رہے تھے۔ جب کسی طرح افاقہ نہ ہوا۔ تو انہوں نے پیشاب، بلغم اور خون وغیرہ کا ٹسٹ کیا۔ اور سینہ کا ایکسرے لیا اور اس کے بعد کہہ دیا۔

"مریضہ کی حالت کافی تشویشناک ہے، دق کا آغاز ہو چکا ہے"!

یہ سن کر اعجاز کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ اس نے کہا ڈاکٹر صاحب یہ آپ کیا فرما رہے ہیں؟ کیا نسیم دق میں مبتلا ہو گئی ہے

اس کے باپ نے خودکشی کر لی، اس غم میں دیوانی ہو گئی۔ صفدر نے دھوکا دیا اب کیا اس کی باری ہے؟ کیا اب وہ اس دنیا سے حسرت لے کر رخصت ہو جائے گی؟"

نہیں ڈاکٹر صاحب ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ آخر آپ کس مرض کی دوا ہیں۔ جس طرح بھی ہو اسے بچا لیجیے۔ اسے زندہ رہنا چاہیے۔ ابھی اس کے مرنے کے دن نہیں ہیں۔ ابھی اسے نہیں مرنا چاہیے۔

کرنل شمسی غور اور توجہ سے اعجاز کی باتیں سنتے رہے پھر انہوں نے فرمایا۔

عزیز من تم ٹھیک کہتے ہو۔ واقعی ابھی نسیم کے مرنے کے دن نہیں ہیں اسے نہیں مرنا چاہیے۔ لیکن۔

اعجاز نے بیتابی کے ساتھ کہا۔" لیکن ویکن کچھ نہیں۔ آپ کو اسے بچانا ہی پڑے گا۔

کرنل شمسی مسکراتے ہوئے پھر گویا ہوئے۔

یہ شہر بدل دو۔ ایسے بھی آج کل سخت گرمی پڑ رہی ہے، اُسے پہاڑ پر لے جاؤ۔ اسے زیادہ سے زیادہ خوش رکھنے کی کوشش کرو۔ غم اور فکر اس کے پاس پھٹکنے نہ دو۔ مرض کا ابھی صرف آغاز ہے اگر یہ کر لو گے تو ضرور اچھی ہو جائے گی!"

اعجاز نے اضطراب و اشتیاق کے ساتھ دریافت کیا۔

واقعی ڈاکٹر صاحب اچھی ہو جائے گی۔

انہوں نے اعتماد کے ساتھ جواب دیا" ہاں ضرور، خدا پر بھروسہ رکھو، انشاءاللہ بالکل تندرست ہو جائے گی۔ مرض کا نام و نشان بھی باقی نہیں رہے گا۔

✪

(۳)

کرنل شمسی کو رخصت کر کے اعجاز سیدھا نسیم کے کمرے میں پہنچا
وہ بستر پر لیٹی تھی۔ اور نہ جانے کیا سوچ رہی تھی۔ پاس ہی کرسی پڑی تھی
اعجاز اس پر بیٹھ گیا۔ اسے دیکھ کر نسیم نے اٹھنے کی کوشش کی۔ لیکن،
اعجاز نے اسے اٹھنے نہیں دیا، کہنے لگا۔

"چپ چاپ لیٹی رہو۔ اور جو کچھ میں کہتا ہوں اسے غور سے سنو؟"

وہ خاموش ہو گئی اور سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ اعجاز
نے گفتگو کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"کل ہم پہاڑ پر چل رہے ہیں سن لیا تم نے؟"

وہ کچھ دیر خاموش رہی پھر کہنے لگی۔

"وہاں کیوں جا رہے ہیں آپ، میں بیمار ہوں، میرا کیا ہو گا؟ امی
پاگل خانے میں ہیں۔ ان کی دیکھ بھال کون کرے گا؟ کیا کوئی بہت ضروری
کام ہے۔

اس نے ہمدردی کی نظروں سے اسے دیکھا، پھر گویا ہوا۔

میں نہیں ہم۔ تم بھی میرے ساتھ چلوگی، چچی کا میں نے بڑا اچھا انتظام
کر دیا ہے ڈاکٹر نے امید دلائی ہے کہ دو مہینہ کے اندر وہ بالکل ٹھیک
ہو جائیں گی۔ بشرطیکہ ہم میں سے کوئی ان سے ملنے کی اس عرصہ میں کوشش

نہ کرے، ہم میں جب وہ کسی کو دیکھتی ہیں تو ان کا جنون بڑھ جاتا ہے۔ اگر وہ کچھ عرصہ تک سکون سے رہیں اور مشتعل نہ ہوں تو طبعیت بالکل دُرست ہو جائے گی!"

وہ بولی:" اعجاز تو ہم نہیں ملیں گے مگر پہاڑ کی کیا ضرورت ہے وہاں کیوں جائیں؟"

اعجاز نے جواب دیا۔

ڈاکٹر صاحب کی رائے ہے کہ گرمی کی یہ شدت تمہارے مرض کو بڑھا دے گی۔ وہاں کی آب وہوا تمہارے لئے مفید ہے۔ اس عرصہ میں چچی بھی اچھی ہو جائیں گی۔ اور تم بھی تندرست ہو جاؤ گی!"

وہ کہنے لگی:" میں سمجھ گئی، دق کے مریضوں کو پہاڑ پر لے جایا جاتا ہے۔ شاید ڈاکٹر صاحب نے میرے لئے دق تجویز کی ہے۔ اگر یہی بات ہے تو میں خوش ہوں، بہت خوش ہوں۔"

"یہ کیوں؟ اوّل تو ڈاکٹر نے دق تجویز نہیں کی، لیکن بہ فرض محال کی بھی ہے، تو اس میں خوش ہونے کی کیا بات ہے؟"

" مجھے زندگی نہیں چاہیے۔ میں زندہ رہ کر کیا کروں گی؟"

" زندگی سے اس قدر بیزار کیوں ہو"؟

" اس لئے کہ اب زندگی میں میرے لئے کچھ نہیں رہ گیا ہے؟ زندہ رہوں، کس لئے زندہ رہوں، کون سی دلکشی رہ گئی ہے زندگی میں میرے لئے؟"

" آخر تم اپنے آپ کو تنہا اور اکیلا کیوں سمجھتی ہو؟ تم یہ کیوں سمجھتی ہو کہ دنیا میں تمہارا کوئی نہیں ہے؟"

" کیا کوئی ہے؟"

" کیوں نہیں ہے؟"

" اگر ہے تو میں اسے کیوں نہیں جانتی؟"

" کیا تم مجھے نہیں جانتیں؟ نسیم کیا تم مجھے نہیں پہچانتیں کیا تم مجھے

پہچاننے سے انکار کرتی ہو؟" کیا تم میرے لیے بھی زندہ رہنا نہیں چاہتیں؟"

"آپ کے لیے؟" —

اور پھر وہ آنکھیں نہ ملا سکی۔ خود اس کی آنکھیں گلاب کی پتیوں کی طرح جھک گئیں۔ اس کے زرد، زرد گالوں پر سرخی کی ایک لکیر سی بن گئی۔

اعجاز نے اعتماد اور عزم کے ساتھ کہا۔

"ہاں میرے لیے، بتاؤ نسیم میرے لیے بھی تم زندہ رہنا نہیں چاہتی؟"

وہ دکھ بھرے لہجہ میں بولی: "کیوں شرمندہ کرتے ہیں آپ مجھے؟ ابو نے، امی نے اور خود میں نے آپ کے اور زلیخا کے ساتھ جو برتاؤ روا رکھا ہے، کیا کوئی اسے بھول سکتا ہے۔ معاف کر سکتا ہے؟"

اعجاز نے جوش کے ساتھ جواب دیا "ہاں میں۔ آخر تم میری بات کا یقین کیوں نہیں کرتیں؟"

نسیم نے جواب دینا چاہا، لیکن کچھ کہہ نہ سکی، ہاں اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے بڑے بڑے قطرے ضرور ٹپکنے لگے اور پھر لرزتے ہوئے ہونٹوں سے اس نے کہا۔

"کاش بہت پہلے میں مر گئی ہوتی!"

اعجاز نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

تمہیں ابھی زندہ رہنا ہے۔ اور بوڑھی ہو کر مرنا ہے۔ اور تمہارے بوڑھے ہونے میں ابھی بہت دن ہیں"!

(۴)

پہاڑ کی آب وہوا کا واقعی بہت اچھا اثر پڑا نسیم کی صحت پر چند ہی ہفتوں میں حرارت جاتی رہی۔ کھانسی ختم ہوگئی۔ چہرے کی زردی سرخی سے بدل گئی۔ ماحول کی تبدیلی نے بھی بہت اچھا اثر کیا۔ گھر میں ہر وقت ملول و دل شکستہ نظر آتی تھی۔ یہاں اعجاز اور زلیخا نے اُسے ایک لمحہ کے لئے بھی افسردہ نہیں ہونے دیا۔

صبح سے لے کر رات کو جب تک سونے کا وقت نہ آجاتا وہ اس کا جی بہلایا کرتے، اسے ہنسنے ہنسانے کی کوشش کرتا رہتا، یہی حال زلیخا کا تھا۔ اعزاز کی موت اور کلثوم کی دیوانگی نے اس کے دل کو پانی کر دیا تھا، وہ اب ساری پچھلی باتیں جنہیں یاد رکھنے کا بڑا اہتمام رکھتی تھی بالکل بھول چکی تھی۔ اسے اگر فکر تھی تو بس اتنی کہ نسیم خوش رہے، ہنسے، مسکرائے دلچسپیوں میں حصہ لے، کتابیں پڑھے، لطیفے سنے، سینما دیکھے، مزے مزے کی باتیں کرے۔

زلیخا کے التفات میں کچھ اس کی فطری نیکی شامل تھی اور زیادہ تر اعجاز کی محبت کارفرما تھی، اس نے محسوس کر لیا تھا کہ اعجاز نے نسیم کی صحت کو اپنی موت اور زندگی کا مسئلہ بنا لیا تھا۔ لہٰذا دل و جان سے کوشش کرتا تھا کہ اس کا ہر غم دور کر دے۔

کئی روز سے نسیم کلثوم کے لئے پریشان تھی،

اماں نہ جانے کیسی ہیں؟ خدا جانے ان کی صحت کا کیا حال ہے؟ ہسپتال والے ٹھیک سے دیکھ بھال کرتے ہیں یا نہیں؟

اعجاز کو خود بھی کلثوم کے بارے میں کافی فکر رہتی تھی اور اب نسیم کی پریشانی دیکھ کر اس سے رہا نہ گیا وہ زلیخا کو اس کے پاس دو دن چھوڑ کر شہر چلا گیا۔ کہ کلثوم کی خبر لے آئے اور اپنی آنکھوں سے اس کا حال دیکھ آئے۔

اعجاز کے جانے کے دوسرے دن کاٹیج کے برآمدے میں نسیم بیٹھی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی کہ زلیخا آگئی، اس نے آتے ہی سوال کیا۔

"کیا پڑھا جارہا ہے؟"

وہ کتاب بند کرتی ہوئی بولی۔

"یوں ہی - ایک کتاب ہے دلچسپ سی۔"

کچھ دیر تک خاموش رہی، پھر زلیخا نے پوچھا۔

کیوں نسیم، کیا تم نے بھی صفدر کو بھلا دیا ہے؟"

"وہ تیوری چڑھا کر بولی، میں نفرت کا جواب محبت سے نہیں دے سکتی!"

زلیخا نے چھیڑتے ہوئے کہا "لیکن محبت کا جواب تو نفرت سے ہوسکتا ہے؟

وہ کچھ جھینپ سی گئی، اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں، کہنے لگی۔

تمہیں حق ہے جتنا چاہے ذلیل کرلو۔ لیکن زلیخا میری آنکھوں پر پردے پڑ گئے تھے، نہ جانے مجھے کیا ہوگیا تھا۔ اماں نے بھائی کی محبت میں۔ بھائی نے اور ان کے گھر والوں نے بہن کے جاہ و جلال کے جوش میں کچھ ایسا بنا کہ میں پھنس گئی۔ میں نے کھوٹے کو کھرا سمجھا اور صفدر نے بھی محبت کا وہ سوانگ رچایا کہ مزاحمت نہ کرسکی میں محبت سے ناواقف تھی۔ کتابوں میں میں نے محبت کا ذکر پڑھا تھا میں چاہتی تھی کہ میں کسی سے محبت کروں، کوئی مجھ سے محبت کرے

صفدر مجھ سے محبت کا ڈھونگ رچاتا ہوا آیا۔ میرا دل صاف تھا۔ میں اس سے محبت کرنے لگی ۔۔

اور بھیا ۔۔۔

"وہ ذرا سی بات جس کا بتنگڑ بنا جس کی وجہ سے انہیں گھر چھوڑنا پڑا اور جس کے باعث میں ان سے، تم سے بیزار ہوئی، ایک بہانہ بن گیا۔ یہ واقعہ نہ ہوتا تو شاید صفدر کا داؤ نہ چلتا میں اس کے فریب میں نہ آتی۔ اب وہ باتیں سوچتی ہوں تو اتنی ندامت ہوتی ہے کہ جی چاہتا ہے زہر کھا لوں!"

چھوڑو یہ باتیں ہمیں تو اب وہ یاد بھی نہیں۔ لیکن نسیم کیا اب بھی تم مجھ سے بیزار ہو؟

"ہرگز نہیں۔ اب تو میں تمہیں سگی بہن سے بھی زیادہ چاہتی ہوں!"

"اور بھیا سے؟"

"بھیا سے کیا؟"

"کیا ان سے بیزار ہو؟"

"کچھ تمہارا دماغ چل گیا ہے؟"

وہ نہ ہوتے تو ابا کی لاش سڑتی رہتی، اماں دیوانگی کے عالم میں سر پھوڑ کر مر جاتی اور میرا نہ جانے کیا حشر ہوتا۔ وہی تو ہیں جنہوں نے ہم گرتے ہوؤں کو سنبھالا دیا اور نئی زندگی دی، ان سے بیزاری کا کیا سوال؟ انہیں چاہا جا سکتا ہے ان سے محبت کی جا سکتی ہے۔ انہیں پوجا جا سکتا ہے مگر۔

"ارے ارے ۔۔۔ نسیم کچھ ہوش میں ہو؟"

"کیا ہوا زلیخا؟"

تم بھیا کو چاہتی ہو؟ محبت کرتی ہو ان سے؟ انہیں پوجتی ہو؟"

"ہاں ۔۔۔ اور مجھے اس پر فخر ہے ۔" کیا میرا فخر بے جا ہے۔

نہیں بالکل بجا ہے لیکن کہیں اس فخر کا اظہار ان حضرت کے سامنے نہ کر دینا۔ ورنہ وہ آپے میں نہیں رہیں گے کہیں انہیں پاگل خانے نہ بھیجنا پڑے

"خدا نہ کرے، کیوں ایسی بدفالی کی باتیں منہ سے نکالتی ہو۔ بہن ہو کر ایسی باتیں

شرم نہیں آتی !"

اچھا تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ ہمارے اجڑے گلستان میں بھی بہار آجائیگی ؟"

" اجڑا گلستان کیسا ؟ بہار کیسی ؟"

تم اگر ہماری بھابی بن جاؤ گی ؟ — کیا نہیں بنو گی ؟

" زلیخا ایسی باتیں نہ کرو ؟" یہ نئی بات کیا سوجھی بیٹھے بیٹھے ۔

. " کیوں نہ کروں ؟ آخر پھر بھیا کو جواب کیا دوں گی ؟" جواب کیسا ؟

" وہ تو ماہی بے آب کی طرح اس دن کے لئے تڑپ رہے ہیں جب تم ان کی دولہن بنو گی ۔ جب وہ سہرا باندھیں گے ۔"

یہ الفاظ سن کر نسیم کا چہرہ اور سرخ ہو گیا ۔ وہ کچھ شرما سی گئی ، ذرا دیر تک چپ رہنے کے بعد گویا ہوئی ۔ " نہیں زلیخا میں اس قابل نہیں ہوں ۔"

یہ نئی بات کیا سوجھی بیٹھے بیٹھے ۔

سچ ہی تو کہتی ہوں ، وہ بہت اونچے ، بہت اچھے ، بہت شریف انسان ہیں ۔ ان کے لئے ایسی رفیقۂ حیات منتخب کرو ۔ جو انہی کی سی ہو ۔

لیکن بدقسمتی سے رفیقۂ حیات کا کام انہوں نے مجھے نہیں سونپا ہے ، اپنے ہاتھ میں رکھا ہے اور وہ انتخاب کر چکے اور سچ پوچھو تو میں بھی ان کے انتخاب پر صاد کرتی ہوں ۔

آخر آج تمہیں سوجھی کیا ہے ؟ کیوں پریشان کرنے کیلئے آگئیں خواہ مخواہ ۔

ہاں کہہ دو ، میں چپ ہو جاؤں گی !"

(آہ سرد کے ساتھ) زلیخا تم کسے اپنی بھابی بنانے کے لئے مچل رہی ہو ؟ اسے جو ایک بدنام باپ کی بیٹی ہے ایک دیوانی عورت کی لڑکی ہے جس کے پاس نہ دولت ہے نہ ثروت نہ ع۔ت ، نہ شہرت محض ایک کنگلی ۔

دیکھو نسیم اگر اس طرح کی باتیں کرو گی تو لڑائی ہو جائے گی ۔

تم ایک غیرت مند باپ کی بیٹی ہو ، جو میرا چچا بھی تھا ۔ تم ایک وفا پرست عورت کی لڑکی ہو جو ہماری چچی ہے ۔ تم ہمارا خون ہو جو ہم ہیں وہ تم ہو ، جو تم ہو وہ ہم ہیں ، ایسی باتیں سوچتے ہوئے تمہیں لاج نہیں آتی ؟"

نسیم نے کوئی جواب نہیں دیا ، رونے لگی ۔ زلیخا اس سے لپٹ گئی ۔ اس ہمدردی نے اسے اور زیادہ جذباتی بنا دیا ۔ وہ اس کے کندھے پر سر رکھ کر سسکیاں لے کر رونے لگی ۔

کافی دیر تک دونوں اس طرح ایک دوسرے کے گلے لگی، روتی رہیں۔
دفعتاً اعجاز سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔

اسے دیکھ کر زلیخا چونک پڑی اور آنسو پونچھتی ہوئی بولی۔

"ارے بھیا آپ؟" وہ حیرت سے دونوں کو دیکھتا ہوا بولا۔

یہ کیا ہو رہا تھا؟ یہ خوشی کا موقع ہے، چچی اچھی ہو گئیں انہیں بھی میں اپنے ساتھ لایا ہوں، یہاں کی آب و ہوا انہیں بہت راس آئے گی جاؤ ان کا استقبال کرو۔ خبردار تمہاری یا نسیم کی آنکھوں میں آنسو کا ایک قطرہ بھی نظر نہ آئے گا

ختم شد

چند اچھے ناول

آبلہ پا (آدم جی انعام یافتہ) رضیہ فصیح احمد
متاعِ درد ——————— "
قیمتی چھاؤں ——————— "
سدرہ ——————— زبیدہ سلطانہ
جوہر ——————— "
نذرانہ ——————— "
فیروزہ ——————— "
طاہرہ ——————— "
ابرِ بہاراں ——————— "
شہزادی ——————— محمد سعید

چند خوبصورت ناول

راحلہ	————	قمر نقوی
ندیمہ	————	"
گلگونہ	————	"
مسافر	————	"
چیتوں کی وادی	————	"
کاشفہ	————	راشدہ قمر
ندیا کو بہنے دو	————	فریدہ چوہدری

عظیم تاریخی ناول

القاہرہ	محمد سعید
بغداد	〃
مدینۃ الیہود	〃
اشبیلیہ	〃
اطلس	〃
ہمایوں	〃
بحری عقاب	〃
اکبر اعظم	〃
پاکستان کا سٹالن گراڈ	〃
الموت	〃

رئیس احمد جعفری

کے زندہ جاوید ناول

شہاب الدین غوری ــــ تاریخی ناول

تغلق ــــ "

یورش ــــ "

یزید ــــ "

نازلی ــــ معاشرتی ناول

فاخرہ ــــ "

فرخندہ ــــ "

نفرت ــــ "

آنچ ــــ "

محبت کا انتقام ــــ "

○

Writer:- Syed Ahmed Hassan

ہمنوا	قمر نقوی
محبت کا انتقام	رئیس احمد جعفری
درد کا آنگن	رئیس احمد جعفری
طاہرہ	زبیدہ سلطانہ
انسان کی تلاش	نشاط فاطمہ
مُسافر	قمر نقوی
جلتے ہیں چراغ	راشدہ قمر
نفرت	رئیس احمد جعفری
رازداں	راشدہ قمر
ابرِ بہاراں	زبیدہ سلطانہ

مقبول اکیڈمی